

سیارہ ڈائجسٹ

اپریل 2016

کمال کی باتیں

کمال کی تحریروں



کمال کا ڈرامہ نگار

کمال کا فن

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

کمال کا احوال جدوجہد

کمال کے آخری لمحات

7MAD

گئی 2016 میں شائع ہوگا

سارہ ڈائجسٹ

کی ایک اور عظیم شان پیش کش

بسم الله الرحمن الرحيم
الحمد لله الذي جعل القرآن الكريم
سورة الفاتحة

فرمان الہی

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

وہ قرآنی احکام جن کا جاننا ایمان، اعتقاد اور اعمال درست رکھنے کیلئے انتہائی ضروری ہے۔

اس نمبر کا مقصد پیغام الہی تک ایک آسان راستہ فراہم کرنا ہے اپنی مرضی کا
عناوہ سرت میں دیکھیں اور قرآن کی تمام متعلقہ آیتوں پر غور کر لیں۔

اس نمبر میں حکام البحر عربی متن اور اردو میں انتہائی آسان عام فہم اور دلکش پیرائے میں پیش کیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی رضا کے مطابق زندگی بسر کرنے کیلئے اس نمبر کا مطالعہ ہر ایک کے لئے ضروری ہے۔

تاریخ ڈائجسٹ - 240 مین مارکیٹ، ریلوای گارڈن لاہور۔ فون: 37245412

القرآن

بسم الله الرحمن الرحيم

سورة الانعام

یہ لوگ کڑی کڑی قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ اگر کوئی نشانیاں ہمارے سامنے آجائے تو ہم اس پر ایمان لے آئیں۔ اے محمدؐ ان سے کہو کہ ”نشانیاں تو اللہ کے پاس ہیں۔“ اور تمہیں کیسے سمجھایا جائے کہ اگر نشانیاں آ بھی جائیں تو یہ ایمان لانے والے نہیں۔ ہم اسی طرح ان کے دلوں اور نگاہوں کو پھیر رہے ہیں جس طرح یہ پہلی مرتبہ اس پر ایمان نہیں لائے تھے۔ ہم انہیں ان کی سرکشی ہی میں جھکنے کے لئے چھوڑ دیتے ہیں اگر ہم فرشتے بھی ان پر نازل کر دیتے اور مرنے والے ان سے باتیں کرتے اور دنیا بھر کی چیزوں کو ہم ان کی آنکھوں کے سامنے جمع کر دیتے تب بھی یہ ایمان لانے والے نہ تھے الا یہ کہ مشیت الہی ہو کہ وہ ایمان لائیں مگر اکثر لوگ نادانی کی باتیں کرتے ہیں۔ اور ہم نے تو اسی طرح ہمیشہ شیطان انسانوں اور شیطانوں کو ہر نبی کا دشمن بنایا ہے جو ایک دوسرے پر خوش آئند باتیں دھوکے اور فریب کے طور پر التا کرتے رہے ہیں۔

(آیہ: 108-112) (بحوالہ: تفسیر القرآن۔ از مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی)

الحديث

بسم الله الرحمن الرحيم

مسلمانوں کی حاجت روائی کا صلہ

ترجمہ: حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ”جس کسی مسلمان نے کسی مسلمان کو بھوک کی حالت میں کھانا کھلایا تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کو جنت کے پھل کھلائے گا۔“

جس مسلمان نے کسی مسلمان کو پیاس کی حالت میں پانی پلایا تو اللہ اس کو قیامت کے دن مہر بند شراب (یعنی بہترین مشروب نشے سے پاک) پلائے گا۔“

اور جس مسلمان نے کسی مسلمان کو کپڑا پہنایا جس کے منگے ہونے کی حالت میں تو اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کے دن جنتی پوشاک پہنائے گا۔“

(بحوالہ: سیارہ ذابحث فرمان رسول ﷺ نمبر)

لارن شائے میں

- 2 القرآن ضیاء القرآن قرآن ایک مکمل ضابطہ حیات ہے!
- 3 الحدیث ادارہ مسلمانوں کی حاجت روائی کا صلہ!
- 14 سوسٹک جاوید جودھری ادویات کی لوڈ شیڈنگ!
- 49 خود چلیں دیدہ اعیار کویتا کردیں فاطمہ حسین سید ایسی بے مثال تحریروں کا گلدستہ جنہیں پختے کے لیے درجنوں کتابوں کی عرق ریزی درکار ہوئی ہے!
- 49 جین ڈکسن بنگالی بابا اور صدر او بابا صیم سحر امریکی صدر کی پیش گوئی کے حوالے سے دلچسپ اور بے مزاح تبصرہ!
- 129 اندھو صداقت سین سانچہ ایک اندھے شخص کا فسانہ، جو ہر حال میں زندگی سے لطف اندوز ہونا چاہتا تھا!

17 سیارہ رپورٹ



کمال کی ادبی
کمال کی ادبی
کمال کی ادبی
کمال کی ادبی
کمال کی ادبی

”بدزوق“

139

آئین کنول

ایک دو ٹیڑھی کی کہانی جسے حقیقی جذبوں کی قدر تھی!

سہاگ کی مہندی

143

رجیم گل

ایک تپائی لڑکی کی کہانی اس کا نام مرجانا تھا اور اسے مرجانا آتا تھا!

طبی مشورے

155

عکبر ماحد جمہوری

طب نبوی کی روشنی میں آپ کے مسائل کا حل!

وارث

161

ناکملہ بلخ الرحمن

میاں بیوی کی کہانی، وہ ایک دوسرے کی کزوریوں سے فائدہ اٹھا رہے تھے!

بزم شاعری

173

ادارہ

بازوق قارئین کے کلام و انتخاب پر مبنی قبول ترین سلسلہ!

”گمشدہ قبر“

58

دیپار الفت

وہ کالے پانی کا قیدی تھا اور اس کے سینے میں ایک راز ڈھن تھا۔ وہ راز جاننے کے لئے ضروری تھا کہ قیدی کو رہا کرایا جائے۔

ریاض رحمت

ایک عورت کی کہنا، صبر نے اس پر رب کی رحمت کے درگول دیئے تھے

سوائس فلو

71

گنگا سہا

بروقت تشخیص ہی مریض کی جان بچا سکتی ہے

ایک شاعری کی کہانی جو زندگی کی آخری بازی ہار گیا تھا

179

”مجھ کو زندہ رہنے دو“ نصیر خانم وہ بھی پھول کے مانند تھی جس کا جگر چاک ہوا اس کی دیدہ نم ناک نے بڑے روح فرسا منظر دیکھے تھے!

187

میں گروڈز ساحلی پودے - لائق خان ہوس قدرت کے عطا کردہ یہ پودے ہمیں سمندری جوار بھائے اور طوفانوں سے محفوظ رکھے ہیں!

193

پردہ نشین گڑیا صادق ہدایت ایک شخص کا فسانہ، اس کی ساری عاشقانہ زندگی کا محور ایک مجسمہ تھا

203

حضرت سلطان باہوؒ پروفیسر غلام رسول سلطان العارفین کی زندگی کے حالات ملفوظات کا ذخیرہ ایک بیش قیمت خزانہ ہے!

213

برما کا آدم خور صلاح الدینؒ برما کے جنگلوں میں ایک خوفی ”بلا“ سے معرکے کی حیرت انگیز زوداد!

خواتین کا راز

169

ایمزید۔۔۔ کامیاب پاکستانی خاتون کیا مرد بڑا ہونے لگتا ہے؟ کے روپ میں پسند کرتا ہے؟ کوہ کی حالت میں خاتون نے صحت مند بننے کو حکم دیا

171



135 خون پینے والا ایک سنگ دل شکاری کی کہانی، جو بڑے مہذب انداز میں ”شکار“ پھیلتا تھا

مجموعہ نثرات

جلد 53 نمبر 14 اپریل 2016ء

www.facebook.com/sayaradigest
Email: editorsayara@yahoo.com
sayaradigest@gmail.com
editorsayara@hotmail.com
Phone: 92-042-3724542
Mobile: 0300-8436206

مستقل اہمیت کی حامل معیاری اور شگفتہ تحریریں

ماہنامہ سیارہ ڈائجسٹ لاہور

مدیر اعلیٰ : امجد رؤف خان
مدیر منتظم : کامران امجد خان

محمد ثاقب

جویریہ کامران - رؤفی خان - فرحان امجد

بشیر احمد

0333-4207684

فرحان امجد خان -

محمد دراز

خالد محمود - محمود قیصر

اللہ والا پرنسز شاہراہ قائد اعظم لاہور

0333-4207684

0300-4144781

0321-3758492

لاہور - فرحان امجد خان -

طارق محمود -

کلپی - محمد عابد مرزا -

شعبہ اشتہارات

شبکت افضل رفیق غوری
ریاض آفندی فیاض عمر فاروق محمود ایل

امجد رؤف خان پبلشرز نے اللہ والا پرنسز سے چھپوا کر
240 مین مارکیٹ ریواڈ گارڈن لاہور سے شائع کیا۔

80 روپے

الٹن روڈ لاہور کینٹ



قلمند صاحب کے نام محترم مدیر صاحب۔ السلام علیکم!

جناب اس مہینے کے سیارہ ڈائجسٹ میں اظہار خیال کے صفحات پر ہمارے محترم کھاری قلمند حسین سید صاحب نے ایک بار پھر فرمایا ہے کہ خود تھیں دیدہ اغیار کو دینا کر دین کا سلسلہ کسی وقت بھی مغل ہو سکتا ہے کیونکہ قلمند صاحب فرما رہے ہیں کہ ان کی بھی کچھ مجبوریاں ہیں۔ ہائے ہائے یہ مجبوری۔ قلمند صاحب کا یہ سلسلہ قارئین سیارہ کے لئے ایک نفع بن چکا ہے۔ قلمند صاحب کی تحریروں میں ہر طرح کا مواد مل جاتا ہے۔ امجد خاں رؤف صاحب براہ کرم قلمند صاحب سے ہماری جانب سے انکساری سے عرض گزار کریں کہ وہ ایک عدد دیکھنا یا انکساری سے عرض کر دیں یہ سلسلہ ہم پر گزرتا رہتا رہے۔ اُن کی مصروفیت کی وجہ اپنی جہل لیکن اُن سے درخواست ہے کہ سیارہ کے قارئین کی دل جوئی کے لئے وقت نکال کر یہ سلسلہ جاری رکھیں۔ ان کی عمر حضرت خضر علیہ السلام بنتی ہو وہ صحت کے ساتھ زندہ رہیں اور لکھتے رہیں۔ یہ بات درست ہے کہ مصروفیت کا دور ہے۔ ہر انسان مصروف ہے۔ یہ اچھی اچھی تحریروں کا گلدستہ جو قلمند صاحب پیش کرتے ہیں اس میں کئی رنگ کے پھول ہوتے ہیں ہر کالم میں نت سے نت نئی چیز پڑنے کو ملتی ہے۔ قلمند صاحب اور نواز خاں صاحب کی تحریروں کا ہر ماہ ہم بے چینی سے انتظار کرتے ہیں۔ قلمند صاحب سے میں منت کرتا ہوں کہ مہربانی فرمائیں سیارہ کے صفحات میں جلوہ افروز ہوتے رہیں۔ یہی

کھار دیدہ دینا کو مختصر کر دیتے ہیں یہ بھی نہ کیا کریں۔ طویل مضامین دیا کریں تاکہ تحریروں پڑھتے ہوئے ہمارا مزہ برقرار رہے۔ شکریہ۔ شوکت افضل صاحب سے بھی گزارش کریں کہ وہ ہر ماہ اپنی کہانی کو سیارہ کے صفحات کی زینت بنائیں۔ شوکت افضل صاحب بہت اچھا لکھتی ہیں اور عمدہ لکھتی ہیں ان کی تحریر میں سسپنس بہت ہوتا ہے۔ ایسے امتیاز احمد صاحب کی کہانیاں بھی اتنے انداز میں ہوتی ہیں وہ بھی بہت خوب لکھتے ہیں۔ بہر حال قلمند حسین سید صاحب کو منائیں کہ وہ سیارہ کی بزم سے غیر حاضر نہ ہوں۔ سبق آموز اقوال زریں سے ہر ماہ ثواب کمائیں۔ سیارہ ڈائجسٹ کے تمام کھاری اچھا لکھتے ہیں یہ ایک ادبی رسالہ ہے ادب میں لکھنا بھی ایک اعزاز ہے اس اعزاز کو برقرار رہنا چاہئے، شکریہ۔ (بشیر احمد بھٹی۔ بہاولپور)

”پیاری والدہ“

محترم ایڈیٹر صاحب۔ السلام علیکم! سیارہ ڈائجسٹ کا ایڈیٹر نمبر دیکھا کیا لکھوں اور کیسے لکھوں کہ میری پیاری والدہ ہمیں چھوڑ کر منوں منی میں چلی گئی ہیں دنیا اندھیر ہو چکی ہے سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔

اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام بخشے اور ہم سب بہن بھائیوں کو صبر جمیل عطا فرمائے آمین تم آمین۔

(سائمن کنول۔ پیرور)
☆ سائمن کنول صاحبہ اللہ تعالیٰ آپ کی والدہ کو کرم کر دے جنت نصیب فرمائیں اور آپ

سب کو صبر جمیل عطا کریں۔ آمین۔ ہم سب آپ کے غم میں برابر کے شریک اور آپ کی والدہ کیلئے دعا گو ہیں۔

”اس ملک کا خدا حافظ ہے“

☆ جناب مدیر محترم صاحب۔ السلام علیکم! سیارہ ڈائجسٹ کا شمارہ مارچ ملا۔ لیکن اس کا مطالعہ زیر التواء ہے۔ اس لئے کہ میری آنکھ کی سرجری 16-23 کو سربراہ شعبہ امراض چشم بہاول ڈکٹر ریہ ہسپتال نے اپنے کلینک سائٹ سنٹر پر کر دی ہے اور 22000 روپے اپنی فیس لی ہے۔ ہاں! جس ملک میں تعلیم اور طب اچھے بن جائے اس ملک کا خدا حافظ ہے!

اظہار خیال کے صفحات پر ناملہ صاحبہ نے لکھا کہ محمود پارک پر لکھی تحریر کسی اور صاحب نے اپنے نام سے شائع کر رکھی ہے یہ تو معمولی بات ہے ان کو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں تو ایم فل اور پی ایچ ڈی تک کے مقالے جتنے ہیں لکھنا کون ہے اور ڈگری کون لیتا ہے یہ کون جانے! الو (OWL) یورپ میں علم و دانش کا سبیل ہے اور یہاں اسے نخوت پرندہ سمجھا جاتا ہے کیوں؟ اصل حقیقت کیا ہے یہ کون جانے؟ 1947ء میں پاکستان بنا اور 1971ء میں دو ٹوٹ ہوا۔ کسے معلوم کہ ایسا کیوں ہوا؟ اب بھی ملک میں ویسے ہی حالات ہیں جس ملک میں قانون کی حکمرانی نہ ہو وہاں ایسا ہی ہوتا ہے۔ بس اب تو ہمارا ملک بھی قرضوں کے سہارے چل رہا ہے۔

بس ہم خوش ہیں کہ ہمارا ملک ایسی قوت کا حامل ہے۔ مہنگائی، کرپشن، بجلی اور گیس کی طویل ناویش، تنگ، ناخواندگی، قانون کا نہ ہونا جیسے مسائل ہمارے ملک کو دیکھ کر طرح چاٹ

☆ جناب شاکر لطیف صاحب، ہم نے آپ کی باتوں کا قطعی برا نہیں منایا حالانکہ آپ کی تحریر سے عیاں ہے کہ آپ خود اپنی باتوں کو قابل غصہ سمجھتے ہیں۔ بہر حال آپ کی تحریروں کے بارے میں جلد

رہے ہیں.....
ہر شاخ پہ الو بیٹھا ہے
انجام گلستان کیا ہوگا؟.....
(قلمند حسین)

☆ جناب قلمند حسین صاحب، آپ نے بالکل بجا فرمایا کہ ہمارے ملک میں طب ایک صنعت بن چکی ہے اور علاج ایک کاروبار۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جلد مکمل صحت عطا فرمائے۔ آمین۔

”کہانی“

محترم مدیر صاحب۔ السلام علیکم!

ساری عمر مختلف ڈائجسٹ اور رسالے پڑھتے گزر گئی پچھلے دنوں آپ کے ڈائجسٹ کا فروری کا شمارہ پڑھا تو کچھ خیرت ہوئی۔ جناب کہانی وہ ہوتی ہے جس میں اچانک کوئی چوٹ کا دینے والا انکشاف سامنے آئے مگر آپ کی کہانیوں کے نام سے ہی انجام کا اندازہ ہو جاتا ہے جیسے چوہری کی موت کے نام سے ہی اندازہ ہو گیا کہ چوہری آخر میں مر جائے گا۔ صفحہ 203 پر ہے کہ کچھ صاحب بھی لکھی جائے بھی لی لیتے تھے بادشاہ کا دور اور چائے بھر تو کولڈ کرس دیکھ رہے تھے ہوں گے اتنا غصہ آیا کہ تین کہانیاں لکھ ڈالیں۔

☆ جناب شاکر لطیف صاحب، ہم نے آپ کی باتوں کا قطعی برا نہیں منایا حالانکہ آپ کی تحریر سے عیاں ہے کہ آپ خود اپنی باتوں کو قابل غصہ سمجھتے ہیں۔ بہر حال آپ کی تحریروں کے بارے میں جلد

☆ جناب شاکر لطیف صاحب، ہم نے آپ کی باتوں کا قطعی برا نہیں منایا حالانکہ آپ کی تحریر سے عیاں ہے کہ آپ خود اپنی باتوں کو قابل غصہ سمجھتے ہیں۔ بہر حال آپ کی تحریروں کے بارے میں جلد

آگاہ کر دیا جائے گا۔

”محبت روگ لگتی ہے“

مدیر اعلیٰ جناب امجد رؤف خان صاحب۔ السلام علیکم اربعہ 2016ء کا شمارہ ابھی زیر مطالعہ ہے۔ اظہار خیال کے بعد عبدالستار ایڈی اور بقیہس بالو ایڈی کی گنجی اور کھری باتیں پڑھ لی ہیں یہ دونوں فرشتہ سیرت میاں بیوی ہیں اور عالمی شہرت کی حامل جوڑی ہے۔ پچھلے شمارہ سیارہ ذابحث میں کئی کئی لیاقت علی ملک کی تحریر کردہ کہانی ”محبت روگ لگتی ہے“ نے مجھے کافی متاثر کیا تھا اور میں تعریف کرنا بھول گیا تھا۔ ان کی بے مثال تحریر جیسے اور لافغانی ہے میرے دل و دماغ پر کافی اثر چھوڑا ہے۔ خدا کرے کہ میری تحریر بھی اسی طرح کی ہو جائے۔ باقی پودھری کی موت، جرم و سزا کی دو اقسام نے بھی دم بخود کر دیا۔ پہلی قسط کو دوبارہ پڑھ کر دوسری قسط کو روانی کے ساتھ ایک ہی وقت میں بلکہ ایک ہی سانس میں پڑھا اور منہ سے یہ الفاظ نکلے نواز خان زندہ باذمیری اپنی تو کوئی کہانی یا مضمون شائع نہیں ہوا خیر کوئی بات نہیں دیکھیں اپریل کا شمارہ کیا کہتا ہے۔

مئی کے شمارے کیلئے ”یوم بحیر“ کے نام سے موقع کی مطابقت سے ایک مضمون ارسال کر رہا ہوں امید کافی ہے کہ توجہ فرمائیں گے اور اگر سیارہ ذابحث کا ناٹل بھی اسی مناسبت سے ہو تو لطف دہایا ہو جائے گا۔ مضمون میں کوئی غلطی وغیرہ ہو تو درست فرما دیجئے گا۔ آخر میں سب قارئین کیلئے والوں اور تمام خائف کو دعا و سلام۔ شکریہ

(غلام نبی عارف۔ لیہ)

قوم کے مسیحا

جناب محترم کامران امجد خان صاحب۔ السلام

علیکم امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا

ماہ رواں کا خوبصورت شمارہ ”ایڈی صاحب“ کی تصویر سے سجا بہت عمدہ رہا۔ ایڈی صاحب پاکستانی قوم کے مسیحا ہیں آپ نے ان کے بارے میں خوبصورت تحریر شائع کر کے ہمارے دلی جذبات کی ترجمانی کی ہے۔ تازہ شمارہ میں مضامین اور کہانیوں کا انتخاب لا جواب رہا۔ ہماری تحریریں لگانے کا شکریہ۔ مزید تحریریں ارسال خدمت ہیں براہ کرم قریبی اشاعت میں جگہ دیں آپ داد و دیگر شائف اور سیارہ ذابحث کے تمام لکھنے والوں اور تمام پڑھنے والوں کو دعا سلام۔ آخر میں ایک شکوہ ہمیں اعزازی کا پی نہیں ملتی۔ سو منتظر ہیں غلطی اور محبت کے ساتھ۔

(ایس امتیاز امجد۔ کراچی)

محترم جناب امجد رؤف خان صاحب۔ شوکت افضل صاحبہ ہماری سب سے فخریہ رائٹر ہیں۔ یہ بات بے شمار قارئین بار بار کہہ چکے ہیں کہ آپ ان کی تحریریں باقاعدگی کے ساتھ شائع کیا کریں۔ لیکن آپ نے تو جیسے اس حوالے سے قارئین کی بات نہ ماننے کا حیرت کر رکھا ہے۔ اب ایک بار پھر ان کی غیر حاضری طویل ہو گئی ہے۔ خدا را اُن تک قارئین کے جذبات پہنچا کر درخواست کریں کہ وہ باقاعدگی سے تحریریں ارسال کریں۔

(روبینہ خالد۔ فیصل آباد)

☆ محترمہ روبینہ صاحبہ، آپ کے اور آپ جی کے تمام قارئین کے جذبات ہم شوکت افضل صاحبہ تک دفعتاً فوجاً پہنچاتے رہتے ہیں۔ دراصل شوکت افضل صاحبہ ان دنوں خرابی صحت کی وجہ سے لکھ نہیں پا رہی ہیں۔ جیسے ہی وہ یہ سلسلہ دوبارہ شروع کریں گی، ہم اُن کی تحریریں آپ کی خدمت میں پیش کر دیں گے۔



سیارہ ذابحث کی عظیم الشان خدمت

تحفۃ النساء

شائع ہو گیا ہے

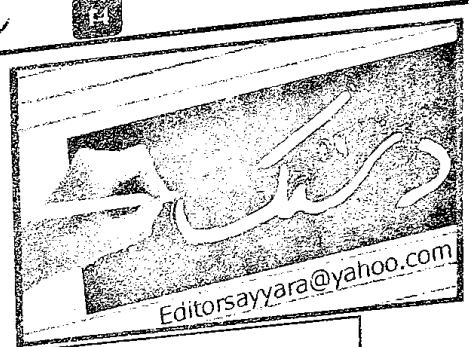
قیمت 175 روپے

• خواتین اسلام سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری پیاری باتیں!
• قرآن وحدیث کی روشنی میں عورتوں کے لئے اسلامی عقائد، ایمان، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، ذکر، تلاوت، وظائف اور دعا کے مفصل احکام!
• اس کے علاوہ ازدواجی زندگی، نکاح، طلاق، خلع، عدت، غیبت، وراثت، توبہ، اخلاق، اولاد کی تعلیم و تربیت کے مسائل اور اُن کا حل
• غرضیکہ خواتین کی دینی زندگی سنوارنے کے لئے جامع اور نایاب نسخہ جو ہر مسلمان گھرانے کی ضرورت ہے۔

37245412

240

سیارہ ڈائجسٹ / اپریل ۲۰۱۶ء



ادویات کی لوڈ شیڈنگ

گذشتہ کچھ ہفتوں سے پاکستان میں ادویات بنانے والی کمپنیوں اور حکومت کے درمیان قیمتوں کے حوالے سے تنازع نے شدت اختیار کر لی ہے اور غریبانہ ہمیشہ کی طرح عوام کو بھگتنا پڑ رہا ہے۔ حکومت کی طرف سے شواہکی نہ ہونے پر کمپنیوں نے ادویات کی قیمتیں عدالت سے اجازت لیکر از خود بڑھا دی ہیں اور یہ قیمتیں اس قدر زیادہ ہیں کہ لگتا ہے اب عام آدمی کو ان ادویات سے بھی بالکل محروم ہوتا پڑے گا۔ اس بارے میں گذشتہ روز برادر جمادیہ چودھری نے انتہائی مدلل کالم تحریر کیا جو قارئین سیارہ ڈائجسٹ کے لیے پیش خدمت ہے۔

(امجد رؤف خان)

آپ پٹنلین کی مثال لیجئے یہ دوا صرف دوا نہیں تھی یہ معجزہ تھا اور کوئی شخص اس معجزے کا سہرا ایلیگز پٹور لیمنٹک کے سر سے نہیں اتار سکتا۔ سکاٹ لینڈ کے اس عظیم سائنس دان نے 1928ء میں اپچوونڈی سے پٹنلین بنائی یہ دنیا کی پہلی باقاعدہ اینٹی بائیوٹک تھی یہ چند دنوں میں خوفناک ترین امیگنکس ختم کر دیتی تھی یہ پیپ زندہ انسانیت کے دھنوں پر طبعی سائنس کا پہلا بڑا مرحلہ تھا آج جب دنیا کے کروڑوں اربوں لوگ دو گولیاں یا ایک کپسول کھا کر آرام سے سو جاتے ہیں یا ان کے رستے زخم ایک ہفتے کے علاج سے مندل ہو جاتے ہیں تو اس کا سارا ثواب ایلیگز پٹور لیمنٹک کو چلا جاتا ہے وہ حقیقتاً انسانیت کا محسن تھا، لیمنٹک کی پٹنلین ہو جاتے ہیں ایجاد ہوئی۔ 1942ء میں مارکیٹ ہوئی اور یہ کیسے ہی دیکھتے پوری دنیا میں پھیل گئی۔ دنیا کا شاید ہی کوئی ملک ہوگا جہاں پٹنلین نہیں بنائی جاتی تھی شاید ہی کوئی ڈاکٹر ہوگا جس نے اسے مریضوں کو یہ دوا استعمال نہیں کرائی اور شاید ہی کوئی انسان ہوگا جس نے زندگی میں پٹنلین چلی کی کوئی دوا نہ کھائی ہو۔ آپ پٹنلین کی ایجاد سے پہلے انسانوں کی اوسط عمر دیکھ لیجئے اور آپ ڈاکٹر لیمنٹک کی اس ایجاد کے بعد اوسط عمر کا کل لیجئے آپ کو دونوں میں زمین آسمان کا فرق ملے گا۔ پٹنلین پاکستان میں بھی بنی تھی ملک کی 51 کمپنیاں مختلف کاموں سے پٹنلین بناتی تھیں۔ دوا بن رہی تھی اور ملک کے لاکھوں کروڑوں مریضوں کو فائدہ پہنچ رہا تھا لیکن پھر اچانک کمپنیوں نے یہ دوا بنانی بند کر دی کیوں؟ اس کیوں کا جواب وزارت صحت ہے یہ 51 کمپنیاں وزارت صحت

سیارہ ڈائجسٹ / اپریل ۲۰۱۶ء

15

کے برآمدوں میں دھکے کھاتی رہیں یہ باؤڈس کو جیج کر بناتی رہیں دنیا میں پٹنلین سے متعلق تمام اشیاء ہنگی ہو چکی ہیں ہم اب پرانی قیمت پر یہ دوا نہیں بنا سکتے آپ مہربانی کر کے دوا کی قیمت میں چند فیصد اضافہ کر دیں لیکن وزارت کے کالوں پر جوں نہ رہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کمپنیوں نے آہستہ آہستہ پٹنلین بنانی بند کر دی حکومت نے مریضوں کی مشکلات کا احساس کرتے ہوئے داد و فضل میں پٹنلین کی سرکاری فیکٹری لگا دی یہ فیکٹری خام مال مہنگا اور دوا کی قیمت کم ہونے کی وجہ سے زیادہ دیر نہ چل سکی یہ بھی بند ہو گئی لہذا آج ملک میں پٹنلین نہیں بن رہی اور وزارت صحت کی اس حماقت کا نتیجہ مریض بھگت رہے ہیں۔ یہ آج پٹنلین سے ہی گنا مہنگی دوسری اور تیسری جزییشن کی ادویات خرید رہے ہیں ان کی جیب کا بوجھ بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ حکومت اگر اس وقت پٹنلین کی قیمت کنٹرول کرنے کی بے دھونی نہ کرتی یہ فارماسیوٹیکل کمپنیوں کو قیمت میں چند روپے اضافے کی اجازت دے دیتی تو ملک میں آج بھی پٹنلین بن رہی ہوتی ملک میں اس تجروانی دوا کا بحران نہ ہوتا۔

ہمارے ریاستی ادارے دماغ کے بجائے 1860ء کے بنائے قانون سے سوچتے ہیں اور اس کم علمی کے نتیجے میں ملک بحرانستان بنا جا رہا ہے۔ آج کے دور کا سب سے بڑا کمال مسابقت یا مچی ٹیشن ہے۔ یہ آج کی سب سے بڑی مارکیٹ فورس ہے۔ یہ فورس مارکیٹ میں خود بخود توازن پیدا کرتی ہے۔ حکومت جب بھی اس طاقت کو کنٹرول کرنے کی کوشش کرتی ہے معاملات پیچھے کے بجائے اچھے جاتے ہیں اور اس کا نتیجہ وہی نکلتا ہے وہ پٹنلین کے معاملے میں نکلا تھا۔ ملک میں اس وقت بھی وزارت صحت اور ادویات ساز اداروں کے درمیان جنگ جاری ہے۔ فارماسیوٹیکل کمپنیوں کا کہنا ہے ملک میں 80 ہزار ادویات بنتی ہیں حکومت نے پچھلے 13 برسوں میں انڈسٹری کو ان ادویات کی قیمتوں میں اضافہ نہیں کرنے دیا۔ ان 13 برسوں میں دنیا کی ہر چیز مہنگی ہو گئی۔ پاکستان کے اندر اشیاء کی قیمتوں میں 570 فیصد اضافہ ہوا۔ لیکن ادویات کی قیمتیں اس جگہ کھڑی رہیں یہ ظہر او انڈسٹری کو لگتا جا رہا ہے۔ حکومت نے 2015ء میں انڈسٹری کے ساتھ مل کر قیمتوں میں 94 اعشاریہ 25 فیصد اضافے کا فیصلہ کیا تھا لیکن پھر یہ فیصلہ واپس لے لیا گیا۔ مارچ 2015ء ہی میں فیصلہ ہوا حکومت نے اگر 9 ماہ میں انتہائی اہم ادویات کی قیمتیں طے نہ کیں تو کمپنیاں اپنی قیمتیں خود ایڈجسٹ کر سکتی ہیں کمپنیوں نے چار چار سال سے درخواستیں جمع کر رکھی ہیں لیکن "ڈریپ" نے فیصلہ نہیں کیا۔ ڈسبر میں باہسی کے کوہاہ پورے ہو گئے۔ ڈریپ نے ہارڈ شپ کیسز کے فیصلے نہیں کئے چنانچہ انڈسٹری عدالت کی اور عدالتی حکم سے 150 ادویات کی قیمتیں ایڈجسٹ کر لیں انڈسٹری یہ قدم نہ اٹھاتی تو ملک میں جان بچانے والی ادویات کا بحران پیدا ہو جاتا اور یوں ہزاروں مریضوں کی زندگیوں خطرے میں پڑ جاتیں۔ انڈسٹری کا کہنا ہے ہم نے 40 لاکھ لوگوں کو روزگار بھی فراہم کر رکھا ہے۔ ہم اربوں روپے پکس بھی دیتے ہیں ہم ملکی ضرورت کی 93 فیصد ادویات بھی ملک میں بناتے ہیں۔ پاکستان کی 95 فیصد ادویات کی قیمتیں سارک کے دوسرے ممالک کے مقابلے میں کم ہیں وہ ادویات جو ہجارت اور پاکستان دونوں میں تیار ہوتی ہیں وہ پاکستان میں ستر فیصد سستی ہیں۔ انڈسٹری کا کہنا ہے ہمارے ملک میں ادویات اتنی سستی ہیں کہ ملک سے ہر سال کروڑوں روپے کی ادویات افغانستان ایران اور سنٹرل ایشیا سہگل ہوتی ہیں۔ انڈسٹری کا کہنا ہے ہماری بات سننے کیلئے کوئی شخص اور کوئی ادارہ تیار نہیں لہذا ہم کہاں جائیں ہم کس کے دروازے پر ہاتھ پھوڑیں۔

میں صحت کی وزیر ملک سازہ افضل تارڑ کو ذاتی طور پر جانتا ہوں یہ سمجھ دار اور ورد دل رکھنے والی خاتون

ہیں۔ میں نے انہیں ہمیشہ اعزازی کے مسائل کو سمجھنے اور ان کے جائز مطالبات کو ماننے دیکھا لیکن مجھے یہ بھی لائنس روک کر دینے میں دس دس کروڑ روپے کمالیتے ہیں۔ ہم اس سلسلے میں ہینا ٹینس کی کی دوا کی مثال دے سکتے ہیں۔ پاکستانی کمپنیوں نے جولائی ۲۰۱۵ء میں یہ دوا بنانے کی درخواست دی لیکن وزارت اجازت کو تھیت کر مارچ ۲۰۱۶ء تک لے گئی۔ ان آٹھ نو مہینوں میں کیا ہوا؟ اس دوران وفاقی حکومت کے سینئر ترین وزیر کے ایک سرکاری رشتہ دار وہ دوا 38 ہزار روپے فی ڈبی فروخت کرتے رہے جو اس وقت میرے دوست خواجہ اسد ساڑھے پانچ ہزار روپے میں بنا کر بیچ رہے ہیں ان نو مہینوں میں طاقتور وزیر کے سالہ صاحب سوہوٹوں لے چکے ہیں۔ سماعت جاری ہے۔ میری درخواست ہے عدالت طاقتور وزیر کے طاقتور رشتہ دار تک پہنچنے کیلئے خواجہ اسد کو عدالت کی کارروائی کا حصہ بھی بنائے اور ان کو ماہ کا فائدہ اٹھانے والی کمپنی سے ریکوری کا حکم بھی جاری کرے۔

ملک میں 374 انتہائی ضروری ادویات ہیں یہ فہرست کسی مقامی کمپنی نے تیار نہیں کی یہ ”ورلڈ ویلڈ آرگنائزیشن“ کی طے کردہ ہے اور یہ ادویات صرف ادویات نہیں ہیں یہ انسانیت کی دوا میں ہیں دنیا ملکوں پر مکمل پابندیوں کے دوران بھی ان ادویات کی سپلائی منقطع نہیں ہونے دیتی لیکن پاکستان میں حکومتی بے حس کی وجہ سے یہ ادویات بھی حاشر ہو رہی ہیں وزارت صحت ڈیپول اور کیسٹری دوا دونوں کو ایک ہی حکم کی لاشی سے ہانک رہی ہے اور اس پالیسی کا نقصان بے چارے مریض اٹھا رہے ہیں۔ حکومت انتہائی ضروری ادویات کو دوسری ادویات سے الگ کیوں نہیں کرتی؟ آپ انتہائی ضروری ادویات کی کوآئی اور سپلائی پر توجہ دیں اور قیمت مارکیٹ پر چھوڑ دیں کمپنیوں میں ”کمپنی ٹیشن“ ہونے دیں کمپنیاں مارکیٹ کا زیادہ سے زیادہ شیئر لینے کیلئے آپس میں گھرائی کر رہیں گی یوں قیمتیں کم ہوتی رہیں گی اور یوں مقامی کمپنیوں کو قیمت کے ساتھ جرم سوگ اور امریکی معیار کا مقابلہ یہ باہر سے ملک میں آجائے گی اور یوں مقامی کمپنیوں کو قیمت کے ساتھ جرم سوگ اور امریکی معیار کا مقابلہ بھی کرنا پڑے گا اور اس کا فائدہ یقیناً مریضوں کو ہوگا۔ ہمیں یہ حقیقت بھی ماننا ہوگی ملک میں 80 ہزار ادویات بن رہی ہیں قیمت صرف 150 ادویات کی بڑی اور ملک میں کھراں ہر ایک ملک میں حکومت اس وقت عدالتوں میں دھکے کھا رہی ہے کوئی ان سے یہ پوچھتے آپ نے معاملات کو اس طرح چاٹنے ہی کیوں دیا تھا؟ آپ نے جب مارچ ۲۰۱۵ء میں فارمولہ طے کر دیا تھا تو پھر آپ یہ فیصلے کر دیتے۔ یہ کمپنیاں عدالت جانے پر مجبور نہ ہوتیں یہ عدالتی حکم پر قیمتوں میں اضافہ بھی نہ کرتیں اور یوں یہ بحران پیدا نہ ہوتا۔ حکومت اس وقت بھی معاملے کو سلجھانے کے بجائے بکاؤتی چلی جا رہی ہے۔ یہ اعزازی کے ساتھ بیٹھ کر مسئلہ حل کرنے کے بجائے ریاستی طاقت استعمال کر رہی ہے۔ مجھے خطرہ ہے یہ جنگ صورتحال کو کہیں اس سطح پر نہ لے جائے جہاں پہنچ کر دوا ساز اداروں نے پینسلین بنانا بند کر دی تھی آپ خود سوچئے وہ ادارے جو 13 سال سے سرکاری برآمدوں میں مارے مارے پھر رہے ہیں جو حکومتی دروازوں پر کھڑے ہیں مار مار کر لہو لہاں ہو چکے ہیں وہ یہ نہیں کریں گے تو کیا کریں گے اور اگر ادویات بننا بند ہو گئے تو اس کا ذمہ دار کون ہوگا؟ اس بحران کی ذمہ داری کس کے گلے میں آئے گی آپ آج یہ فیصلہ کر لیں کیونکہ وہ دن آسے گا کہ زیادہ دور نہیں ہیں جب ملک میں بجلی اور گیس کے ساتھ ساتھ ادویات کی لوڈ شیڈنگ بھی شروع ہو جائے گی۔

کمال کی آغوش
کمال کی باتیں
کمال کی تحریروں
کمال کی اصلاح و تہذیب
کمال کے معجزات



کمال کی باتیں

(کمال احمد رضوی)

پچھلے دنوں جناب کمال احمد رضوی صاحب کا انتقال ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ ان کو اپنی جوار رحمت میں جگہ دے آمین۔

ان کی ایک کتاب ”کمال کی باتیں“ مارکیٹ میں شائع ہو کر آئی ہے۔ اس کتاب کی تعریف میں کیا کہوں۔ کتاب ایسی ہے آپ پڑھنا شروع کریں تو آپ کے سامنے کمال صاحب کا سیریل ”الف ن“ چلنا شروع ہو جاتا ہے۔ آپ اس زمانے میں پہنچ جاتے ہیں جب فی وی پر کمال احمد رضوی کے نام کا طوطی بولتا تھا۔

یہ کتاب الاٹلش پیکی کیشن 36-A ایڈیشن اسٹوڈیو 16-B سائٹ کراچی نے شائع کی ہے۔ ناشر فاروق احمد صاحب ہیں قیمت 490 روپے ہے۔

(ایڈیٹر)

84ء سے 2015ء تک..... کمال کے ساتھ

(عشرت جہاں رضوی)

کمال کا اور میرا ساتھ اکتیس سال اور اکتیس دن کا رہا۔ اتنے سالوں میں کمال کی شخصیت کے پہلوؤں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ ان کی شخصیت کے اتنے رنگ تھے کہ ان کو سمجھنے کے لئے شاید اتنے ہی سال درکار تھے۔ 16 نومبر 1984ء سے 17 دسمبر 2015ء تک یہ داستان حیات اس

وقت شروع ہوتی ہے جب میں عشرت برہان سے بیگم کمال احمد رضوی بنی۔ اس وقت یہ اندازہ نہیں تھا کہ جو نیا سفر میں شروع کرنے جارہی ہوں وہ کتنا مشکل ہے۔ شاید وہ میری عمر کا تقاضا تھا یا میری آنکھوں پر بندھی ہوئی محبت کی وہ پٹی تھی جس سے آگے دیکھنا میرے لئے شاید ممکن نہ تھا۔ میرے نزدیک وہ انتہائی ذہین، بذلہ، سچ، محبت کرنے والے، خوش خوراک، خوش لباس اور نیش مکھ انسان تھے۔ ان کی شخصیت کا دوسرا رخ اتنا پرستی اور غصہ تھا جو میری آنکھوں سے اوجھل تھا۔ پھر وقت کے ساتھ ساتھ یہ رنگ بھی کھلتے گئے۔ کبھی تو محبتوں کی برسات ہوتی تو کبھی غصے کے اولے سر پر برسے لگتے۔ مگر میں نے میدان خالی چھوڑنا مناسب نہ سمجھا اور اس چیلنج کو قبول کر لیا کہ کمال احمد رضوی کو فتح کر لینا ہی میری کامیابی ہے۔

ہماری ازدواجی زندگی میں بڑے اتار چڑھاؤ آئے مگر اس کے باوجود یہ گاڑی چلتی رہی۔ کمال بہت اتار پرست تھے۔ اگر ان کو اپنی غلطی کا احساس ہوتا تو اس پر دل میں تو ضرور شرمندہ ہوتے مگر اظہار کرنا یا معافی مانگنا ان کی شان بخلاف تھا۔ میں اس انتظار میں رہتی کہ شاید وہ کبھی مجھ سے اپنے رویے پر کم از کم سوری ہی کہہ دیں مگر ایسا نہیں ہوتا تھا۔ دودن کی خاموشی کے بعد ہم میں سے کوئی بھی اس خاموشی کو توڑ دیتا جیسے کوئی بات ہی نہ ہوتی تھی۔ اس میں بھی پہل مجھ کو ہی کرنا پڑتی تھا تا کہ ہم دونوں کو پتہ نہ چل سکے۔

بحیثیت شوہر وہ ایک مثالی شوہر تو نہ بن سکے لیکن بحیثیت دوست ہم نے بہت ہی اچھا وقت گزارا۔ انہوں نے مجھے جینے کا ڈھنگ سکھایا، میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا۔ آج میں جو کچھ ہوں ان ہی کی مرہون منت ہوں۔ میں نے ان کو اچھا دوست، اچھا پارٹنر اور رازدار بن کر دکھایا۔ ان کی گزری ہوئی زندگی کا ایسا کوئی لمحہ ایسا کوئی واقعہ نہ تھا جو انہوں نے مجھ سے بتایا ہو یا سنایا نہ ہو۔ یہاں تک کہ وہ اپنے دیرینہ دوستوں کے بارے میں بھی تمام باتیں مجھ سے کرتے تھے۔ کبھی کبھی تو ایسا لگتا جیسے ہم ایک ہی دماغ سے سوچتے ہیں۔

کمال کے اندر کا غصہ دراصل ان کی وہ محرومیاں تھیں جو ان کو ورثے میں ملی تھیں۔ چھوٹی عمر میں والدہ کے انتقال کے بعد اکیلے رہے۔ والد صاحب نے دوسری شادی کی، سوتیلی بہن اور بھائی نے ان کے اندر ایک نفرت اور ایک غصہ پیدا کر دیا تھا۔ شاید ان کے اکیلے پن کا رد عمل تھا جو کبھی بے زاری اور کبھی خورغرضی کی شکل میں نظر آتا مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ بہت حساس اور ہمدرد انسان بھی تھے۔ دوسروں کے حقوق کے لئے بھی لڑنا جانتے تھے اصولوں پر بھی سودا نہیں کیا چاہے جتنا ہی نقصان کیوں نہ ہو۔ خدی اور دھن کے کپے تھے۔ چیلنج کو قبول کرنا اچھا لگتا تھا۔

عمدہ شراب، عمدہ کھانا، عمدہ دوستوں کی محفل بہت پسند تھی شاید اسی لئے دوستوں کی بڑی تعداد ان کے ارد گرد موجود رہتی تھی۔ دوستوں کے معاملے میں بہت خوش قسمت انسان تھے۔ انہیں لوگوں

کے دل میں گھر کرنے کا فن آتا تھا۔ ان کے مطابق ان کی خوش بختی تھی کہ وہ سعادت حسن منٹو، فیض احمد فیض، شاکر علی، سبط حسن جیسے بڑے لوگوں کے درمیان اور قریب رہے۔ پینٹنگز کا بہت شوق تھا اور دوستیاں بھی زیادہ تر پینٹروں سے تھیں۔ معین، مجی، شاکر علی، جمیل نقاش، احمد پرویز، علی امام، وہاب جعفر، سید جہانگیر جیسے مہمان لوگ ان کے بگڑی یار تھے۔ پاکستان آنے کے بعد سے تھیر کے قیام تک ایک طویل جدوجہد کی جس کے قصے وہ مجھے اکثر سنایا کرتے تھے کہ کس طرح سے اس کو پایہ تکمیل تک پہنچایا۔

نئے کے انتقال سے ان کو کافی دھچکا لگا کیونکہ الف فون وہ سیریز تھی جس نے ان کو ایسی پہچان دی جو اب تک قائم ہے۔ مگر پھر بھی ٹی وی سے زیادہ ان کا سب سے پسندیدہ کام تھیر تھا۔ وہ سنجیدہ تھیر کرنا چاہتے تھے وہ عمدہ تھیر جس کی انہوں نے زیادہ ڈالی تھی تھیر کے لئے وہ ڈرامے بہت دل سے اور خوشی سے لکھتے۔ مگر اس کی راہ میں رکاوٹ کمرشل ازم تھی۔ جس کا قلق ان کو آخری وقت تک رہا۔

غیر منقسم ہندوستان میں پیدا ہونے کے باوجود پاکستان ہجرت کرنے کے بعد انہوں نے خود کو ہمیشہ پاکستانی سمجھا اور ثابت بھی کر دکھایا۔ پاکستان سے بے انتہا محبت کرتے تھے۔ پاکستان کے دو لخت ہونے اور موجودہ حالات پر بڑے دل گرفتہ رہتے تھے۔ مردم بیزاری ان کی باتوں سے جھلکے لگی تھی۔ خاموش سے ہو گئے تھے جیسے مسکراتا بھی بھول گئے ہوں۔ لوگوں سے ملنا جلنا بھی کم کر دیا تھا۔ ایک دن مسجد سے واپسی پر انہوں نے مجھ سے کہا کہ اخبار والا مجھ سے ناراض ہو گیا ہے اب سلام دعا بھی نہیں کرتا۔ میں نے کہا مجھے تو سلام کرتا ہے۔ کہنے لگے دراصل اس کی آمدنی میں کمی ہو گئی ہے۔ اخبار کی بندش سے اس لئے میں نے کہہ دیا ہے کہ کل سے اخبار دے جایا کرو۔ دوسرے روز سے اخبار آنا شروع ہوا۔ دیکھا کہ وہ اخبار کو پڑھنے کے بجائے پلیٹ کر رکھ دیتے ہیں میں نے وجہ پوچھی تو کہنے لگے کہ اخبار پڑھنے کے لئے نہیں میں نے حبیب کو خوش کرنے کے لئے لگوایا ہے اب وہ بڑی خوشی سے مجھے سلام کرتا ہے۔

13 نومبر کو امیر عظیم سید نے فیصل آباد لٹرچر فینیشنل میں مدعو کیا تو بڑے شوق سے گئے۔ دیرینہ دوستوں، مستنصر حسین تارڑ، انتظار حسین، کشور ناہید اور دیگر دوستوں سے ملے۔ واپسی پر لاہور قیام کیا اور عزیزوں سے ملے اور واپس کراچی آ گئے۔

11 دسمبر سے 13 دسمبر تک انہرالاہور میں لٹرچر فینیشنل میں شرکت کی۔ لاہور میں دسمبر کا مہینہ کافی سرد ہوتا ہے۔ میں نے کہا سردی بہت ہے آپ جاسکیں گے یا نہیں۔ کہنے لگے نہیں میں جاؤں گا۔ وہاں بھی بڑے سرگرم رہے۔ تمام دوستوں سے ملاقاتیں کیں۔ واپس آئے تو کچھ تھکے تھکے سے رہنے لگے مگر ایسی خوشنویسی کی بات بھی نہیں تھی۔ 17 نومبر کی شام کو حسب معمول مغرب کی نماز سے فارغ ہو کر آرام کرنے کے لئے اپنے بستر میں لیٹ گئے۔ دس منٹ بعد آواز دی کہا کہ میرے پاس آ کر بیٹھو کہیں

شاہد بھائی! کمال کی زندگی کا آخری کامیابی شوق رہا تھا۔

دوسرے دن قبرستان میں T.V چینلو کی بے چینی کا میں خود شاہد ہوں وہ کمرے تانے ایک دوسرے پر گرے پڑ رہے تھے۔ بس نہیں چل رہا تھا کہ قبر میں اتر جائیں قبر کو جیسے ہی بند کیا گیا ہم نے کئی کمرہ بیٹوں کو فون پر یہ کہتے سنا کہ ماشاء اللہ بہت اچھا کام ہو گیا۔ SHOTS اچھے بن گئے۔ پھر ساری گاڑیاں غائب ہو گئیں والہی پر ہم چودھری اسلم کے نہایت خوبصورت مزار پر رز کے اور مزار کی تصویر بنائی۔ بیک گراؤنڈ میں مجھے کمال کا مخصوص نعرہ سنائی دیا جو وہ دانت پٹیں کر لگاتا تھا۔ ”ان کی تو میں..... (وقفہ) عزت کرتا ہوں!“

کمال کو سپرد خاک کر کے ہم جب گھر لوٹے تو پرانی یادوں نے رات بھر سونے نہ دیا۔ 1960ء کی دہائی میں جب الف نون کا ڈکٹانج رہا تھا ہم ایک دوسرے کے قریب آئے تھے۔ پہل میری طرف سے ہوئی تھی جب میں کراچی کے بیچ گھوڑی ہوں میں کمال اور ننھے سے ملے گیا۔ کمال کو جب پتہ چلا کہ میں ایک ایڈورٹائزنگ کمپنی چلاتا ہوں تو وہ دوسرے دن ہی میرے دفتر محبوب مجید صدر کچے گئے اور بلا تکلف میرے بارشرفان حلیم سے اپنے ڈرامے کے بروشر کے لئے اشتہار کی فرمائش کی۔ میں دفتر میں موجود تھا جب آیا تو عرفان نے بتایا کہ ان آیا تھا:

”یار بڑا اسارٹ بندہ ہے۔ سرخ و سفید رنگت چہرہ تمغیا ہوا مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ میرے سامنے پاکستان کا سب سے معروف اور ہر دلخیز انسان بیٹھا مجھ سے باتیں کر رہا ہے اور اس بے تکلفی سے جیسے وہ مجھے پہلے سے جانتا ہے۔ پاکستان کا بچہ بچہ اس کا دیوانہ اس کا پروگرام T.V پر جب آتا ہے تو سڑکیں ویران ہو جاتی ہیں اور ہر گھر سے اس کی آواز گونجتی ہے۔“

اس کے بعد مجھے یاد نہیں کہ کمال سے کب ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ہماری اور عرفان کی سوشل لائف میں یکدم ایک نئی توانائی آگئی۔ ہمارا ایک گروپ بن گیا جس میں عرفان اور میرے علاوہ لطیف کپاڈیا، کمال رضوی، ظفر مسعود، مسعود حیدر، نواب کینٹی، طیب نجفی، محمود احمد، اوصاف خان، سلیم گل شامل تھے۔ اور جب میں نے 1972ء میں استاد ولایت علی خان سے موسیقی کی تعلیم لینا شروع کی تو گلشن اقبال میں ہمارے گھر پر آئے دن کھانے پینے اور گانے کی محفلیں منعقد ہونے لگیں۔ اس چٹا دل چوڑی میں نئے لوگ آنے لگے اور کارواں بنا گیا۔ عنایت اسماعیل، شہناز جاوید ابراہیم خان اور رفیقہ صفیہ بیگ اور سلیم، اسماء احمد اور احمد صاحب، علی امام اور شہناز، ذکیہ سرور، اوشا..... اور بہت سے دوسرے لوگ۔ یہ وہ سنہری دور تھا جب میرے تعلقات میری بیوی سے خاطر خواہ طور پر کشیدہ ہوئے۔

پھر کمال لندن چلے گئے اور جب چند سال بعد وہاں سے لوٹے تو یہ خوشخبری سنائی کہ انہوں نے اپنی زوجہ نمبر 2 کا انتخاب کر لیا ہے۔ نام ہے امینہ عبداللہ دہلی کی رہنے والی ہیں اور شہ دہلی کے مدیر کی رشتہ

میں اندھیرا اندھیرا سا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی کیونکہ شام ہوتے ہی کمال لائٹ جلا دیتے تھے۔ وہ بستر میں لحاف اوڑھے لیٹے تھے۔ نماز نہیں پڑھیں گے؟ میں نے انہیں اٹھایا اور انہوں نے اٹھ کر نماز پڑھی اور بیٹھو۔ تھوڑی دیر میں بولے میرا سر دباؤ! ان کا جسم بالکل ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ یکدم انہیں زور سے سردی لگی اور ایک طرف کو لٹھک گئے اور مجھے غور سے تنکے لگے۔ ایسا لگتا تھا جیسے کچھ کہنا چاہ رہے ہوں پھر آنکھیں بند کر لیں۔ اوپر پڑوس میں ایک میجر ڈاکٹر رہتے ہیں۔ میں ان کے پاس بھاگی۔ انہوں نے بولی ہیں خبر سن کر بولیں ”ہیں؟ کمال کا انتقال ہو گیا؟“ بس پھر کیا تھا بریکنگ نیوز کا ایک سیلاب آ گیا۔ ٹیلی فون کا تانتا بندھ گیا اور وی چینلو کی گاڑیوں نے عسکری 2 پر دھاوا بول دیا۔ چوکیداروں نے انہیں گیٹ پر اندر آنے سے روکا تو وہ غصے میں آ گئے، کمال صاحب پر ہمارا بھی حق ہے، ہمیں اندر آنے دو ہم ان کی بیگم کا انٹرویو کرنا چاہتے ہیں۔

حالات جب بے قابو ہونے لگے تو پڑوس کے میجر نے ریجنل زکو کال کر لیا اور ہم چینلو کی بیلخار سے محفوظ ہو گئے۔ ہم اپنے حواس یکجا کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ ایک سیاسی پارٹی کے کسی صاحب کا فون آیا کہ آپ کمال صاحب کو ہمارے حوالے کر دیں ہم نہایت احترام سے ان کے کفن دفن کا انتظام کریں گے۔ میں نے سوچا کمال گالی دیتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوں گے اور زندگی بھر مجھے معاف نہیں ہوا تھا۔ بھائی اور بہنوئی ادھر ادھر بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ کہیں قبر کی جگہ نہیں مل رہی تھی۔ گورنر ہر جگہ یہی کہتا ہاؤس فل ہے! کسی بڑے آدمی کی سفارش لاؤ تو جگہ نکال لیں گے۔ کسی نے کشمر کراچی کو فون کر دیا کہ اتنے بڑے آرٹسٹ کے لئے دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں؟ کشمر نے کہا آپ فیئر 4 کے قبرستان میں پہنچیں وہاں ہمارا آدمی آپ کو ملے گا۔

وہ آدمی ملا تو مگر نہایت چھوٹی سی جگہ قبر کے لئے دکھائی جس میں کمال کو تہہ کر کے ہی لٹایا جا سکتا تھا۔

بہر حال خدا خدا کر کے قبر کے لئے ایک بہت اچھی جگہ مشہور پولیس افسر چودھری اسلم کی قبر کے نزدیک ملی۔

پھر رمضان چھپا کا فون آ گیا۔ انہوں نے نہلائے دھلائے اور لاش کو اپنے سرد خانے میں رکھنے کی آفر دی۔ چھپا کی ایجوکیشن آئی اور کمال کو لے گئی۔ دوسرے ہی دن T.V چینلو والے پھر پہنچے اور دریافت کیا کہ لاش کس سرد خانے میں ہے میں نے کہہ دیا کہ ایڈھی میں اور وہ سارے سہراب کوٹھ بھاگے!

سیارہ ڈائجسٹ / اپریل ۲۰۱۶ء

25

دار ہیں۔ پڑھی لکھی خاتون ہیں۔ کمال کی خواہش تھی کہ شادی کا کارڈ قریبی چند دوستوں کی طرف سے ہو۔ بہر حال اکتوبر 1974ء میں ان کی شادی ہوئی اور رات گئے ہم دوپہا اور دہن کو لالہ زار میں واقع کمال کے فلیٹ تک چھوڑنے گئے۔

اکتوبر 1982ء میں کمال کی کتاب ”الف نون“ کا اجراء مشہور انٹرکانی نیشنل ہوٹل کراچی میں ہوا جس میں اظہار خیال کے لئے کمال نے جید علمی اور ادبی شخصیات کے ساتھ اس ناچیز کو بھی لا کھڑا کیا۔ کہاں ڈاکٹر کرار حسین، ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر اسلم فرخی، شان الحق حقی، سید محمد تقی، انور عنایت اللہ، سمیع حسن، خوش بخت شجاعت اور کہاں میں۔ اللہ اللہ! اس لمحہ ہم نے موقع غنیمت جانا اور اپنے دوست کی خوب خوب ٹانگ چھینی مثلاً ہماری تقریر سے ایک اقتباس۔

”جناب صدر۔ ویسے تو اظہار خیال اتنا مشکل کام بھی نہیں۔ مجھے سعادت حسن منٹو کا اپنے دوست رفیق غزنوی پر اظہار خیال یاد آ رہا ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب ”لاؤڈ سپیکر میں رفیق غزنوی پر جو اظہار خیال کیا وہ یہ تھا کہ رفیق غزنوی بڑا کمینہ انسان ہے مگر یہ بات سعادت حسن منٹو ہی لکھ سکتے تھے گرچہ میرے لئے اظہار خیال کا یہ موقع غنیمت ہے میرے قلم میں نہ اتنی طاقت ہے نہ مجھ میں اتنی سعادت اور نہ ہی میرے رفیق کمال احمد رضوی میں اتنی غنیمت کہ ان پر کوئی معرکتہ لارا مضمون لکھا جاسکے۔ ویسے بھی مجھے جیسے انسان کو یہ زیب نہیں دیتا کہ کسی شخص پر خواہ وہ ہمارا دوست ہی کیوں نہ ہو کوئی آخری فیصلہ صادر کروں کیونکہ میرا گریبان تو خود اتنا چاک ہے کہ منہ تو منہ پورا انسان اس میں سے گزرا جاسکتا ہے۔ اور اپنے اس گریبان میں جب میں جھانکتا ہوں تو مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ میں خود کتنا بڑا کمال احمد رضوی ہوں۔“

مجھے یاد ہے میرے اس جملے پر کمال نے تالیاں بجاتی تھیں۔ کمال نے انسانی کمینگی کا بڑا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ اتنا گہرا کہ جو شخص کمینہ نہیں بھی ہوتا تھا وہ بھی اسے کمینہ نظر آتا تھا۔ اور اس کی ہمت ملاحظہ فرمائیے کہ الف نون میں کہنے کر دار کے لئے اس نے اپنے آپ کو منتخب کیا اور اس کر دار کو اس خوش اسلوبی سے نبھایا کہ ساری دنیا میں اس کے کروڑوں دیکھنے والے عش عش کراٹھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ کمال کا خود اپنے آپ کو الف نون میں ایک جالاک اور بڑے آدمی کی طرح پیش کرنا اس کی انسان دوستی اور محبت کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ کمال میرا دوست مر گیا۔

اپنے آخری سالوں میں وہ مجھ سے بڑی بے لوث محبت کرنے لگا تھا۔

☆

کمال احمد رضوی..... چند باتیں اور ایک انٹرویو (راشد اشرف)

سیارہ ڈائجسٹ / اپریل ۲۰۱۶ء

25

17 دسمبر 2015ء کی رات آٹھ بجے لاکھوں پرستاروں کے ہر دل عزیز کمال احمد رضوی المعروف ابن کراچی میں واقع اپنی قیام گاہ پر دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کر گئے۔

راقم کو ان سے ایک تعلق خاطر تھا۔ ان پر لکھا بھی، انٹرویو بھی کیا، تاثرات بھی ریکارڈ کئے۔ الف نون کے چند نایاب ڈراموں کو یوٹیوب پر شامل بھی کیا۔ گزشتہ چھ برسوں میں کمال صاحب سے ان محنت ملاقاتیں رہی تھیں پھر یوں ہوا کہ تعلقات نے گھر بیوہ مرحوم کی شکل اختیار کر لی۔ نجی وادبی محفلوں میں راقم نے انہیں جب بھی مدعو کیا وہ بلا تامل چلے آئے تھے حالانکہ وہ کم از کم دہائی سے مکمل گوشہ نشینی کی زندگی گزار رہے تھے۔ دسمبر 2014ء میں امریکہ سے آئے بزرگ ادیب جناب الو الحسن نجی اور کمال صاحب کی ملاقات کی یادیں باتیں اور جذباتی مناظر تو ذہن میں ہنوز تازہ ہیں وقت رخصت نجی صاحب کمال رضوی کو گلے لگا کر بے اختیار رو پڑے تھے۔

سترہ دسمبر کی رات آٹھ بجے میں منٹ پر پہلے ایک فی وی جیتل نے کمال صاحب کے انتقال کی خبر زیریں پٹی میں چلائی۔ لکھا تھا وہ ایک طویل عرصے سے طبع تھے۔

ایک دوسرے جیتل کو خیال آیا کہ بریکنگ نیوز کی اس لا حاصل دوڑ میں ہم پیچھے کیوں رہیں سو انہوں نے لکھا ”کمال رضوی سانس کی تکلیف کے باعث کچھ دنوں سے ایک نجی ہسپتال میں داخل تھے۔“ انہیں یہ علم ہی نہیں تھا کہ کمال صاحب محض تین روز قبل لاہور کا ایک ہجر پور دورہ کر کے واپس لوٹے تھے جہاں انہوں نے لاہور ٹیلی ویژن کے اپنے دوستوں سے ملاقاتیں کیں اور خوب جی بھر کر باتیں بھی کیں وہ لاہور میں منعقدہ ادبی ثقافتی میلے میں مدعو کئے گئے تھے۔

پھر وہی ہوا جو ہوتا ہے۔ درجن بھری وی جیتلوں نے ”طویل عرصے سے طبع تھے“ کے جملے کو دہراتا شروع کیا اور آفا فانا دنیا بھر میں یہ خبر چھپتی چلی گئی۔ راقم الحروف نے سوشل میڈیا پر کمال صاحب کے انتقال کی خبر پیش کی تو اس کے پانچ منٹ میں امریکہ میں مقیم رفیق خاور المعروف ننھا کے بیٹے اور راقم کے دوست نجی خاور صاحب نے راقم سے رابطہ کیا اور خبر کی تصدیق چاہی علالت والی بات پر وہ بھی پریشان تھے کہ اس کی نوعیت کیا تھی وغیرہ وغیرہ۔

ستم ظریفی دیکھئے کہ نجی خاور محض دو ہفتے بعد کراچی آنے والے ہیں اور کمال رضوی صاحب سے ملاقات ان کی پہلی ترجیح تھی۔

”اب کون میری بات پر یقین کرے گا کہ میں ان سے زندگی میں پہلی مرتبہ ملاقات کرتا“ وہ ملاقات جس کے لئے میں دو سال سے بے چین تھا گرچہ آپ کے توسط سے فون پر کئی مرتبہ بات کر چکا تھا۔“

نجی خاور کہہ رہے تھے۔

راقم نے ایک کمزوری کوشش کی اور دو عدد ڈی وی چینلوں سے انہیں درست صورتحال سے آگاہ کیا مگر کون سنتا ہے فغان درویش۔ ڈی وی جیتل کے تھار خانے میں اس قدر شور و غوغا ہے کہ

اگر رہا ہے۔ ایک معروف انگریزی اخبار کارپوریزم جو ایک معاملے میں ان سے بدعہدی کر بیٹھا تھا، سر جھکانے کی ڈانٹ سن رہا ہے اور وہ نئی طرح گرج رہے ہیں۔ میں نے پہلے کبھی ان کو اس قدر غصے میں نہیں دیکھا تھا۔ خدا خدا کر کے ان کا غصہ ٹھنڈا ہوا اور مجھ سے کہنے لگے:

”اسے کہہ دیجئے کہ کل شام کو انٹرویو کے لئے آجائے“..... اور وہ شخص خوش خوشی وہاں سے رخصت ہوا تھا۔

کمال صاحب کو 22 برس قبل دل کا دورہ پڑا تھا۔ اس کے بعد بہترین علاج اور ان کی اہلیہ کی انتہائی توجہ کی بنا پر انہیں کبھی یہ احساس ہی نہ ہوا کہ وہ دل کے مریض ہیں شام کی چھل قدمی ان کے معمولات کا حصہ تھی۔ ذیابیطس کی شکایت ضرور تھی مگر انسولین لیتے تھے اور اس میں کبھی تاخیر نہیں کرتے تھے۔ ان کی شوگر ہمیشہ قابو میں رہتی تھی۔ راقم ایسے کئی موقعوں کا گواہ ہے جب دوران تقریب ان کی انسولین کا وقت ہوا اور سچ کے ایک گوشے میں جا کر ان کی اہلیہ نے انہیں انسولین لگائی۔

سترہ دسمبر 2015ء کو کمال صاحب نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ گھر پر ہی رہے تھے اور آرام کرتے رہے تھے۔ عشاء کی نماز کے بعد ان کی اہلیہ عشرت جہاں نے ان کو گلوکوز کا ایک گلاس بنا کر دیا کہ مبادا ان کی شوگر کم ہو جائے۔ وہ اپنے کمرے میں تھے بستر پر لیٹے ہوئے تھے اور کمزوری محسوس کر رہے تھے ان کی اہلیہ نے ان کو سہارا دے کر دیکھنے ان کے سر کے نیچے آرام کی خاطر لگا دیئے تھے۔ ان کو گلوکوز کا گلاس بنا کر دیا جسے تھامنے کے لئے وہ بہ مشکل اٹھے اور اسی اثناء میں دوسرے کچھ کے اوپر گر گئے۔ طب کی اصطلاح میں یہ ایک MASSIVE HEART ATTACK تھا۔ ان کا ہاتھ اپنی بیگم کے ہاتھ میں تھا اور وہ کمزور لیٹے میں آہستگی سے صرف اتنا کہہ سکے تھے کہ ”میرے پاس ہی بیٹھی رہو“۔ اگلے چند لمحوں وہ ایک ہی جانب نظریں جمائے دیکھتے رہے اور پھر یک لخت ان کا ہاتھ بے جان ہو کر اپنی بیگم کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا۔

ان کے قلیٹ کی دوسری منزل پر ایک لیڈی ڈاکٹر رہتی ہیں جو کمال رضوی کی اہلیہ کی دوست ہیں۔ کمال صاحب کی اہلیہ بھانگی ہوئی تھیں اور انہیں بلا لائیں۔ لیڈی ڈاکٹر نے نبض دیکھی مگر کمال صاحب اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ آنا فانا بناسی کو تکلیف دینے چلتے پھرتے..... اس انداز سے جس کے لئے ہمارے بزرگ ہمیشہ دعا گو رہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں اسی طور دنیا سے اٹھائے۔

“GOD’S FINGER TOUCHED HIM AND HE SLEPT”

کمال صاحب کے ساتھ ارتحال سے کچھ ہی عرصہ قبل ایک روز ان کا فون آیا تھا۔ وہ اپنی بھاری آواز میں کہہ رہے تھے: ”بھئی راشدا! اتوار کی صبح آجاؤ“ معراج جانی صاحب کو بھی لے آؤ شبت ہمارے ساتھ کرنا۔“

اور ہم دوڑے چلے گئے تھے۔

الامان.....

اگلی صبح تک یہی سلسلہ چلتا رہا۔ آپ نے گزشتہ اوراق میں ایس ایم شاہد صاحب کا مضمون پڑھا ہوگا۔ مذکورہ مضمون زیر نظر تحریر کے بعد لکھا گیا تھا کمال صاحب کے انتقال کے بعد میڈیا کے کردار سے متعلق جو باتیں شاہد صاحب نے لکھی ہیں ان میں اور راقم کے مضمون میں مماثلت ہے مگر کیا کیجئے کہ ہم کبھی اس اذیت سے دوچار تھے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ ٹی وی چینلوں کے سنجیدہ رپورٹرز معروف بھارتی فلم ”مہین میری جان“ ایک مرتبہ ضرور دیکھیں جس میں سوہا علی نے ٹی وی رپورٹر روپالی جوشی کا کردار ادا کیا ہے۔

ایک اخبار نے لکھا کہ کمال احمد رضوی نے دو شادیاں کی تھیں اور ان کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ دوسرے نے لکھا کہ انہوں نے سوگواروں میں اہلیہ بیٹا اور ماں کو چھوڑا ہے۔ سبحان اللہ 85 برس کے کمال رضوی کی والدہ اگر ہوتیں بھی تو کم از کم ایک سو پانچ یا دس برس کی ہوتیں مگر وہ تو کب کی اس دنیا سے جا چکی ہیں۔

لیکن صاحبو! یہ بات بھی سچ ہے کہ اخبار والوں کے پاس بسا اوقات وہ خبریں ہوتی ہیں جن کی عام لوگوں کو بھوک بھی نہیں ہوتی لہذا خیال آیا کہ اس کی بھی تصدیق کر لی جائے۔ راقم نے کمال صاحب کی اہلیہ محترمہ عشرت جہاں سے بات کی۔ ان کا جواب ملاحظہ کیجئے۔

”آپ خود بتائیے! یہ خبر سچ ہو سکتی ہے؟ یہ تو ایک طرف، کچھ ہی دیر پہلے ایک اخبار سے فون آیا وہ صاحب مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ کمال صاحب کی کتنی بیٹیاں ہیں اور کتنی بیویاں ہیں؟ میں نے بے بسی سے جواب دیا کہ بھیا! ان کی اکلوتی بیوی میں ہی ہوں۔“

راقم کے پاس کمال صاحب کے دینے کئی یادگار وکیاں تھیں۔ مثلاً ان پر کئے گئے ایم فل کا مقالہ جسے میں نے اسٹین کر کے محفوظ کر لیا ہے، مسودے وغیرہ۔ مگر ایک تھوہ تو غضب ہے۔ یہ بی بی وی کی وہ ڈاکیومنٹری ہے جس کا عنوان ہے:

”A PORTRAIT OF KAMAL AHMED RIZVI“

اسے کمال صاحب نے وی سی آر کی کیسٹ کی شکل میں عنایت کیا تھا جسے میں نے ڈی وی ڈی میں منتقل کروا لیا تھا۔ اسے فیس بک پر اپ لوڈ کر دیا گیا ہے یہ کمال صاحب کے پرستاروں کے لئے ایک بہترین تحفہ ہے۔ کیونکہ بقول کمال صاحب یہ ٹی وی والوں کے پاس بھی نہیں ہے۔ ایک صاحب کا فون آیا کہہ رہے تھے کہ یہ آپ نے کیا غضب کیا؟ یہ تو انٹرنیٹ پر بھی نہیں ہے۔ اس پروگرام کو تو آپ کسی کے ہاتھوں فروخت کر دیتے۔ عرض کیا کہ کمال صاحب کے پرستاروں کے ہاتھوں فروخت کر چکا ہوں۔

اب یاد کرتا ہوں تو کمال احمد رضوی کی کئی باتیں یاد آتی ہیں۔ ذہن کے پردے پر ایک ایک منظر

ان کی اہلیہ کے بنائے گرم گرم خشکاش کے پر اٹھوں اور دیگر فواکھات سے ہماری تواضع کی گئی اور ہمیشہ کی طرح کمال صاحب کی دلچسپ باتیں، کبھی ہنسانے والی اور کہیں کہیں افسردہ کر دینے والی اس پر مستزاد۔ وہ خود تو افسردہ کیا ہوتے تھے ہم ہی انہیں یاد ماضی کو آواز دینے کے ان کے مخصوص انداز کی بنا پر افسردہ ہو جایا کرتے تھے۔ گزرے ہوئے تلخ ماضی کی باتیں سننا بعض اوقات سامع کے لئے بھی تو باعث ملال ہو سکتا ہے۔ محمد خالد اختر کے الفاظ میں کہوں گا کہ کمال احمد رضوی ان لوگوں میں سے تھے جو زندگی کو کھیل نہیں سمجھتے اور اس سے آہنی ہاتھوں سے منٹنا جانتے ہیں۔

اس روز کی محفل ہمیشہ یاد رہے گی۔ وقت کی شاخ سے وہ چند پر سرت ساعتیں علیحدہ ہو کر گری تھیں اور تیزی سے ماضی کا حصہ بنی چلی گئی تھیں۔

اک بار وقت سے لہو گر اکھیں

وہاں داستان ملی کچھ کہیں نہیں

تھوڑا سا ہنسائے، تھوڑا سا رلائے، بل یہ بھی جانے والا ہے!

یہ سب کچھ اب کبھی نہیں ہوگا۔ یہ محبت یہ خلوص، میں اس سے محروم ہو گیا ہوں۔ ہم سب اس سے محروم ہو گئے ہیں۔ کمال صاحب کے جانے سے یوں محسوس ہوتا ہے گویا ایک تناور درخت تھا جو یک لخت جز سے اکھڑ گیا اور اپنے متعلقین کو اپنے گھنے سائے سے محروم کر گیا۔

زیر نظر کتاب ”کمال کی باتیں“ کا عنوان کمال رضوی اپنی زندگی میں ہی طے کر گئے تھے۔ تین برس قبل انہوں نے ایک طویل عرصے بعد قلم اٹھایا تھا اور منٹو پر ایک ادبی پرچے میں ان کی دلچسپ تحریر شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعد چند مزید تحریریں مختلف پرچوں میں شائع ہوئیں۔ راقم کو احساس ہوا کہ بجائے مختلف رسائل میں لکھنے کے وہ یہ سب کچھ کتابی شکل میں شائع کریں تو بہتر ہوگا۔ ایک روز موقع دیکھ کر اپنی خواہش کا اظہار کر ڈالا۔ کمال صاحب خاموش ہو گئے، کچھ نہ کہا۔ چھ ماہ گزر گئے۔ ایک روز فون کیا اور عرض کیا: حضور! کافی عرصے سے آپ کی کوئی تحریر کسی رسالے میں نہیں دیکھی۔ وہ ایک دم سے بولے: آپ ہی تو نے کہا تھا کہ کتاب آئی جا ہے۔ مجھ پر گھڑوں پانی پر گیا۔ ساتھ ہی ایک احساس نفاخر نے مجھے گھیر لیا کہ انہوں نے مجھ حقیر کی بات رکھی۔ عرض کیا اچھا کیا آپ نے اب کتاب ہی آئی جا ہے۔

مگر پھر ان کے لکھنے کے عمل میں تعطل آتا رہا۔ اس میں ان کے موڈ کا خاصا دخل تھا۔ وہ لکھتے تھے اور پھر یک لخت سلسلہ روک دیتے تھے۔ پھر کافی عرصے کے بعد اچانک دوبارہ لکھنا شروع کر دیتے تھے۔ گزشتہ ایک برس میں یہ سلسلہ ایک مرتبہ پھر ٹوک گیا تھا۔ بہر حال جو کچھ بھی اور ہوتا کچھ بھی لکھا گیا وہ غنیمت ہے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ یہ کتاب کمال صاحب کی زندگی میں شائع نہ ہو سکی۔ ان کے انتقال کے بعد اس کی نویسی اشاعت ان کی اہلیہ کے بے مثال تعاون سے ہی ممکن

ہو سکی ہے۔

آپ ”کمال کی باتیں“ کا انداز تحریر دیکھئے۔ کئی مقامات پر آپ کو ”ان“ کی واضح جھلک نظر آئے گی۔ فیض کے متعلق تحریر میں ایک موقع پر جب فیض مشروب خاص سے اجتناب کرتے ہیں تو کمال صاحب بے اختیار کہہ اٹھتے ہیں: ”اس ڈاکٹر کے دل سے خوف خدا اٹھ گیا ہے جو معج کر رہا ہے۔“

کمال احمد رضوی نے لاہور میں ایک بوہی مین طرز کی زندگی گزاری۔ ”کمال کی باتیں“ کا سفاکانہ اور کھرا انداز تحریر اس طرز زندگی کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔

مجھے اس بات پر بھی فخر ہے کہ بیگم کمال رضوی نے راقم کی درخاست پر اپنے خاندان پر ایک نہایت عمدہ اور دلچسپ تعارفی مضمون لکھا ہے۔ جو لوگ پہلی مرتبہ لکھتے ہیں وہ بہت اچھا لکھتے ہیں۔ ایسا ہی ایک تجربہ مجھے اس وقت ہوا تھا جب شاہد احمد دہلوی مرحوم کے صاحبزادے نے اسی انداز کا مضمون اپنے والد پر لکھا تھا جو ان کی پہلی تحریر تھی۔ بلاشبہ بیگم کمال کی تحریر ایک سچی اور جرأت مند تحریر ہے۔ اپنے خاندان کی طرح انہیں بھی جھوٹ سے نفرت ہے۔ لہذا جو کچھ بھی انہوں نے لکھا ہے وہ سچ لکھا ہے۔ اس مناقبہ نہ معاشرے میں، میں اسے ایک تازہ ہوا کا جھونکا کہوں گا۔ جب میں اور فاروق احمد اسے پہلی مرتبہ پڑھ رہے تھے تو خوش گوار حیرت کا احساس ہمارے چہروں پر نقش ہو کر رہ گیا تھا۔ ہم نے استفہامیہ نظروں سے بیگم کمال کی جانب دیکھا وہ مطلب ہمارا سمجھ گئیں اور جواب دیا: ”کمال جیسے تھے میں نے انہیں ویسا ہی نہیں کیا ہے۔“

اور ہمیں یوں محسوس ہوا گویا کمال صاحب کہہ رہے ہوں کہ:

”میاں! منٹو میرا پسندیدہ انسان تھا۔ اس کے خاکے میں نے اس سے اپنی ذہنی ہم آہنگی کے بارے میں سب کچھ لکھ دیا ہے کیا تم یہ توقع کرتے ہو کہ میری بیگم مجھے بقول منٹو ڈرائی کلین کر کے رحمت اللہ علیہ کی کھوٹی پر ٹانگ دے؟“

اور پھر کمال صاحب کے عزیز دوست جناب اور میرے کرم فرما بزرگ اور گوشہ نشین ادیب جناب ایس ایم شاہد صاحب نے بھی باوجود اپنی از حد مصروفیت مجھے حقیر کی درخواست کو رد نہ کیا۔ ذرا دیکھئے تو سبھی کس کس ڈنٹیں انداز میں انہوں نے اپنے دوست کو یاد کیا ہے۔

منٹو: فیض احمد فیض، حفیظ جاوید، شوکت رضوی، احمد پرویز، انور جلال، حمزہ، قتل حسین، ستارہ بان، کانپوری..... غرض اس کتاب میں کمال رضوی نے ایک کہکشاں سجائی ہے اور گزرے ہوئے کل کو اپنے مخصوص انداز میں یاد کیا ہے۔ ایک ایسا انداز جو ہر کسی کو نصیب نہیں ہوتا۔

کمال احمد رضوی کا انداز تحریر بے ساختہ اور سچا ہوا ہے اور اس میں ایک دبا دبا سا طنز لہریں لپکتا ہے۔

اس انداز بیان کو کون پسند نہ کرے گا کہ جب وہ اپنے نانا کا تذکرہ کرتے ہیں:

”میں نے اپنے نانا جان ٹیلی احمد کو ہمیشہ دھوئی میں ہی دیکھا تھا جو وہ زیب تن کر کے شہر ”میاں“

میں ہائی کورٹ کے سامنے ایک کھوکھے میں اپنے کیم و ٹیم ریٹنگلن ٹائپ رائٹر کے ساتھ براہمان ہوتے تھے۔ یہ ان کے گھر سے دس منٹ کے فاصلہ پر تھا اور یہ ٹائپ رائٹر ہر روز ایک مزدور ایک پیسہ یومیہ کی اجرت پر وہاں اپنے سر پر پہنچا کر آتا تھا اور وہ بیٹھ کر سالوں کی ضرورت کے مطابق کاربن پر کاغذ چڑھا کر بے مکان عرضیاں اور وکالت نامے ٹائپ کرتے تھے۔ اب برس ہا برس بعد مجھے ان کی وضع قطع کے پیچھے ایک مصلحت کارفرما نظر آتی ہے۔ وہ یہ سوانگ شاید اس لئے رچانے پر مجبور تھے تاکہ مروجہ تعصب میں کوئی ہندو یا غیر مسلم کلائنٹ ہاتھ سے نہ جاتا رہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ ہمیشہ اپنے سر کے بال منڈا کر روایتی پنڈت والا روپ اختیار کئے رکھتے تھے۔ ماتھے پر تشقہ انہوں نے یوں نہیں کھینچا ہوگا تاکہ مسلمان بھی قائم رہے۔

ایک دوسری جگہ کس بے ساختگی سے وہ اپنی بات ان الفاظ میں کہہ جاتے ہیں کہ ہماری زندگی کئی کہانیوں میں بنی ہوئی ہے صرف ان کو ہاتھ لگانے کی دیر ہے سب کچھ سامنے آ جاتا ہے۔

کمال رضوی کس عمدگی سے حالات کے تجزیے پر قادر تھے اس کا اندازہ درج ذیل اقتباس سے لگایا جاسکتا ہے۔

”بھٹو صاحب نے اقتدار سنبھال لیا تھا۔ شاہ صاحب ناشتہ کی میز پر اخباروں کی سرخیاں پڑھ کر اپنی تمام تر مصوہیت کے ساتھ بھٹو کو داد دے رہے تھے۔ اس لئے کہ وہ ہر روز ایک ادارے کو پرائیوٹائز کر رہے تھے اور پاکستان بھر کے مزدوروں کو روٹی، کپڑا اور مکان کا مزدورہ سنا کر طوں کارخانوں کے جلاؤ گھیراؤ کا تھک پیش کر رہے تھے۔ اصل میں ہمیں تبدیلی چاہئے ہوتی ہے۔ تبدیلی ہر قیمت پر تبدیلی خواہ وہ مارشل لاء ہی کیوں نہ ہو۔ جب نتائج آنا شروع ہوتے ہیں تو ہمیں آئے وال کا بھاء معلوم ہونے لگتا ہے تو پھر ہم دوسری تبدیلی کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔“

یوں تو اس پوری کتاب ہی میں جابجا ایسے کلمے کھڑے ہوئے ہیں جہاں کمال رضوی کے قلم سے بلا کا طرز و مزاج نکلا ہے مگر شاعر علی سے متعلق یادوں میں ایک کرٹل صاحب کی کتیا اور شاہ علی کے کتے کے ملاپ کے سلسلے میں جو واقعہ درج ہے اسے پڑھ کر آپ اپنی بے ساختہ مسکراہٹ پر قابو نہ رکھ سکیں گے۔ مذکورہ تحریر اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ اس میں رفیع خاور کا تذکرہ بھی ہے اور اس عورت کا بھی جس کی وجہ سے رفیع خاور کو اپنی جان اپنے ہی ہاتھوں سے کٹی پڑی تھی۔

”کمال کی باتیں“ میں قید مکرر کے طور پر کمال رضوی صاحب کا ایک عمدہ ترجمہ بھی شامل کیا گیا ہے۔ ترکیف پر لکھا یہ مضمون ادب لطیف میں 1955ء میں شائع ہوا تھا۔

اٹلانٹس جوبلی کیلنڈر کے جناب فاروق احمد اس تمام عرصے میں راقم کے ساتھ رہے اور ہر طرح کی باتوں سے نوازتے رہے۔ وہ ایک کتاب دوست شخص ہیں ان کی دلچسپی ہمیشہ کی طرح اس کتاب میں ابتدا تا انتہا رہی۔ مجھے کہنے دیجئے کہ فاروق احمد کا...

سیارہ ڈائجسٹ
ایک اور عظیم الشان، ایمان افروز اور فخریہ پیشکش

فرمان الہی نمبر

جی 2016ء میں شائع ہوگا

قرآن کے اہم موضوعات

- ★ وہ قرآنی احکام جن کا جاننا ایمان، اعتقاد و اعمال درست رکھنے کیلئے انتہائی ضروری ہے۔
- ★ اس نمبر کا مقصد پیغام الہی تک ایک آسان راستہ فراہم کرنا ہے اپنی مرضی کا عنوان فہرست میں دیکھیں اور قرآن کی تمام متعلقہ آیتوں پر غور کر لیں۔
- ★ اس نمبر میں کلام الہی عربی متن اور اردو میں انتہائی آسان عام فہم اور دلکش بیروائے میں پیش کیا گیا ہے۔
- ★ اللہ تعالیٰ کی رضا کے مطابق زندگی بسر کرنے کیلئے اس نمبر کا مطالعہ ہر ایک کے لئے ضروری ہے۔

پایہ پھیل کر نہ پہنچ پاتا۔ اٹھائیس پہلی کیشنر نے حالیہ برسوں میں چند انتہائی اہم ادبی کتابیں شائع کی ہیں اور ایک معتبر ادارے کی حیثیت سے سامنے آیا ہے۔

یہ کمال احمد رضوی المعروف اُن آخر ہے کون؟ اس سوال کا جواب تو دینا جانتی ہے لیکن وہ خود اپنے بارے میں کیا کہتے ہیں اور خود کو کیا سمجھتے ہیں اس سوال کا جواب ہمیں الگوتھڈر آسٹروفسکی کے ڈرامے THE DAIRY OF A SCOUNDREL کے مرکزی کردار کی زبانی ملتا ہے۔ کمال رضوی نے مذکورہ ڈرامے کا ترجمہ لکھنے کی ڈائری کے عنوان سے کیا تھا۔ وہ کہتے ہیں:

”ایک کردار جس نے کبھی میرا پیچھا نہیں چھوڑا وہ آسٹروفسکی کے ڈرامے کا کردار تھا۔۔۔۔۔ لنگہ۔۔۔۔۔ اس کی آنکھوں میں مجھے کئی بار اپنا عکس بھی نظر آیا۔ اس کے لبوں کی مسکراہٹ اتنی خوفناک تھی کہ میں بھی ہلکی گھونکی مسکراہٹ تھی کہ زیادہ دیر تک اس پر لگا ہوں نہیں ٹھہر سکتی تھیں۔ لوگوں نے اس سے نفرت کی تھی اس پر قہقہہ کیا اسے اپنے دروازے سے دھککا دیا تھا۔ کسی زبان پر اس کے لئے ہمدردی کا ایک لفظ تک نہ تھا شاید یہی بات تھی کہ جس نے مجھے اس کا گرویدہ بنالیا تھا۔“

اُن کو بھلا تا بہت مشکل ہے جو ہمارے پاکستان ٹیلی ویژن کے پسندیدہ کرداروں میں سے ایک ہے۔ ایک لامبا، دلا کردار جس کے چہرے پر ہمہ وقت ایک مکارانہ مسکراہٹ کھینچی رہتی ہے اور جس کا چارہ نت نئے حربوں سے لبریز رہتا ہے لیکن افسوس کہ اس کا موٹا اور بے عقل لیکن معصوم و صاف گوسامی ننھا اپنی صاف گوئی کی بنا پر اُن کے تمام حربوں کی بھائی تمام سیکسوں کو تاراج کر دیتا ہے۔ لیکن دلچسپ بات تو یہ ہے کہ اس مکار شخص اُن کی تمام تر چالاکیوں کے باوجود بھی اس کے دیکھنے والوں کے دل میں اس کی مختلف نفرت کا جذبہ کسی صورت بیدار نہیں ہوتا! لیکن ذرا ٹھہریے! معاشرے کے نامور رویوں کی نشاندہی کرنے والا اور مالی فائدے کی خاطر عوام کو دھوکا دینے والے خود غرض طبقے کو بے نقاب کرنے والا الف نون درحقیقت کیا محض ایک ہنسا ہنسا کر پینٹ میں مل ڈال دینے والا ڈرامہ ہے؟ آغا ناصر کی رائے اس سے مختلف ہے۔ ”میں آغا ناصر ساکن اسلام آباد کہ الف نون کا پہلا پروڈیوسر ہوں اور اس کی تخلیق اور تہذیب میں میں بھی تھوڑا سا حصہ دار ہوں بقایا ہوش و حواس حلیفہ بیان دینے کو تیار ہوں کو الف نون مزاحیہ خاکوں کا نہیں، المیہ ڈراموں کا ایک سلسلہ ہے۔“

میں ایک صبح کمال احمد رضوی کے سامنے بیٹھا تھا جو عرف عام میں اُن کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ ایک بڑے مصنف، مجھے ہوئے ہدایتکار اور ایک لاجواب فنکار۔ وہ بلاشبہ ایک اعلیٰ درجے کا پاکستانی تھیٹر اور وی ڈرامے کی تاریخ بلاشبہ کمال صاحب کے ذکر کے بغیر ادھوری رہے گی۔ اپنے تخلیق کردہ ”نون“ کے بغیر زندگی کے بچا پر اب الف تھا ہے۔ یہ تحریر پر قلم کرنے والے کے ذہن میں اداس عمری کی کئی باتیں دھندلا گئی ہیں لیکن 1986ء میں ننھے کی موت پر پاکستان ٹیلی ویژن پر کمال

رضوی کا آنسوؤں سے بھیگا چہرہ روز اول کی طرح روشن ہے جب وہ بھرائی ہوئی آواز میں کہہ رہے تھے کہ اب میں تنہا ہوں بہت سارے پلان میرے ذہن میں تھے میں نے اس کے ساتھ مل کر بہت کام کرنا تھا جو مجھے معلوم ہے کہ اب میں بھی نہیں کر پاؤں گا۔“

کمال احمد رضوی یکم مئی 1930ء کو بہار ہندوستان کے ایک قصبے ”گمیا“ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سید عبدالرشید پولیس ڈیپارٹمنٹ میں تھے۔ انہوں نے تین شادیاں کی تھیں اور کمال رضوی اپنی والدہ کی اکلونی اولاد ہیں۔ ان کے دو سوتیلے بھائی اور تین بہنیں ہیں۔ ایک بھائی سید محفوظ عالم کا انتقال ہو چکا ہے جبکہ ایک بھائی اور تین بہنیں ہندوستان میں مقیم ہیں۔ کمال صاحب سن 1951ء میں پہلے کراچی اور پھر جلد ہی لاہور چلے آئے۔ کچھ عرصے ریڈیو پر کام کیا۔ ”شع“ آئینہ اور تہذیب نامی رسالوں کی ادارت بھی کرتے رہے۔ دوستو فسکی، الگوتھڈر آسٹروفسکی، ماس ہارٹ اور جارج ایس کاف مین، ڈور شیر اور میری چیز کے ڈراموں کے معیاری تراجم ان کا ایک اہم کارنامہ ہے۔

ادب الاطفال کے لئے کمال رضوی کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ وہ خود کہتے تھے کہ بچوں کے لئے ان کے لکھے ناولز کی تعداد 200 کے قریب ہے۔

سن 1958ء میں تھیٹر کا کیریئر شروع کیا۔ ان کا مشہور ڈرامہ بالاک بد ذات 1960ء میں تھیٹر پر پیش کیا گیا۔ مذکورہ ڈرامے کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ یہ جنوری سن 2005ء میں لاہور ڈراما فیسٹیول میں دوبارہ پیش کیا گیا اور اس بار بھی کمال احمد رضوی اس ڈرامے میں اپنی اداکاری کے عروج پر نظر آئے۔ بالاک بد ذات کے علاوہ ان کے مشہور ڈراموں میں پی ٹی وی پر قسط وار پیش کئے جانے والے ڈرامے..... چور چھائے شور اور میرا اہم میرا دوست بھی شامل ہیں۔ ایسے ڈراموں کی تعداد تیس کے لگ بھگ ہے جنہیں یا تو کمال صاحب نے لکھا یا ان میں اداکاری کی یا پھر ان ڈراموں کی ہدایت کاری کی۔ ان کے اپنے الفاظ میں: ”میں نے زندہ رہنے کے لئے بڑی جدوجہد کی ڈرامے لکھے امروز میں کالم نگاری کی، انگریزی کتب کے تراجم کئے (ان میں ذیل کارنگی کی کتابیں نمایاں ہیں) ادب لطیف میں افسانے لکھے..... یہ بتاتے ہوئے ان کے لکھے میں ماضی کی یادوں کی کئی جیسے گھل سی گئی تھی۔ کمال احمد رضوی نے سن 1965ء میں نوزائیدہ لاہور ٹیلی ویژن سے الف نون کا آغاز کیا۔ وہ خود کو ملنے والے پرائیڈ آف پرفارمنس کو طوق عداوت کہتے ہیں۔

کمال احمد رضوی کے والد اور ان کے دیگر اہل خانہ پاکستان منتقل نہیں ہوئے۔ ان کے والد کا انتقال 1955ء میں ”گمیا“ میں ہوا۔ اس موقع پر کمال رضوی لاہور سے ”گمیا“ تشریف لے گئے تھے۔

الف نون وہ واحد ڈرامائی سیریز ہے جو سن 1965ء سے سن 1982ء تک مختلف وقفوں میں علیحدہ علیحدہ مارچر تشریف ہوئی۔ بالکل شروع میں جب براہ راست پروگرام نشر ہوا کرتے تھے تو یہ سیریز بغیر پیشگی ریکارڈنگ کے آٹھ ماہ تک نشر ہوئی۔ دوسری مرتبہ الف نون سن 1967ء سے سن 1968ء تک

سیارہ ڈائجسٹ / اپریل ۲۰۱۶ء

رہوا۔ تین برس بعد یہ سیریز سن 1971ء سے سن 1972ء تک چلی اور پھر چوتھی مرتبہ سن 1981ء سے سن 1982ء تک نشر کی گئی۔

الف نون پر گفتگو کرتے ہوئے کمال احمد رضوی یوں گویا ہوئے:

”یہ جو آپ (راقم) الف نون لئے لئے پھر رہے ہیں مجھے تو حیرت ہے کہ کیسے آپ کو یہ سودا سایا۔ ایک چیز جو میں نے دیکھی ہے کہ الف نون جو ہے وہ مرتے مرتے نہیں مرا یہ زندہ ہی رہا ہے!“
جواب میں نے عرض کیا کہ ”حضور! ہنسی ہنسی میں کسی کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دینا تو کوئی آپ سے سیکھے..... الف نون کے یہ تمام عجیبے دراصل ادب پارے ہیں۔ یہ وہ زندہ ڈرامے ہیں جو ہمیشہ زندہ رہیں گے کہ آپ دیکھ لیں کہ 28 برس قبل کا آپ کا لکھا ہوا ”ذخیرہ اندوزی میں“ چینی کے حالیہ بحران میں تنکینے کی طرح فٹ ہوتا ہے۔ زندگی کے تاریک اور آداس لمحوں میں الف نون سے مجھ جیسے ان گنت لوگوں کو سرشاری و خوشی نصیب ہوئی۔ لاہور کے اس معذور بچے کا واقعہ ہم کیسے بھول سکتے ہیں جس نے آپ سے اور رفیع خاور سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تھی اور پھر ایک روز آپ دونوں اس معذور بچے سے ملنے گئے تھے۔ بقول راوی وہ آپ دونوں کو قریب پا کر خوشی سے پھولا نہ سارہا تھا قوت گویائی سے محروم وہ بچہ آپ کی طرف بار بار ہاتھ بڑھا کر اپنی مسرت کا اظہار کرتا تھا ادھر آپ کے اور رفیع خاور کے چہروں پر تو مسکراہٹ تھی لیکن آنکھوں سے آنسو مستقل رواں تھے۔ جو بانی عقل و دانش کے پیکروں کی زبانوں سے رات دن ادا ہوتی رہتی ہیں اور عوام کی سمجھ میں بھی نہیں آتیں وہ آپ کے قلم اور زبان سے ادا ہو کر ذہنوں پر نقش ہو جاتی ہیں۔ یقین نہ آئے تو مجھ سے الف نون کے مشہور ڈراموں کے ڈائلاگ سن لیجئے۔

کمال صاحب! آپ کا فن آپ کا فقرہ ہے۔“

یہ سن کر کمال احمد رضوی کے چہرے پر ایک جھلک کو موہوم سی مسکراہٹ نظر آئی۔

کمال احمد رضوی ان دنوں الف نون کے بیسیوں کے سکرپٹ پر اپنی کتاب کو شائع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ افسوس کہ اس عظیم فنکار کو ایک بڑے ناشر نے کتاب مذکورہ کی اشاعت کے سلسلے میں قلیل رقم کی پیشکش کی۔ ہم ایک اکیاسی برس کے آدمی کو جس نے اپنے لازوال فن کے ذریعے ہمیں بے پایاں مسرت سے ہمکنار کیا، ایک کتاب کا معقول معاوضہ بھی نہیں دے سکتے۔

جب میں کمال صاحب کو کسی شکلیہ خانم کو تحفہ دی ہوئی کنور مہندر سنگھ بیدی حری دخیلا شدہ خود نوشت ”یادوں کا جشن“ کے بارے میں بتا رہا تھا کہ کیسے مجھے وہ پرانی کتب کے ٹھکانے سے اتفاق مل گئی اور کیا کیا خزانے وہاں فروخت کے لئے آتے ہیں تو انہوں نے مجھے الف نون کے ایک ایسے پروگرام کے بارے میں بتایا جس کا ذکر میں نے پہلے کبھی نہ سنا تھا۔ اس ڈرامے کا عنوان ”کتب فروشی میں“ تھا۔ کمال صاحب کی باتوں سے محسوس ہوا کہ مذکورہ ڈرامہ ایک انتہائی دلچسپ ڈرامہ تھا۔ وہ مجھے

وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ

(اور ہم نے آپ کا ذکر (سب پر) بلند کر دیا۔ القرآن)

کی ٹھہر سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں

یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

پیغمبر آخر الزماں کی سیرت پاک سیارہ ڈائجسٹ کی طرف ایک لاثانی پیشکش

قیمت 275 روپے

عکس سیرت

”میں نے جب یہ کتاب ختم کی تو اونچی آواز میں جسے میں بھی صاف سن سکوں ایک بار پھر کلمہ پڑھا۔ گویا اپنے آپ سے اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کیا۔“ (عبدالقادر حسن، مشہور صحافی)

یہ ایمان افروز کتاب خود بھی پڑھیے اور اپنے دوستوں کو بھی پڑھائیے

سیارہ ڈائجسٹ - 240 مین مارکیٹ ریواڑ گارڈن لاہور

فون: 37245412

بتانے لگے کہ اس میں ایک گاہک کو جارج برنارڈشا کی کتاب یہ کہہ کر بیچ دیتا ہے کہ یہ کتاب برنارڈشا نے سمرسٹ ماہم کو تحفہ پیش کی تھی اور اس پر لکھا تھا، سمرسٹ ماہم کے لئے جی بی شا کی طرف سے، الہن اسی کتاب کی پانچ کاپیاں، آگین گفڈنو سمرسٹ فرام جی بی شا، لکھ کر فروخت کر دیتا ہے۔ اسی طرح وہ ایک گاہک کو چند جعلی نسخے فروخت کرتا ہے اور گاہک کے یہ پوچھنے پر کہ کیا غالب کا کوئی قلمی نسخہ ہے، ننھا جوابا کہتا ہے کہ آپ پرسوں صبح آ جائیں۔ گاہک سوال کرتا ہے کہ کل نہیں تو ننھا جواب میں کہتا ہے کہ کل رات تو یہ ان بیٹھ کر وہ قلمی نسخہ لکھے گا۔

اس سوال پر کہ کیا آپ کو الف نون لکھتے وقت سازگار فضا میسر آتی تھی، کمال صاحب گویا ہوئے: ”میرے خانگی حالات بڑے ابتر اور خراب ہو چکے تھے، مجھے بہت دھچکے لگے تھے، پھر میں نے سوچا کہ کیا کرنا چاہئے۔ میں بیکار تھا، اس زمانے میں اور پیسے بھی نہیں تھے تو میں نے پی پی وی کے آغا ناصر سے کہا کہ میں الف نون دوبارہ شروع کرنا چاہتا ہوں۔ آغا ناصر نے کہا کہ تم آؤ اور کرلو تو پھر میں نے الف نون شروع کیا تو میں یہی کہتا ہوں کہ یہ قدرت کی طرف سے میرے لئے جذباتی سہارا بھی تھا کیونکہ جب لوگ الف نون دیکھتے تھے تو وہ واہ واہ کرتے تھے۔ قدرت نے مجھے اس سے ایک سکون اور ڈھارس فراہم کی۔ وہ خوشی مجھے اب تک محسوس ہوتی ہے اور پھر اس کے پیسے بھی ملنے لگے۔ کراچی آ کر اسے پیش کیا تو اس زمانے میں نکلون کی فروخت سے مجھے 72 ہزار روپے ملے تھے جس سے میں نے زمین خریدی اور بعد میں اس پر مکان بنوایا۔ الف نون لکھنے کا مجھے قدرت نے موقع فراہم کیا ورنہ ہوسکتا تھا کہ میں ان دنوں خودکشی کر لیتا۔ ایسے مرحلے آتے ہیں انسان کی زندگی میں اور یہ کوئی بڑی بات بھی نہیں ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ ایسا کیا ہو گیا تھا کہ فلاں نے خودکشی کر لی۔ زندگی تو بڑی قیمتی چیز ہے لیکن یہ تو وہ جانتا ہے جو اس کو آکسس سے نزلتا ہے۔ میں یہ کہتا ہوں کہ قدرت نے مجھ سے کام لیا اور یہ چیزیں (الف نون) آفا فانا ہو گئیں۔ یہ میرا تجزیہ ہے اپنے بارے میں اور اپنے کام کے بارے میں!“

پی پی وی پر آپ کی آمد کیسے ہوئی؟ اس سوال کے جواب میں کمال رضوی نے بتایا:

”ان دنوں میرا ایک سٹیج ڈرامہ چل رہا تھا جس کا نام خوابوں کے مسافر تھا۔ پی پی وی کے ڈائریکٹر اسلم اعظمیہ ڈرامہ دیکھنے آئے۔ وہ پی پی وی کا ابتدائی زمانہ تھا اور انہیں کارکنوں کی ضرورت تھی۔ میرا کام دیکھ کر وہ مجھ سے پی پی وی کے لئے لکھنے پر اصرار کرتے رہے اور یوں الف نون کا آغاز ہوا۔ آپ اردو ادب کی کئی نامور شخصیات کے قریب رہے ہاتھوں سعادت حسن منٹو سے بہت متاثر رہے۔ کچھ اس بارے میں بتائیے۔

منٹو کے ذکر پر کمال رضوی کی آنکھوں میں ایک چمک سی لہرائی اور وہ یوں گویا ہوئے:

”ابتدا میں تو میں منٹو کو دور دور ہی سے دیکھا کرتا تھا، قریب جانے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ لاہور کے مرحوم باک پی ہاؤس میں شاعروں اور ادیبوں کی باقاعدہ محفل ہوا کرتی تھی۔ مولانا غلام رسول مہر سے لے کر فیض احمد فیض تک کئی اہل قلم وہاں آیا کرتے تھے۔ میں اپنے کچھ دوستوں کے ہمراہ پاک پی ہاؤس کے سامنے ان بڑے لوگوں کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے جایا کرتا تھا۔ میں ان سے کبھی نہ مل پاتا اگر شاد امرتسری میری مدد نہ کرتے، وہ مجھے منٹو کے پاس لے کر گئے لیکن پہلے وہ ایک شرط بھی عائد کر چکے تھے۔ ہم ان کے گھر کی طرف جا رہے تھے۔ ہم ان کے گھر پہنچے، مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہے کہ شاد امرتسری نے منٹو سے میرا تعارف کرایا اور کہا کہ یہ کمال احمد رضوی ہیں اور انہیں ڈرامے لکھنے کا شوق ہے، ریڈیو کے لئے لکھتے ہیں۔ منٹو نے میری طرف دیکھ کر کہا تمہارا کوئی ڈرامہ نشر بھی ہوا ہے؟ میں نے کہا ابھی تک تو نہیں ہوا۔ منٹو نے جواب دیا بھئی لکھنے کا کیا فائدہ جب ڈرامہ نشر ہی نہیں ہوا۔ اس ملاقات کے بعد سعادت حسن منٹو سے اکثر ملاقاتیں ہونے لگیں۔“

میں نے سوال کیا: اسی زمانے میں آپ کی ملاقات مصور انور جلال حمرا سے بھی ہوئی تھی جن پر آپ نے حال ہی میں ایک خاکہ بھی تحریر کیا ہے؟

”جی ہاں“ کمال صاحب اپنے بھاری لہجے میں بولے۔ ”وہ پہلی ملاقات میں مجھ سے متاثر ہوا ہوا نہیں لیکن میرے سوٹ سے بہت متاثر ہوا تھا جو میں بل ادا کے بغیر کراچی کے ایک ٹیلر سے لے کر فرار ہوا تھا۔ اس سوٹ سے ایک اور شخص جو بہت متاثر ہوا وہ اے حمید تھا۔ سوٹ پر اس کی نگاہیں رکتی ہی نہیں تھیں۔ یہ سن چپاس کا ابتدائی زمانہ تھا۔ انور حمرا نے زندگی میں بڑی جدوجہد کی، ایک زمانے میں اس نے ہفتہ وار سالہ احساس بھی نکالا۔ اسے لندن جا کر مصوری کی تعلیم حاصل کرنے کا بہت شوق تھا۔ بالآخر وہ ایک روز اپنے والد کی کوششوں کے نتیجے میں لندن چلا گیا۔ درمیان میں وہ ایک بار لوٹ کر لاہور بھی آیا یہاں مستقل سکونت اختیار کرنے کے ارادے سے، لیکن یہاں اس کی قدر نہ ہوئی اور وہ کراچی چلا گیا۔ کراچی میں کچھ عرصہ قیام کے بعد اس نے دوبارہ لندن کی راہ لی۔ 1973ء میں جب میں لندن گیا تو اس سے ملاقاتیں رہیں۔“

میں نے سوال کیا: آپ کے بارے میں لوگ جس بات کی تفصیل سب سے زیادہ جانتا چاہتے ہیں وہ رفیع خاور یعنی ننھے کی آپ سے پہلی ملاقات اور پھر ان کی افسوسناک خودکشی کا معاملہ ہے اس واقعے کے کئی محرکات تھے؟

کمال صاحب نے جواب دیا:

”ننھا میرے پاس پہلی مرتبہ کسی کے توسط سے آیا تھا، اسے اداکاری کا بہت شوق تھا، میرے دریافت کرنے پر اس نے رقت آمیز لہجے میں مجھے بتایا کہ پی پی وی والے اسے سچے مرتبہ مسترد کر چکے ہیں۔ جواب میں میں نے کہا کہ جاکر کوئی اور کام کرو اداکاری تمہارے بس کی بات نہیں۔ میری یہ بات

سن کر وہ رو پڑا اور ادھر میرا دل پہنچ گیا، میں نے اسے اپنے ڈرائے میں ایک کردار دے دیا۔ مجھے یاد ہے کہ پہلی شوٹنگ میں وہ میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ میرا دل گھبرا رہا ہے میرے سر پر ہاتھ رکھ دو۔ میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ بس اس کے بعد اداکاری کے میدان میں اسے ایسی کامیابی ملی کہ سب لوگ حیران رہ گئے۔ ننھے کی خودکشی کا مجھے بے حد افسوس ہوا تھا۔ دراصل وہ ایک گانے والی تھی۔ اس کا نام نازلی تھا۔ ننھا اس کے چکر میں پڑ گیا تھا۔ وہ ایک نہایت فضول عورت تھی۔ میں نے ننھے کو بہت سمجھایا کہ جس راستے پر تم چل رہے ہو اس کا انجام سوائے خودکشی کے اور کچھ نہیں۔ وہ برابر اپنی کمائی اس عورت پر لٹاتا رہا اور وہ اسے دھوکہ دیتی رہی۔ آخر میں اس عورت نے ننھے سے اس کا مکان بھی مانگ لیا اس مکان میں ننھے کے بیوی بچے رہ رہے تھے۔ وہ اس پر بھی راضی ہو گیا تھا لیکن اس کی بیوی اڑ گئی۔ ننھا پریشانی میں اس عورت کے پاس گیا۔ اس عورت نے جب یہ دیکھا تو ننھے سے نظریں پھیر لیں۔ اس کی بے اتفاقی ننھے کے لئے سم قاتل ثابت ہوئی اور بالآخر اس نے اسی پریشانی کے عالم میں اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا۔

کمال احمد رضوی کی خانگی زندگی بھی الجھنوں کا شکار رہی۔ شادی کے دو تجربے ناکام ہونے کے بعد 1984ء میں انہوں نے عشرت جہاں صاحبہ سے تیسری شادی کی۔ خوش قسمتی سے عشرت جہاں ایک نہایت معاملہ فہم خاتون ثابت ہوئیں۔ وہ ہر طرح سے کمال رضوی کا خیال رکھتی ہیں۔ کمال صاحب پابندی سے شام کی میر کو جاتے ہیں اور ایک پرسکون زندگی گزار رہے ہیں لوگ آج بھی ان سے محبت کرتے ہیں، کہیں چلے جائیں تو عقیدت سے ملتے ہیں راتم ایسے کی موقعوں کا گواہ ہے!

آئیے دیکھتے ہیں کہ چند نامی گرامی اہل قلم الف نون اور کمال احمد رضوی کے بارے میں کیا کہتے ہیں:

حمایت علی شاعر: ”کمال رضوی کا نون اپنی قوم کا آئینہ دار ہے اور الف اس قوم کی باگ دوڑ تھا ہے ہوئے چالاک اور خود غرض طبقے کا۔“

منیر نیازی: ”کمال احمد رضوی چاقو سے گدگدی کرتا ہے۔“

شفیق الرحمان: ”الف اور نون کو پہلی مرتبہ دیکھ کر مقوی الصحت دواؤں کے اشتہار یاد آتے ہیں جن پر استعمال سے پہلے اور استعمال کے بعد کی تصاویر نمایاں ہوتی ہیں۔“

پردین شاہ: ”الف نون ہماری نگہن سے بھرپور زندگیوں میں بارش کے جھونکے کی طرح داخل ہوا اور یہاں سے وہاں تک تمام در پتھوں پر دستک دیتا چلا گیا۔“

انتظار حسین: ”مرزا سودا کی تجویات کی طرح الف نون بھی قوم کے اخلاقی زوال کا ایک مرثیہ ہے۔“

الف نون کے الہ کے بارے میں کسی نے کہا تھا کہ وہ سکرین پر بھی اتنے ہی کہنے دکھائی دے

رہے ہیں کہ نقل پر اصل کا گمان ہوتا ہے۔ الف نون میں ننھا ایک جملہ کثرت سے دہراتا ہے کہ ان تم بہت کہتے ہو..... یاد رہے کہ الف نون کا سکرپٹ خود کمال احمد رضوی کا لکھا ہوا ہے۔ کمال احمد رضوی کے قلم کی کاٹ اور اس کی بے باکی کی مثال نہیں ملتی۔ فقرہ اس طرح سے ادا کیا جاتا تھا کہ دنیا کے کسی سنر بورڈ کی گرفت میں اس کا آنا نامکن تھا۔

ان اپنے ایک سیٹھ کردار کو الیکشن میں کھڑا ہونے کی ترغیب دیتا ہے۔ سیٹھ استفسار کرتا ہے کہ کیا قوم مجھے ووٹ دے گی؟..... ان کہتا ہے کہ کیوں نہیں سیٹھ صاحب! آپ نے تو پچیس سال اس قوم کی (لمبا وقتہ)..... خدمت کی ہے۔“

ایک اور ڈرائے میں ننھا نہایت خلوص سے کسی انگریز سے گالیاں سکھ کر آتا ہے اور ان کے سامنے بنان کا مطلب جانے نہایت وثوق سے وہ سب دہراتا ہے۔ وہ ان کو ایڈیٹ کہتا ہے اور ان کے ناراض ہونے پر کہتا ہے کہ تو تو اس طرح ناراض ہو رہا ہے جیسے میں نے تجھے کوئی گانی دی ہو پھر وہ کسی بات پر ان کو جھڑک کر زور سے چلاتا ہے:

”ادشٹ اپ! یو در فارور۔“
ان معنی خیز انداز میں آنکھیں گھما کر کہتا ہے: ”کیا..... کیا کہا! در فارور؟ یہ کہا اس نے تجھے۔“
اور جواباً ننھا ان کو سمجھانے والے انداز میں کہتا ہے: ”ان تجھے نہیں پتا! در فارور کا مطلب ہوتا ہے بائی باپ!“

الف نون کے ایک لافانی ڈرائے ”آرٹ گیلری میں“ کے چند منتخب حصے ملاحظہ ہوں:

ننھا: ”دیکھ ان! بہتر گھنٹے سائیکل چلا کر میرا حال ہو گیا ہے۔“

ان: ”تو پکا آرٹسٹ بھی تو بن گیا ہے تو۔“

ایک اور منظر میں ننھے کی صاف گوئی کی وجہ سے اس نسر کے بھاگ جانے پر:

ننھا: اب ناراض نہ ہو تو..... تو نے بھی تو مجھے وہ کام لگا دیا ہے جو میرے باپ دادا نے بھی کبھی نہیں کیا۔

ان (جھنجھلا کر): ”تو جو کر رہا ہے ان کے باپ دادا نے کیا تھا کبھی؟“

ایک اور منظر میں:

ان: اب اس تصویر پر دستخط کر دے۔“

ننھا: ”تو کر دے مجھے تو دستخط کرنا نہیں آتا میں انگوٹھا لگا دیتا ہوں۔“

ان (دانت پیس کر): ”انگوٹھا میں تیرے گلے پر لگاؤں گا۔“

ایک اور منظر میں سانس خاتون کی موجودگی میں:

ننھا (کمرے میں داخل ہو کر زور سے چلا کر): اب آتم یہاں پڑ ذلیل آدمی کہتے نہ ہو۔

چکا ہوں اور کوئی حجاب اور پردہ حائل نہیں تھا۔
 اسی طرح میری طرح کا ایک اور جوان جو فیض صاحب کا شیدائی تھا اور ان سے اسی طرح منہ
 اٹھا کر ان کے اخبار کے دفتر جا پہنچا اور اس کے بارے میں چند دنوں میں اخبار میں خبر آئی کہ وہ
 افسس ہوئی کے کمرے میں خودکشی کر بیٹھا۔ اس بنگالی نو جوان سے میری بھی تھوڑی واقفیت رہی
 تھی۔ لیکن فیض صاحب کے دل پر اس کا ایسا شدید اثر ہوا کہ انہوں نے اس ملاقات پر ایک بڑا
 پرسوز مضمون رقم کیا۔ یہ مضمون انگریزی زبان میں لکھا گیا تھا اور بجائے پاکستان ٹائمز کے، سول اینڈ
 ملٹری گزٹ میں شائع ہوا تھا۔ جس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ فیض صاحب پاکستان ٹائمز سے
 علیحدہ ہو چکے تھے اور یہ خودکشی کا واقعہ اس کے بعد رونما ہوا۔ یہاں اس کا ذکر شاید میں فیض صاحب
 کے حوالے سے یوں کر رہا ہوں کہ ان کی شخصیت کے اس گوشے کو آلت کر دیکھوں جو عام طور پر ظاہر
 نہیں ہوتا۔ یہ دردمصر ان کی شاعری سے عمارت نہیں تھی بلکہ عام لوگوں کے لئے بھی وہ اپنے دل
 میں محسوس کرتے تھے۔

مجھے فیض صاحب کو بہت قریب سے دیکھنے اور جاننے کا موقع ملا۔ خاص طور پر جب آرٹس کونسل
 میں ان کا تقرر ہوا اور انہوں نے آتے ہی منٹو کی یاد میں ایک تقریب کا اہتمام کیا اس موقع پر منو صاحب
 کا افسانہ پڑھتی کھیل "بادشاہت کا خاتمہ" آرٹس کونسل کے بیچ پرظہور پذیر ہوا۔ اس کھیل نے سچ عجیب
 تھیٹر سے وہ رشتہ استوار کیا جو تاحال قائم ہے۔ اس شام کھیل کے بعد اس کے جشن کے طور پر فیض
 صاحب نے اپنے گھر میں جو اس زمانہ کے ریڈیو پاکستان کے عین مقابل تھا، رات کے کھانے کا اہتمام
 کیا۔ فیض صاحب کے بہت چاہنے والے عبدالقیوم صاحب جو پنجاب کے سیکرٹری انفارمیشن تھے اور ان
 کی بیگم سکندرہ بھی موجود تھے۔ ہوٹل کا بندوبست قیوم صاحب نے ہی کیا تھا جو بعد میں ہمارے قیوم
 النکل بن گئے۔ اس شام پہلی بار میں نے روسی CAVIAR کا ذائقہ چکھا جو اس فیض نے ڈرنک کے
 ساتھ پیش کیا تھا۔

اس شاندار ابتداء کے ساتھ میں نے لاہور میں اپنے تھیٹر میل کیمریز کا آغاز کیا اور پھر پلٹ کر نہیں
 دیکھا۔ اس راہ کی رسوائیاں، مشکلات اور آزار اپنی جگہ، لیکن اس کے لئے جس پایہ استقامت کی
 ضرورت ہوتی ہے وہ کہیں سے کمزور نہ ہوئی۔

اب تو آرٹس کونسل ہی میرا رات دن کا اوڑھنا بچھونا تھا اور منزل کا اگرچہ کہیں دُور دُور تک پتہ نہیں
 تھا لیکن پاؤں گردش سے کبھی چور نہیں ہوئے۔

چونکہ فیض صاحب سے یہاں بہت قربت کا موقع ملا۔ ان کے اوقات بھی بڑے نپے تلے ہوتے
 تھے۔ صبح نو بجے وہ دفتر تشریف لے آتے پھر ایک بجے گھر چلے جاتے اور پھر کہیں شام 5 بجے وارد
 ہوتے۔ کچھ دیر لان میں بیٹھ جاتے، ہمارا حال احوال پوچھتے اور پھر جا کر اپنے دفتر بیٹھ جاتے۔

المن: کیا ہوا بھئی، کیا ہوا۔
 تنہا: المن میں چائے والے کے پاس گیا، میں نے اس سے کہا کہ چائے بھجوادو ہمارے گھر، عورت
 آئی ہوئی ہے لیکن اس نے انکار کر دیا۔
 المن: بھئی تم ایسے ذلیل لوگوں کے منہ کیوں لگتے ہو، تم ایک آرٹسٹ ہو۔
 تنہا: میں نے بھی اس سے یہی کہا تھا کہ اب ہم آرٹسٹ ہو گئے ہیں لیکن وہ کہنے لگا کہ بہت جلد تم
 اندر بھی ہو جاؤ گے اس لئے کہ تم فراڈ ہو۔
 المن: بھئی یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اس سے پہلے لوگوں نے یہی بات ریمبر ان سے بھی کہی ہے
 پکاسو اور وان گو سے بھی کہی ہے۔

تنہا (حیرت سے): تو کیا ان لوگوں کی بھی چائے والوں سے نہیں بنتی تھی؟
 ایک اور منظر میں اسپائرس خاتون کی موجودگی میں:

خاتون (شمینہ احمد وارثی کے لہجے میں): آپ نے پہلی پینٹنگ کب بنائی تھی؟
 تنہا: جی، پرسوں رات ساڑھے آٹھ بجے، خیر نامے سے کچھ پہلے۔

خاتون (انہجائی حیرت سے پوچھتی ہے): جی.....

تنہا: ہاں جی..... آپ کو نہیں پتا، یہ ان بڑا استاد آدمی ہے اس کو اچانک یہ خیال آیا کہ یہ آرٹسٹ
 لوگ بڑا پیسہ کمارے ہیں تو کیوں نہ یہ دھندا شروع کیا جائے۔ بس پھر کیا تھا، اس نے ایک ٹرک کے
 پیچھے سے ایک تریاں چھٹی، اس کے ٹوٹے کرائے اور ایک رنگ والی مائی سے جا کر یہ برش اور یہ ہالٹی
 لے آیا۔

کسی نے سچ ہی تو کہا تھا کہ ایک زمانہ تھا جب ٹیلی ویژن پر الف نون محض پروگرام نہیں، ایک واقعہ
 ہوتا تھا۔

فیض صاحب

(تحریر: کمال احمد رضوی)

فیض صاحب سے پہلی بار ملنے کا شرف اس وقت حاصل ہوا جب وہ روزنامہ پاکستان ٹائمز اور
 امر دے کے مدیر ہوتے تھے۔ بڑے لوگوں سے ملنے کا خط چھوٹے لوگوں کے دلوں میں پنہاں ہوتا ہے
 اور فیض صاحب تو پاکستان بھر کے سب سے بڑے شاعر اور آدمی تھے۔ ان سے ملنے کا خط کیوں رنگ
 نہ لاتا۔ جب میں پاکستان ٹائمز کے دفتر میں داخل ہوا تو پہلی منزل پر ایک کمرے کے باہر فیض صاحب
 کے نام کی تختی دیکھی اور دل تیزی سے دھڑکنے شروع ہو گیا پتہ نہیں ان کو ملنے سے زیادہ دیکھنے کا جذبہ
 کارفرما تھا۔

لیکن جب وہ ملے تو وہ ساری ہیبت منٹوں سیکنڈوں میں کافور ہو گئی اور یوں لگا جیسے ان سے کئی بار مل

یہ لان بہت ہی پر رونق ہوا کرتا تھا۔ یہاں پر شاکر صاحب نے کل چھن کا چھوٹا سا پودا لگا دیا تھا جو بڑا ہو کر چھتری کی شکل اختیار کر گیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک کینٹین تھی جہاں سو سے کباب وغیرہ دستیاب ہوتے تھے۔ اس کا ٹھیکیدار ایک شخص معین ہوتا تھا جو فنکاروں کی زبوں حالی سے متاثر ہو کر انہیں ادھر دے دیتا تھا۔ لان میں ہمہ وقت جمید وائیں اور رشید عمر تھاؤ کی اپنی لوڈو کی بساط بچھا کر ہلکے پھلکے جوئے سے لطف اندوز ہوتے رہتے۔ باقی کے فنکار اپنی کرسیوں پر جو درختوں کی جٹاؤں کو کاٹ کر بنائی گئی تھیں اور اسی ساخت کی میزیں بھی ہوتی تھیں اس کے ساتھ ہی ایک میک شفٹ قسم کا ہال بھی موجود تھا۔ جس کے دروازے کے ساتھ معین نجی کہیں کسی تانگے والے سے ہتھیل کے دو لپ بھی لے آیا تھا جو عام طور پر فیشن اہل تانگوں کے ساتھ لگے دکھائی دیتے تھے۔

اس ہال میں تصویروں کی نمائش کا بھی اہتمام تھا اور کچھ نامور مصیروں کی تصویریں بھی برائے فروخت لگی ہوئی تھیں۔

حب الحما اپنی پرانی عمارت میں تھا۔ جس کے وسیع برآمدے میں ایک سینڈ پرالمر کی نئی عمارت کا ماڈل رکھا ہوا تھا جو فیض صاحب کو اطالوی معمار نے تحفہ دے دیا تھا۔

یہ پچھلی صدی کے سن سانڈھ کے گرد وواح کا زمانہ تھا۔ میں نے اپنی صحافی زندگی کو خیر یاد کہتے ہوئے تھیز کوکل وقتی مشغلے کے طور پر اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ میں جب اپنا پلاٹ لے کر فیض صاحب کے پاس پہنچا تو ان کو یہ فیصلہ بہت جذباتی سامحوس ہوا۔ کیونکہ تھیز سے پینٹ پالنا کسی کے لیے بات نہیں تھی۔ تھیز صرف شوق پورا کرنے سے زیادہ اور کچھ نہیں تھا۔ مجھ سے پہلے اسماعیلی نے بھی اس قسم کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ ممبئی کے ”اپنا“ (انڈین پنپلز تھیز) سے تازہ تازہ لاہور وارد ہوئے تھے۔

خرائے روکنے والا تکیہ

ماہرین نے ”نورا“ نامی ایک ٹیکہ تیار کیا ہے جو خرائٹوں کو روکنے میں مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔ کینیڈین کمپنی کی جانب سے تیار کیے گئے اس ٹیکے کے اندر ایکٹر ایک نظام نصب ہے جو خرائٹ کی آواز سن کر ٹیکے کو ہٹاتا اور سبکڑتا ہے، اس طرح خرائٹ لینے والے کا سر دوسری پوزیشن میں آجاتا ہے اور خرائٹ کم ہو جاتے ہیں۔ ٹیکے کو پلانک کے قریب رکھا جاتا ہے جو خرائٹ کی آواز سن کر ٹیکے کے اندر پپ کو چلا کر اٹھاتا ہے اور سونے والے کی پوزیشن بدل جاتی ہے جب کہ اس عمل سے حلق کے پھوں کو بھی سکون ملتا ہے اور سانس لینے میں آسانی ہو جاتی ہے۔

لیکن اس وقت بھی تھیز بھل جڑاتی مشغول تھا۔ اس سے چند روز قبل اس نے ایک نئی جہاز کب کرتے تھے۔ کلاہور میں ہمارے دور کے تمام لوگ جو تھیز کا شوق تو بہت رکھتے تھے لیکن انہوں نے اس سے پہلے سے

غائبانہ وجہی کر فیض صاحب میرے اس پلان سے متفق نہیں تھے اور وہ بھی تھیز کو جڑاتی مشغول ہی سمجھتے تھے۔ میں نے جب ان کو اپنا فیصلہ سنایا تو انہوں نے سن کر سڑک کا ایک لمبا کش کھینچا اور اپنی معروف متانت کے ساتھ کہا: ”وہ تو ٹھیک ہے بھی۔ لیکن اول تو سارا وقت تھیز ہو نہیں سکتا اور اگر اکاؤنٹ کھیل ہو بھی گیا تو کھائے گے کہاں سے؟“

میں نے چڑ کر کہا: ”تھیز سے کھاؤں گا یا بھوکا مروں گا۔“

پھر فیض صاحب بڑی مشکل سے اس بات پر آمادہ ہوئے کہ فی الوقت تجرباتی طور پر دو مہینے میں ایک کھیل کا خرچ برداشت کر سکتے ہیں۔

اس کے بعد میں نے پہلا کھیل ”سائے“ سنبھال لیا جو پینک بلیٹس کے کھیل ”گیمس لائن“ سے ماخوذ تھا۔ پانچ روپے کی گٹ پر یہ کھیل بمشکل پندرہ دن چلا۔ آخری رات فیض صاحب کھیل ختم ہونے کے بعد سنبھالنے کے پیچھے تشریف لائے میں سمجھا وہ ہماری کاوش کو سراہنے آئے ہیں لیکن یہ میری خوش فہمی تھی۔ انہوں نے پوچھا:

”کیوں بھی تمہارا شوق پورا ہو گیا؟“

میں نے کہا: ”نہیں ہاں۔“

”تو پھر بند کرو۔ اب حریہ کھانے کا حوصلہ نہیں ہے۔“

میں حقیقتاً فیض صاحب کی سرمدہری سے قطعاً بدل نہیں ہوا۔ پھر میں نے دوسرا کھیل سرت مایم کے SCARED FLAME سے اخذ کیا اور ”شیشوں کا مسیحا“ کے نام سے تحریر کیا۔ معاملہ سے کے مطابق الحما میں یہ دوسرا کھیل تھا۔ فیض صاحب کو میں نے سکرپٹ پیش کیا تو نہ صرف یہ کہ اسے سبکی سے پڑھا بلکہ جا بجا اس کی تصحیح بھی فرماتے گئے۔ شاید ان کو یہ کھیل پسند آیا ہوگا ورنہ وہ اس کی ٹوک پلٹ سنوارنے کا ارادہ بھی نہ کرتے۔ انہوں نے سکرپٹ کو پاس کرنے کے بعد مجھ سے کہا کہ تم اس کا معاوضہ لے لو اور کھیل کا بجٹ بنا کر لے آؤ۔ میں نے اسی وقت واؤچر سامن کر کے دوسروں سے پکڑ لئے جو اس وقت کے حساب سے خاصی رقم ہوتی تھی یہ کھیل بھی تیس لاکھ کی طرح سنجیدہ کھیلوں کے درمے میں آتا تھا۔

جب ڈرامہ کا سٹ کرنے کا مرحلہ آیا تو پھر ہمیں آئے وال کا بھاد معلوم ہوا۔ ان دنوں میں

ہوں کے لئے خواتین اداکاراؤں کا کال پڑا ہوا تھا۔ صرف فیض صاحب کی صاحبزادی سلیمہ اور امتیاز نتاج کی صاحبزادی یاسمین تھیں جو ڈراموں میں اپنے جوہر دکھا رہی تھیں۔ لیکن وہ ہم جیسوں کی ست میں کہاں تھیں۔ وہ صرف ان ہی ڈراموں کو میسر تھیں جن میں ان کے منگیتیر جلوہ افروز ہوتے۔ میرے نصیب میں صرف دو خواتین ایسی تھیں جو پروفیشنل سمجھی جاتی تھیں ان میں ایک سمعیہ ناز میں دوسرے عطیہ اشرف۔ ڈرامے میں خواتین کا کردار بہت اہم تھا۔ ایک ماں تھی دوسری بہو اور سیری ایک نرس۔

ماں کے کردار کے لئے بیگم پروین کو تو راضی کر لیا لیکن بہو اور نرس کے لئے مجھے بہت خوار ہونا پڑا۔ میں ان ہی دنوں ہدایت کار لقمان کی فلم فرشتہ کے مکالمے لکھ رہا تھا اور اسی دوران شاہنواز سنوڈیو میں میری ملاقات ایک ابھرتی ہوئی فنکارہ سے ہو گئی۔ جو ان کی فلم میں ایک ثانوی کردار ادا کرنے کیلئے منتخب ہوئی تھیں۔ میں نے اس فنکارہ کو جس کا فلمی نام کافہہ جوہر ہوا تھا کئی گھنٹے تھینر میں کام کرنے کی افادیت پر یکپھر پلاتا رہا حتیٰ کہ میری باتوں سے متاثر ہو کر وہ اس سنگلاخ زمین پر قدم رکھنے کو آمادہ ہو گئی۔

میں نے موقع غنیمت جانا اور قبل اس کے کہ وہ ارادہ بدل دے اس کو ٹیکسی میں بٹھا کر الحمرائے آیا۔ جس وقت ٹیکسی الحمرائے کے احاطہ میں داخل ہوئی تو فیض صاحب اپنے کمرے کے باہر برآمدے میں کھڑے ہوئے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ ان کو یہ تعجب ہوا کہ یہ کافہہ میرے ہاتھ کیسے آگئی۔ جب میں نے یہ سڑوہ سنایا کہ وہ ڈرامہ میں کام کرنے پر راضی ہو گئی ہے تو ان کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ بہر حال ہم جب ریہرسل کے لئے سٹیج پر گئے اور جب اس کے ہاتھوں میں سکرپٹ دیا تو وہ ہنسی پر چند سطریں پڑھ کر اس پر گھبراہٹ سی طاری ہونے لگی۔ باقی سارے فنکار موجود تھے۔ وہ سٹیج کا خاصہ تجربہ رکھتے تھے۔ سب نے مل کر کافہہ کی جھجک دور کرنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ جون توں کر کے ریہرسل ختم ہوئی اور کافہہ دوسرے دن آنے کا وعدہ کر کے چلی گئی۔

ریہرسل کے بعد فیض صاحب نے مجھے اپنے کمرے میں بلا کر بڑی شاہباش دی اور ڈائریکشن کے کھاتے سے کچھ ایڈوائس بھی دلوا دیا۔ اس زمانے میں ایک پبلشر مجھ پر مہربان ہو کر ایک برصغیر میں لکھے ہوئے 32 سال کے منتخب ڈراموں کو دو جلدوں میں ”منتخب اردو ڈرامے“ کے نام سے شائع کر رہا تھا۔ میں نے فیض صاحب کو کتابت شدہ مسودہ دے کر ان سے اس کے گروپیشن کے لئے کچھ لکھنے کی فرمائش کر رکھی تھی۔ وہ کافی عرصہ تک مجھے نالتے بھی رہے۔ لیکن اس شام وہیں بیٹھے بیٹھے چند سطریں لکھ کر دے دیں۔ جو کتاب کے گروپیشن کی زینت بن گئیں۔ یہ سب غالباً کافہہ کے حسن کا فریاد کا کرشمہ تھا۔

بہر حال کافہہ دوبارہ ہمارے ہاتھ نہ آئی اور نہ کسی دوسری کافہہ کا بندوبست ہو سکا۔ لہذا ڈرامہ التواء

کی نذر ہو گیا اور میں بدل ہو کر ڈرامہ سے دستبردار ہو گیا۔ فیض صاحب نے سبط حسن کے ذریعے فیروز منز میں ”تعلیم و تربیت“ کی ادارت پر معذور کر دیا۔

لیکن الحمرائے پھر بھی ہماری توجہ کا مرکز بنا رہا اور ہم ابابیل کی طرح سرشام اس کے چکر کاٹنے پر مجبور تھے۔ الحمرائے اور اس کے ہاں ایک کنبہ کی طرح تھے۔ ادیب، شاعر، مصور، کلاکار، گلوکار سب ایک لڑی میں پروٹی ہوئی مخلوق لگتے تھے اور فیض صاحب ان کے ساتھ بہت ہی خوش و خرم رہتے تھے۔ پھر یہ خوشیاں پروٹی ہوئی مخلوق کیسے جب فیض صاحب کو لینن امن انعام سے نوازا گیا۔

اس وقت دو چند ہو گئیں جب فیض صاحب کو لینن امن انعام سے نوازا گیا۔ فیض صاحب کو دل کا دورہ پڑا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے خوشیوں کا یہ باغ ایک بگولے کی نذر ہو گیا۔ فیض صاحب کو دل کا دورہ پڑا اور وہ ہسپتال میں زیر علاج تھے۔ یہ ہمارے لئے اندوہناک خبر تھی کیونکہ فیض صاحب تھے تو ہم سب تھے اور فیض صاحب اگر چلے گئے تو ہم کہیں کے نہ رہیں گے۔ پھر انہیں ماسکو سے بلاوا آیا کہ ان کا علاج روسی معالجوں کی ذمہ داری سنبھریں۔

اب الحمرائے الحمرائے نہیں تھا۔ فیض صاحب کے بغیر الحمرائے فیض ہو گیا۔ اور ہم بے آسرا اور یتیم و یربرین گئے۔ اس کے بعد ان کی خبریں آنی رہیں وہ خود نہیں آئے۔ ایک بار آئے تو انعام کی رقم سے ماڈل ٹاؤن میں ایک مکان خرید کر چلتے بنے۔ کبھی پتہ چلتا وہ لندن میں ہیں اور کبھی بیروت میں ہیں۔

بیروت میں وہ باس عرافات کے بلاوے پر گئے تھے اور وہیں ان کے ساتھ فلسطین کی جنگ میں بنش نفس شریک ہوئے۔ ادبی کاوشوں کا سلسلہ پھر بھی نہیں ختم ہوا اور ایک مجلہ ”لوش“ کا اجراء کیا۔ جو عربی اور انگریزی دونوں زبانوں میں شائع ہوا کرتا تھا اور ہمیں یہاں فیض صاحب کی یاد دلاتا رہتا تھا۔ پھر اچانک ایک دن ان سے کراچی آ کر آئس کونسل میں ملاقات ہوئی۔ وہ مختصر عرصہ کے لئے وطن واپس آئے تھے۔ مجھے ملتے ہی گلے سے لگا لیا اور بولے:

”ارے بھئی تم یہاں سلیمہ بیٹی بن گئے ہو۔“

میں نے کہا: ”میں کچھ بنانا نہیں ہوں جو ہے وہ سب آپ کا عطیہ ہے۔“
کہنے لگے: ”تم ادھر ادھر مت ہوتا کسی چاہنے والے کو پکڑتے ہیں اور وہاں محفل جماتے ہیں۔“
ایسے چاہنے والے تو ان کی تاک میں رہتے تھے کہ فیض صاحب کی قربت نصیب ہو۔ ہمیں اس کے لئے زیادہ تنگ و دو کی ضرورت ہی نہ ہوتی تھی۔

اس اثناء میں میری زندگی میں کئی موڑ آئے۔ ٹیلی ویژن کی برکتیں۔ ایک شادی کے بعد دوسری شادی اور پھر لندن کے دن اور لندن کی راتیں۔ سب کے جی بھر کے مزے لوٹے۔ دوسری شادی کے بعد کراچی میں پھر ان سے ملاقات ہوئی۔ یہ دن ٹوٹوں ملاقات تھی ہماری نوبیا ہتا بیوی ہمارے درمیان تھی اور فیض صاحب کے لئے اس نے بڑا پر اہتمام ڈنر ترتیب دے رکھا تھا۔ فیض صاحب اس دعوت سے

اس قدر متاثر ہوئے کہ بار بار یہی جملہ دہراتے رہے:

”یہ شادی ایک بار پھر ہونی چاہئے جس میں میری شرکت ضرور ہو۔“

یادش سے پہلے فیض صاحب سے لندن میں کئی ملاقاتیں ہو چکی تھیں جن کا ذکر رہ گیا۔ ان ہی ملاقاتوں میں ایک یادگار ملاقات وہ دعوت تھی جو سلیم شاہد کو برطانوی اعزاز (OBE) آرڈر آف برٹش امپائر سے نوازنے کی خوشی میں دی گئی تھی۔ اس کا اہتمام پاکستانی نژاد تاجر ریاض دولی نے کیا تھا اور پورا ہال مہمانوں سے کچھا کچھ بھرا ہوا تھا۔ اس موقع کی ایک یادگار تصویر میرے منظر میں کی زینت ہے جس میں ہم ساتھ بیٹھے ہیں۔

ایک رات لندن ہی میں ہم ٹی بی سی کے ہاؤس کلب میں بیٹھے تھے کہ کلب بند ہونے کا وقت آ گیا۔ فیض صاحب کے ایک مراح نے فیض صاحب کو اپنے گھر چل کر مزید شراب کی دعوت دی جسے فیض صاحب نے بڑی خوش خلقی سے قبول کر لیا۔ حالانکہ اس مزید کی قطعاً ضرورت نہ تھی اور میں حریدی کی حالت میں بھی نہیں تھا لیکن فیض صاحب اصرار کر کے مجھے ساتھ لے گئے جہاں سے مطلع ابھر کر ہم گھر لوٹے۔

لندن میں قیام کے دوران میں نے مقامی کاسٹ کے ساتھ آرٹس تھیٹر میں اپنا کھیل ”چور چاہے شور“ سچ کیا تو اس کا ایک خصوصی شو لندن کے ایک مضافاتی تھیٹر میں پیش ہوا۔ اس کھیل میں پاکستان ایسیسی کے پریس اتاشی کو مہمان خصوصی کے طور پر مدعو کیا گیا۔ وہ اس کھیل سے بہت محظوظ ہوئے اور اس کے لئے انہوں نے اپنے ذاتی انٹر و سوج کے ذریعے برمنگھم اور مانچسٹر میں شو کا بندوبست کرا دیا۔

اتفاق سے جس دن برمنگھم میں شو کا اہتمام کیا گیا اسی دن وہاں فیض صاحب کے لئے ایک محفل مشاعرہ ترتیب دیا جانا تھا۔ ہمارے برمنگھم کے پائرس کا لندن فون آیا کہ تم فیض صاحب سے بات کرو کہ یہ مشاعرہ اور کسی تاریخ کو رکھ لیں ورنہ مشاعرہ کو چھوڑ کر میرا ڈرامہ دیکھنے کوئی نہیں آئے گا۔ فیض صاحب کو فون کر کے میں نے استدعا کی کہ مشاعرہ آگے یا پیچھے کسی تاریخ میں کر لیں ورنہ ہمارا شو تاریخ اب ادھر ادھر نہیں ہو سکتی کیونکہ دوسرے دن کی فلائٹ سے مجھے لاہور واپس جانا ہے۔

فیض صاحب سے عرض کیا ابھی کیا جلدی ہے لاہور بعد میں چلے جائے گا لیکن وہ جھنجھکے کہ لاہور ہر صورت پہنچنا ہے۔ ان کے آخری الفاظ تھے۔

”میری زندگی کا کوئی بھر دسہ نہیں ہے میں چاہتا ہوں زندگی کے باقی ایام لاہور میں گزاروں۔“

میں لا جواب ہو گیا اور وہی ہوا جو فیض صاحب چاہتے تھے۔ یعنی میرے ذرا سے کے تماشائی مشاعرے کی نذر ہو گئے اور فیض صاحب اپنے محبوب شہر کو واپس آ گئے۔

سیارہ ڈائجسٹ کی ایک منفرد تحقیقی اور عظیم پیشکش

قمرانی وظائف و طائف

❖ یہ وظائف ہماری آپ کی اور ہر گھر کی پریشانیوں، الجھنوں اور مشکلات کا حل ہیں۔

❖ قرآن مجید کی چھوٹی چھوٹی آیات پر مشتمل یہ وظائف آسان، سادہ اور عام فہم زبان میں اس طور سے پیش کیے جا رہے ہیں کہ ہر قاری بھی ان پر بغیر کسی دشواری کے عمل پیرا ہو کر ان قمرانی وظائف سے اپنی بگڑی بنا سکے۔

❖ اولیائے کرام اور بزرگان دین کے مصدقہ آزمودہ اور پُر اثر قمرانی وظائف۔

❖ انشاء اللہ یہ نمبر بھی ماضی کی طرح آپ کی امنگوں پر پورا اترے گا۔

فون: 7245412

سیارہ ڈائجسٹ ۲۰۱۶ء میں مارکیٹ ڈروائز
محکم دلائل سے مزین

ان سے ایک اور یادگار ملاقات کا ذکر بھی ضروری ہے اتنا یاد ہے کہ وہ لاہور سے کراچی آئے ہوئے تھے اور ہم نے ان کے ساتھ اکٹھے لچ کھایا تھا۔

مجھے جیسے ہی معلوم ہوا وہ کراچی میں ہیں میں نے ان کو فون پر گھر آنے کی دعوت دی وہ راضی ہو گئے کہا میں آمنہ مجید کے ہاں ٹھہرا ہوا ہوں تم مجھے آ کر لے جاؤ۔

ان ہی دنوں اطہر علی بھی لندن سے آئے ہوئے تھے۔ موقع غنیمت جان کر چند اور دوستوں کو بلا لیا۔

فیض صاحب جب فلیٹ میں داخل ہوئے تو اس وقت سب دوست جمع ہو چکے تھے جن میں ایس ایم شاہد اور اسد مرزا بھی شامل تھے۔

پوچھا: ”کیا نہیں گے؟“

بولے: ”مجھے ڈاکٹر نے منع کیا ہے۔“

میں نے کہا: ”اس ڈاکٹر کے دل سے خوف خدا اٹھ گیا ہے جو منع کر رہا ہے۔“

اس بات پر وہ ہنس دیے مگر اپنی بات پر وہ قائم رہے۔

میں نے مزید لقمہ دیتے ہوئے کہا:

”فیض صاحب! یہ آپ ہمارے ساتھ جو زیادتی کر رہے ہیں وہ تو ہمیں قبول ہے مگر آپ اپنے ساتھ بھی بڑی زیادتی کر رہے ہیں۔“

”فرمایا: ”کیا مطلب؟“

میں نے عرض کیا: ”آپ کا بھئی چہرہ جو ماشاء اللہ فروغ سے فروزاں رہتا تھا آج وہ ساری رقی دشمنوں کی نذر ہو گئی ہے۔ کیا تمہاری ہوا سرخ و سفید اور شاداب چہرہ تھا۔ اب لٹا ہوا ہے ڈیرہ ڈال رکھا ہے۔“

بولے: ”اچھا تمہارے پاس کیا ہے؟“

میں نے کہا: ”دو پہر کی مناسبت سے آپ کی پسندیدہ ”جن“ کا بندہ دست ہے۔ اگر آپ پسند کریں۔

کہنے لگے: ”مجھے صرف واٹن کی اجازت ہے۔“

خوش قسمتی سے عین اس وقت نواب کینی نے کھٹی بجائی۔ انہوں نے بغل میں واٹن کی ایک بوتل داب رکھی تھی۔ وہ ہماری فیض صاحب سے آخری محفل تھی۔

آخری بار مجھے یاد نہیں لاہور میں ملاقات ہوئی۔ وہ آرٹس کونسل آئے ہوئے تھے چہرہ کملا یا ہوا لگ رہا تھا۔ مجھ سے پوچھا۔

”تمہاری بیوی کیسی ہے؟“ میں نے جب بتایا کہ ہماری علیحدگی ہو گئی ہے اور وہ واپس ہندوستان

چاہتی ہے تو ان کا چہرہ مجھ کیسا اور زبان سے کچھ نہ بولے۔



”خود جلیں دیدہ اغیار کو بینا کر دیں“



husain_sayyed2001@yahoo.com

قاسم حسین سید سیرۃ ڈائجسٹ کے دیرینہ قاری اور مستقل قلم کار ہیں۔ گذشتہ کئی ماہ سے وہ ایسی بہترین تحریروں کا مجموعہ قارئین کی نذر کر رہے ہیں جو قارئین میں بے حد پسند کی جا رہی ہیں اور جن کے حصول کے لیے بے شمار کتب، ہراند اور انٹرنیٹ سے استفادہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ جناب سید نے قارئین سیرۃ ڈائجسٹ کیلئے اپنے گہرے مطالعہ اور تحقیق کے نیچوڑ کیساتھ ساتھ دنیائے ادب کی چنیدہ کتب و تراجم سے اخذ اقتباسات پر مشتمل انتخاب کو زیر نظر سلسلے میں یکجا کر دیا ہے۔ ان تحریروں میں شہد جیسی محاسن، لیون کی کھٹاس، گونڈنما کی کڑواہٹ اور زہر ہلاہل کی آمیزش ہے۔ !!

”دیکھا بیڑھا اور طاق نسیاں کر دیا“

○ جب کسی طاقت ور کو اس کے جرم کی سزا دی

جاتی ہے تو وہ سزا پر اسے سانج پر تقسیم ہو جاتی ہے۔

○ ویل دو طرح کے ہوتے ہیں:

ایک وہ جو قاتلوں کو جانتا ہے اور دوسرا وہ جو ج

ک جانتا ہے۔

○ امیر آدمی کسی جرم میں پھنستا ہے تو ”ج“

کر لیتا ہے۔ جب گناہوں میں پھنستا ہے تو ”ج“

کر لیتا ہے۔

○ ہر شخص یہ ثابت کرنے میں مصروف ہے کہ

میں تم سے بہتر ہوں!

○ علم کا مطلب تقلید سنت اور عقیدہ نہیں بلکہ

تحلیق، تحقیق اور جستجو ہے۔ جن اقوام نے تخلیق اور

تحقیق کو اپنایا وہ ترقی کی منزلیں طے کرتی گئیں اور

جنہوں نے علم کو محض عقیدہ بنالیا وہ پسماندگی اور

تاریکی کا شکار ہو گئیں۔

○ جو قوم دو منٹ سٹل پر کھڑی نہیں ہو سکتی وہ

اپنے ہیروں پر کیا کھڑی ہوگی۔ (اشفاق احمد)

○ حقیقت یہ ہے کہ ہم لوگوں کو غلامی کی عادت

پڑ چکی ہے۔ بجلی کی لوڈ شیڈنگ ہوئی تو یو پی ایس

لگا لیا، مہنگائی کی انتہا ہو چلی خود کشی کر دی اور کچھ لوگ

آزادی کا نعرہ لگانے کے لئے لٹکے ان کو کہا یہ کیا

ملاقات بنایا ہوا ہے؟

○ حقیقہ لہذا ان سے پوچھا گیا کہ:

کوئی چیز یا محسوسات سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے تو انہوں نے فرمایا کہ ہاں! جب کوئی شریف انسان کسی مجبوری میں کسی غم غم طرف کے آگے دست سوال دراز کرے۔

○ ہمارا محاشرہ اب ایسا بن چکا ہے کہ یہاں کہانیاں لکھنے والے کم ہی ہیں لیکن کہانیاں لکھنے والے جگہ جگہ ہیں۔

”فکر اقبال“

(ڈاکٹر خلیفہ عبدالکلیم کی کتاب سے اقتباس)

اقبال کے دل میں یہ رُخپ بھی کہ مسلمانوں میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لئے ایک طبقہ پیدا ہو سکتا اس اہم فریضہ کے لئے اہل دل اور اہل علم ہونے کی ضرورت ہے اور زبردست جذبہ انار اس کے لئے لازم ہے۔ جب وہ دیکھتا تھا کہ عوام دین کی خبر نہیں (اگرچہ اسی بے خبری کے باوجود ان کے اخلاق خواص سے کچھ بہتر ہی ہوتے ہیں) اور حامیان شرع تین تین ملا اور صوفی کا یہ حال ہے تو بعض اوقات ماپوی میں یہ نگار افسوس تھا کہ اسے خدا اس ملت کو دنیا سے اٹھالے اور حسب وعدہ کوئی اور ملت اسلام کی خدمت کے لئے پیدا کرے کہ ایں ملت جہاں ربابار دوش است

اقبال نے ملا کی نسبت عام شاعروں کی طرح فقط لطیف بازی نہیں کی۔ اس نے جو کچھ کہا ہے وہ بر بنائے بصیرت اور بر بنائے تجربہ کہا ہے۔ اس کا انداز نظر فاضل نہیں بلکہ اس کی تہہ میں درد و رنج ہے اکثر اشعار میں ملا پر جو اعتراض کیا ہے اس کی وجہ بھی بتائی ہے۔ ملا میں رواداری نہیں ہوتی:

کوئی یہ پوچھے کہ واعظ کا کیا بگڑتا ہے جو بے عمل پر بھی رحمت وہ بے نیاز کرے

اسلام کے مطابق خدا رب العالمین ہے اور اس کا نبی رحمتہ العالمین ہے۔ تنگ نظری نے خدا کو صرف رب المسلمین اور نبی کو رحمتہ المسلمین بنادیا اور یہ رحمت بھی تمام مسلمانوں کے لئے نہیں بلکہ اپنے فرقے کے چند افراد کے لئے ہے۔ بشرطیکہ وہ تمام معاملات میں آپ کے ہم خیال اور ہم نوا ہوں۔ اسلام کا تقاضا یہ تھا کہ رسم و عادت کو عام کیا جائے اور عدل و رحم کو صرف اپنے گروہ تک محدود نہ رکھا جائے۔ تنگ نظر علماء نے محبت کو عام کرنے کے بجائے نفرت کو عالمگیر بنادیا۔ اس لئے کہ غفلت خدا کی کثیر تعداد تو کسی ایک ملت اور ایک فرقے سے خارج ہی ہوتی ہے۔ نفرت اور تنگ نظری کا بازار گرم ہو گیا جو تم سے پوری طرح مشتق نہیں اس کے ساتھ مل کر نماز بھی نہ پڑھو جو فلاں امام کے پیچھے نماز پڑھے گا اس کی پیروی پر طلاق عائد ہو جائے گی۔ مسجدوں میں اس مضمون کے بورڈ لگنے شروع ہو گئے کہ مسلمانوں کے فلاں فلاں فرقوں کے افراد کے لئے اس مسجد میں نماز پڑھنا ممنوع ہے۔ (ایک بڑی مسجد میں اس قسم کا بورڈ راقم الحروف نے طالب علمی کے زمانے میں دیکھا ہے) بلند آواز سے آمین کہنے پر لوگ مسجدوں میں پلٹ گئے اور اس کے بعد مسجد کو محفل دیا گیا کہ ہندوی آمین کی تپاکی رفق ہو جائے۔ مسلمان غیر مسلموں سے تو کسی قدر رواداری برتنے میں لگے لیکن اپنی ملت کے اندر تشدد میں اضافہ کرتے گئے۔ نئے معنی اور ہدف ملامت بننے نثر میں لکھنے کے ارادے ہی کرتے رہے لیکن یہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہوا۔ ملت اسلامی کی تحلیل فو کے متعلق خطبات انگریزی میں لکھے اور وہ بھی ایسے فلسفے کی زبان میں جو ملا تو درکنار اعلیٰ انگریزی دان طبقے کے لئے بھی آسانی سے قابل فہم نہیں۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ کوئی ان کو اردو زبان میں منتقل کرے کیونکہ ان

کو فخر تھا کہ بغیر تشریح و توضیح ان سے شدید غلط فہمی پیدا ہوگی۔

میں جانتا ہوں جماعت کا حشر کیا ہوگا مسائل نظری میں اُلجھ گیا ہے خطیب اس شعر میں شکایت ہے کہ زندگی کے حقیقی مسائل علی ہوتے ہیں اور خیر و شر کا معیار بھی عمل ہی سے قائم ہوتا ہے لیکن جب کسی قوم کی قوت عمل میں ضعف آجاتا ہے تو فقہاء، خطیب اور حکماء نظری بیٹوں میں اُلجھ کر رہ جاتے ہیں۔ ملا میں لفظی اور فنی بحث و تکرار کا شوق اس قدر غالب ہے کہ اگر وہ بھی سیرت کے لئے جنت میں داخل ہوا تو اس کو اس دارالسلام میں بھی کچھ لطف نہ آئے گا۔ وہاں صلح و سلوک کی فضا میں بحث و تکرار کی منجاش نہیں اور ملائقہ کے لئے تسکین کا سامان نہیں۔

اقبال کو اس کا افسوس ہے کہ متصوفین نے حقوق کو خراب کیا، شریعت کے حامیوں نے اس کی وسعت اس کی حکمت اور اس کے جمال کو مخدوش کیا اور متکلمین کے علم کلام نے اسلام کو عجی اور یونانی افکار کا گروہ دھندلا بنادیا اب یہ حال ہے کہ ہر ایک سند کے لئے پرانی تکیہ کی ڈھونڈتا ہے۔

علم و عشق دونوں غائب ہیں اور ملت میں فقط روایت پرستی رہ گئی ہے۔ اب شیخ و مناجات میں بھی روح باقی نہیں رہی، شیخ کی دانہ شماری ایک میکا کی فعل بن گیا ہے۔ ایران عرب ممالک اور ترکی میں یہ روح عام ہے کہ ہر کس و تانکس کے ہاتھ میں شیخ ہوتی ہے۔ دنیا داری کی لغو باتیں ہو رہی ہیں لیکن ہاتھ میں سچہ گردانی جاری ہے میں نے ان ممالک میں کئی مرتبہ لوگوں سے پوچھا کہ تم اس شیخ پر کیا ذکر یا درد کر رہے ہو؟ ہمیشہ جواب یہی ملا کہ یوں ہی عادت ہو گئی ہے ہم پڑھتے کچھ نہیں معلوم ہوا کہ عبادات و بنیادوں کی طرح ایک غیر شعوری حرکت

ہے۔ یا وسعت افلاک میں بحیر مسلسل یا خاک کے آغوش میں صبح و مناجات وہ مذہب مردان خود آگاہ و خدا مست یہ مذہب ملا و عبادات و بنیادوں جن طرہ باز خطاب یافتہ جاگیر دار پیریوں کا اوپر ذکر ہو چکا ہے وہ پنجاب میں کافی تعداد میں ملتے ہیں۔ اگرچہ ان کا جو زور و شور سندھ میں ہے وہ شاید کہیں اور نہیں۔ بنگال میں بھی پیریوں کا کافی دور دورہ ہے۔ لیکن غالباً وہاں ان کو زیادہ امیری اور جاگیر داری میسر نہیں آئی۔ اقبال کو پنجاب کا تجربہ تھا۔

○ اقبال کی خواہش یہ تھی کہ علم و فن یورپ سے حاصل کرو لیکن روحانیت اور اخلاقیات کا جو سرمایہ تم کو اسلام نے عطا کیا ہے اس بیش بہا وراثت کی قدر کرو تا کہ تم شرق اور غرب دونوں سے افضل اور مکمل تہذیب و تمدن پیدا کر سکو۔ (ایضاً)

○ امریکہ میں راقم الحروف نے فلسفہ اسلام پر بہت سے لکچر دیئے ایک روز یوشن میں سیسل یونیورسٹی کا مشہور پروفیسر ناتھروپ جس نے شرقی اور اسلامی نظریات حیات پر مبسوط کتابیں تصنیف کی ہیں مجھ سے کچھ سوالات پوچھنے کیلئے ساتھ میل کی مسافت طے کر کے آیا۔ وہ علامہ اقبال کی بالغ نظری کا بہت قائل تھا۔ اس نے مجھ سے دریافت کیا کہ اقبال نے یہ خودی اور عشق کے نظریات قرآن میں کہاں سے اخذ کئے ہیں کیونکہ اقبال اس تعلیم کا ماخذ قرآن ہی بتاتا ہے۔ میں نے اس کو قرآن کا نظریہ آدم بڑی وضاحت سے بتایا اور پھر اس سے

اور قائد اعظم سے بڑی تیزی سے لائق ہوتا چارہ ہے خدا اس پاکستان کی حفاظت کرے جس کے بارے میں فیض صاحب نے یہی کہا تھا چلو آؤ تم کو دکھائیں ہم جو بچے شہر میں یہ حلال صفا کے ہیں یہ ہیں اہل صدف کی قربتیں

”ساری سہر“

مغل فرمانرواؤں میں اورنگزیب عالمگیر ایک خدا ترس مذہب سے لگاؤ رکھنے والا بادشاہ کہلاتا تھا۔ اس نے ساری عمر نہ کوئی نماز چھوڑی اور نہ کوئی بھائی.....!

”عمورسیدہ افراد“

ایک معاشرہ تب ہی پروان چڑھتا ہے کہ جب وہاں کے عمر رسیدہ افراد یہ جانتے ہوئے بھی پودے لگائیں کہ وہ اپنے لگائے ہوئے پودوں کے سائے میں کبھی نہیں بیٹھ پائیں گے۔

(قدیم یونانی کہاوت)

”کلام جون ایلیا“

بے قراری سی بے قراری ہے
وصل ہے اور فراق طاری ہے
جو گزاری نہ چاکی ہم سے
ہم نے وہ زندگی گزاری ہے
بن تمہارے کبھی نہیں آئی
کیا مری نیند بھی تمہاری ہے
اس سے کہو کہ دل کی گلیوں میں
رات دن تمہاری انتظار ہے
اک مہک سمت دل سے آئی تھی
میں یہ سمجھا تری سواری ہے
خوش رہے تو کہ زندگی اپنی
عمر بھر کی امید داری ہے

دریافت کیا کہ بتاؤ کہ اقبال نے جو کچھ کہا ہے وہ اس نظریے کی شرح و تفسیر ہے یا نہیں اس نے بے حد شکر یہ ادا کیا اور کہا کہ مدت سے ایک کاٹا میرے دل میں ٹھک رہا تھا آج تم نے وہ کاٹا نکال دیا۔
اسلام یا قرآن کبھی اس کا مدعی نہیں ہوا کہ اس کی تعلیم کے اہم اجزا اس سے قبل کبھی انسانوں پر منکشف نہ ہوئے تھے۔ وہ خواخواہ اور بھٹکی کا دغیدار نہیں وہ انسانوں کو بھولی ہوئی صداقتیں یاد دلاتا ہے جو دنیا کے قریب قریب میں مختلف زبانوں میں پیش کر چکے تھے۔

(۔ ایضا۔)

”گریبان“

(منو بھائی کے کالم جنگ ذات کام سے)
امریکہ سے اشعر احمد شتیق کا فون آنے کا کہ منو بھائی ہماری عمریں لمبی ہوگئی ہیں اور زندگیوں گھٹ گئی ہیں۔
مجھے آنکھ جھنکی تو تم ہماری مجھے دل دیا تو دکھا ہوا بڑی شدت سے یہ احساس آجا کہ ہورہا ہے کہ ہم بہت تیز رفتاری سے قائد اعظم محمد علی جناح کے علاوہ علامہ محمد اقبال سے دور ہوتے جا رہے ہیں اور مجھے یاد پڑتا ہے کہ فیض احمد فیض نے ایک بار جنگ فورم سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ ”جب تک ہم علامہ اقبال کے قریب رہیں گے محفوظ ہیں علامہ اقبال سے دوری ہمیں غیر محفوظ کر دے گی۔ اور کوئی بڑی سے بڑی فوج بھی ہماری حفاظت نہیں کر سکی گی۔“ اس وقت مجھے یہ فیض صاحب کا بیان کچھ عجیب سا لگا تھا اور فیض صاحب کے ساتھ جن نظریات کو منسوب کیا جاتا تھا ان کی تردید ہوئی تھی مگر آج لگتا ہے کہ فیض کا یہ خیال بالکل صحیح تھا اور علامہ اقبال کے فرزند جاوید اقبال نے بھی اپنی یادداشتوں میں یہی لکھا ہے کہ پاکستان علامہ اقبال

منافع ہو گیا ہے

سیارہ ذابجٹ

کی ایک اور عظیم ایمان افروز پیش کش

کتاب 63 دنوں کے دوران 60 روپے میں 60 روپے کے سکون حیات پر مشتمل

مختصر سلسلہ

ان معجزات کے ذریعے

لا تہدا و انسا نوں کے لیے راہ ہدایت روشن ہوئی اور دنیائے انسانیت پر پھیلی ہوئی کفر و جہالت کی تاریکیاں سمیٹتی چلی گئیں۔

ایک کتاب 63 دنوں کے دوران 60 روپے میں 60 روپے کے سکون حیات پر مشتمل

500 صفحات پر مشتمل نفیس کاغذ، عمدہ کیسٹرونگ اور دیدہ زیب مرقع

سیرۂ ذابجٹ / اپریل ۲۰۱۶ء

54

○ سے ایک بچی سوار ہو کر سکول جاتی تھی۔ اب ایک ٹرین صبح سات بج کر 5 منٹ پر صرف اس کم سن مسافر کے لئے آتی اور پھر شام پانچ بجے اسے واپس لاتی اس بچی کا تعلیمی سال مارچ میں مکمل ہو جائے گا اور 26 مارچ کے بعد کامی تراکی زلیوے سیشن کے لئے ہو گا ندور یلوے کی سروس بند ہو جائے گی۔ اتنی مشکل سے باقی ہیں کچھ تو میں اپنے طالب علموں کو.....!

(شاید جاپان جیسے ملک کو کبھی ضرب مضرب کی ضرورت پڑے) وسعت اللہ کا کالم بی بی سی ڈاٹ کام سے۔

○ میں لڑکیوں کی ڈرامائیگ کے ہرگز خلاف نہیں ہوں لیکن ایک ہیڈنٹ کے خطرے کے وقت بریک کی جگہ چلے جانا کہاں کا انصاف ہے؟

○ 1917ء - متحدہ ہندوستان کے ایک روپیہ کا نوٹ۔

جب یہ ایک روپیہ 13 امریکی ڈالرز کے برابر تھا۔

○ سو کھے چوں کی طرح بکھرے ہیں ہم تو کسی نے سمیٹا بھی تو صرف جلائے کے لئے "قسط غلطیہ" پیٹکر سے خاتون فضا میزبان کی آواز بلند ہوئی۔

○ "خواتین و حضرات اپنی نشستیں سیدھی کر لیجئے اور سیٹ بیلٹ باندھ لیجئے۔ کچھ ہی دیر میں ہم استنبول کے کمال اتاترک انٹرنیشنل ایئر پورٹ پر اترنے والے ہیں۔" ایئر ہوسٹس کی آواز نے تمہو خواب مسافروں میں ایک ہلچل سی پیدا کر دی۔

○ "جیتے تھے"

پوتا: دادا جان آپ اپنے زمانے میں ٹیکنالوجی، اسارٹ پورٹ، انٹرنیٹ اور ایکٹرا ایک اشیاء کے بغیر کیسے جیتے تھے؟
دادا: بچے جیسے آج تم لوگ محبت، سچائی، وفا اور انسانیت کے بغیر جیتے ہو اسی طرح ہم بھی ان سب چیزوں کے بغیر جیتے تھے۔

○ "ٹھنڈا پانی"

ایک گلاس میں آپ ٹھنڈا پانی لیں اور اپنے قریب سوئے ہوئے شخص پر ڈال دیں۔ وہ ٹھنڈا پانی اسے گرم کر دے گا اور وہ اٹھ کر آپ کو ٹھنڈا کر دے گا۔

○ "Means"

if you fail, never give up because fail means, first attempt in learning end is not end in fact end means: efforts never dies if you get no, as an answer remember no means next opportunity.

○ "فیصلہ"

جاپان کی ہو گا ندور یلوے کمپنی نے تین برس پہلے کامی تراکی زلیوے سیشن کے لئے اپنی سروس غیر منافع بخش ہونے کی بنا پر بند کرنے کا فیصلہ کیا۔ مگر پھر یہ فیصلہ ملوثی کر دیا گیا کیونکہ اس سیشن

55

سیرۂ ذابجٹ / اپریل ۲۰۱۶ء

دجلہ فرات، نیل اور ڈینوب تھے اور چار پہاڑ گوہ طوز، کوہ بلقان، کوہ قاف اور کوہ اطلس تھے۔ بعد میں عثمان کی اولاد کے زمانے میں چونکہ سلطنت ان دریاؤں اور پہاڑوں تک پھیل گئی تھی اس لئے یہ خواب دراصل سلطنت عثمانیہ کی وسعت سے متعلق ایک پیش گوئی تھی۔ شہر سے مراد قسطنطنیہ کا شہر تھا جسے عثمان فتح نہ کر سکا جو بعد میں اس کے پڑپوتے سلطان محمد کے ہاتھوں فتح ہوا۔

استنبول شہر کی بنیاد 667 قبل مسیح میں رکھی گئی تھی۔ اس وقت کے حکمران بائیزنس کے نام پر اس شہر کا نام بازنطین رکھا گیا مگر 330 عیسوی میں قسطنطین اول (CONSTANTIN-1) نے شہر کی ازسرنو تعمیر کے بعد اس کا نام قسطنطنیہ (CONSTANTIN POLE) کر دیا۔ 395 عیسوی میں رومی سلطنت کے دو حصوں مشرقی اور مغربی میں تقسیم ہو جانے کے بعد 1435ء تک بازنطینی سلطنت کا دار الحکومت رہا۔ یورپ کی تاریخ کو عموماً تین ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ 395ء سے 1452ء تک کا دور قرون وسطیٰ (MIDDLEAGE) کہلاتا ہے۔ سلطان محمد فاتح نے جب 1453ء میں قسطنطنیہ فتح کیا تو اس کا نام اسلام بول رکھ دیا جس کے معنی اسلام کا شہر ہیں۔ یہ نام عوام میں بہت مقبول ہوا۔ اور لوگ اسے اسلام بول کہنے لگے۔ بعد ازاں قسطنطنیہ کی تبدیلی کے نتیجے میں استنبول بن گیا۔ اس دوران سرکاری نام قسطنطنیہ ہی رہا۔

1921ء میں کمال اتاترک نے سرکاری طور پر قسطنطنیہ کا نام تبدیل کر کے استنبول کر دیا۔ جوں جوں جہاز اور زمین کا فاصلہ کم ہو رہا تھا استنبول کی شان دار عمارتیں اور سڑکوں پر رواں دواں گاڑیاں واضح نظر آنے لگیں تھیں۔ کچھ دیر بعد استنبول کی

مسافروں نے اپنا اپنا دینی سامان سمیٹنا شروع کر دیا اور جہاز لینڈ کرنے کا انتظار کرنے لگے۔ جیسے جیسے زمین اور جہاز کے درمیان فاصلہ کم ہونے لگا مسافروں کا جیس بڑھنے لگا۔ کھڑکی کے نزدیک بیٹھے ہوئے مسافر استنبول کے فضائی منظر کو اپنی آنکھوں میں سینے کی کوشش کرنے لگے۔ میں نے بھی کھڑکی سے استنبول کو ایک نظر دیکھنے کی کوشش کی اس وقت رات کے ساڑھے نو بج رہے تھے۔ پورا شہر روشنیوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ خشکی پر روشن عمارتیں اور آہٹائے پاسفوس میں بکری جہازوں اور کشتیوں کی روشنیاں عجیب و غریب منظر پیش کر رہے تھے۔ استنبول کا یہی بحر مجھے یہاں پہنچ لایا تھا۔ استنبول اپنے کل وقوع کے اعتبار سے ایک منفرد حیثیت کا حامل ہے۔ یہ دو براعظموں ایشیا اور یورپ اور دو سمندروں بحیرہ اسود اور بحیرہ مرمر کے ساتھ واقع ہے۔ عظیم آبی گزرگاہ آہٹائے پاسفوس استنبول کو دو حصوں ایشیائی اور یورپی استنبول میں تقسیم کرتے ہوئے ان دونوں سمندروں کو باہم ملاتی ہے۔

کہتے ہیں کہ سلطنت عثمانیہ کے پہلے حکمران عثمان خاں نے خواب دیکھا "ایک زبردست درخت اس کے پہلو سے نمودار ہوا جو بڑھتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ اس کی شاخیں بحرِ روم پر چھا گئیں درخت کی بڑے دنیا کے چار بڑے دریا نکل رہے تھے اور چار بڑے پہاڑ اس کی شاخوں کو سنبھالے ہوئے تھے۔ اس کے بعد نہایت تیز ہوا چلی اور اس درخت کی پتوں کا رخ ایک عظیم الشان شہر کی طرف ہو گیا۔ یہ شہر ایک عظیم جگہ واقع تھا جہاں دو سمندر اور دو ممالک ملتے تھے۔ یہ انگوٹھی کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ عثمان اس انگوٹھی کو پہننا چاہتا تھا کہ اس کی آنکھ کھل گئی۔ عثمان خاں کے اس خواب کو بہت اچھا سمجھا گیا اور بعد کے لوگوں نے اس کی تعبیر یہ بتائی کہ چار دریا

سیارہ ذابجٹ / اپریل ۲۰۱۶ء

اتاترک ایئرپورٹ پر جہاز اتر گیا۔ ہم بھی کچھ دیر میں مسافروں کے ساتھ جہاز سے باہر نکل آئے۔ رن وے پر بے شمار ایئر لائنز کے لاقعداد جہاز کھڑے ہوئے تھے۔ کمال اتاترک ایئرپورٹ دنیا کے مصروف ترین ایئرپورٹس میں سے ایک ہے اینگریشن کا مرحلہ طے کر کے ہم ایئرپورٹ سے باہر آ گئے۔ جہاں لاؤنج کے سامنے والی سڑک پر بے شمار گاڑیاں اور ٹیکسیاں کھڑی تھیں۔ ہم ہواش کمپنی کی بس میں سوار ہو گئے جس کا کام پورے ترکی میں مسافروں کو ایئرپورٹ سے شہر تک لے جانا اور لانا ہے۔ بس ایتھانی لگژری صاف ستھری اور آرام دہ تھی

چونکہ استنبول ہمارے لئے اجنبی اور ہم استنبول کے لئے اجنبی تھے۔ اس لئے ہمیں بہت سی معلومات درکار تھیں کہ جن میں سرفہرست سے اور اچھے ہوئے کس علاقے میں واقع ہیں۔ مشکل یہ تھی کہ ہمیں ترکی زبان نہیں آتی تھی۔ مسلمان وقتاً فوقتاً اسے کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ مگر یہ سعادت سلطان محمد کے حصے میں آئی اور اس شاخ زریں کے ساحل پر وہ مسرکہ لڑا گیا کہ جسے عسکری تاریخ میں منفرد مقام حاصل ہے۔ قسطنطنیہ میں داخلے کا واحد راستہ شاخ زریں سے ہو کر گزرتا ہے جس کے دہانے کو روپیوں نے ایک ایتھنی زنجیر سے بند کر رکھا

وہنی دباؤ سے چھوٹے بچوں کی وہنی نشوونما متاثر ہوتی ہے

سکول جانے سے قبل کی عمر کے بچے اگر کسی طرح ڈپریشن اور وہنی دباؤ کا شکار ہو جائیں تو اس سے ان کی دماغی اور وہنی نشوونما شدید متاثر ہوتی ہے۔ ایک حیرت انگیز مطالعے سے معلوم ہوا ہے کہ بہت چھوٹے بچوں میں ڈپریشن اور وہنی نشوونما ان کے ذہن کو بدل کر ان میں 'گرے میٹز' کو متاثر کر سکتا ہے۔ گرے میٹران ہاتھوں (نشو) کو کہتے ہیں جو دماغی خلیات (سیلز) کو جوڈ کر ان کے درمیان ایسے گٹل کا تبادلہ ممکن بناتے ہیں جو دیکھنے، سننے، فیصلہ سازی، احساسات اور جذبات کو کنٹرول کرتے ہیں۔ اس طرح بچوں کے اہم افعال متاثر ہو سکتے ہیں۔ تحقیق سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ تین سال تک کی عمر کے بچے بھی ڈپریشن کا شکار ہو سکتے ہیں اور اس سے ان کی دماغی صلاحیت متاثر ہو سکتی ہے۔ واشنگٹن یونیورسٹی میں بچوں کی نفسیات کے ماہر ڈاکٹر جوآن ایل لوبی اور ان کے ساتھیوں نے تحقیق کر کے بتایا کہ پہلی مرتبہ یہ ثابت ہوا کہ تین سال کے بچے بھی ڈپریشن کا شکار ہو سکتے ہیں اور اس کا اثر ان کی دماغی ساخت پر پڑتا ہے۔ اس سے خود انسانی دماغ کے بارے میں معلوم ہوا کہ بہت چھوٹی عمر میں بھی دماغ بیرونی عوامل سے متاثر ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ رپورٹ کے مطابق اگر والدین بچے کی درست تربیت نہ کریں اور انہیں پیار و محبت نہ دیں تو بھی بچوں کی نفسیات پر مضر اثرات ہوتے ہیں اسی طرح بچوں کے سامنے منفی رویہ، خراب موڈ، غریت اور گھبریلو لڑائی جھگڑے بھی بہت منفی اثر ڈالتے ہیں۔

(مرسلہ: ندیم گلاب - لاہور)

سیارہ ذابجٹ / اپریل ۲۰۱۶ء

سوڈیم لائٹ میں جگمگا رہے تھے۔ جب ہم ساحل پر اترے تو کنارے پر موجود سینکڑوں مرد و خواتین بچے اور جوان باسفورس میں کی جانے والی آتش بازی میں محو نظر تھے۔ ہم بھی کافی دیر تک ان لوگوں میں شامل ہو کر اس منظر کو جی بھر کر آنکھوں میں سیننے کی کوشش کرتے رہے اور بالآخر بوجھل قدموں کے ساتھ ہوئی کی طرف روانہ ہو گئے۔ یہ سوچتے ہوئے کہ پھر کبھی یہ نظارے دیکھنے کو ملیں گے یا نہیں.....؟

(خلیل احمد فہیم کا سفر نامہ استنبول مشرق و مغرب کا سنگم جگہ "گردش" سے اقتباس)

"کلام مصطفیٰ زیدی"

تم نے ہر عہد میں نسلوں سے غداری کی
تم نے بازار میں عقلوں کی خریداری کی
اینٹ سے اینٹ بجا دی خودداری کی
خوف کو رکھ لیا خدمت یہ کمانداری کی
آج تم مجھ سے مری جس گراں مانگتے ہو
خلف ذہن و وفاداری و جان مانگتے ہو
جاؤ! یہ چیز کسی علاج سرا سے مانگو
ٹاٹنے والوں سے دھوکہ کی صدا سے مانگو
اپنے دربانوں سے بدتر فقراء سے مانگو
اپنے دربار کے گونگے شعراء سے مانگو

○

"چور"

جس طرح اس خطے کو انگریز بھی سونے کی چڑیا کہتے تھے جس خطے کو انگریز بیرونی قرضے لئے لے لیں
100 سال اس خطے کے اپنے قدرتی وسائل سے چلاتے رہے۔ آج ہمارے حکمران اسی خطے کو بیرونی قرض اور خیر و خیرات سے چلا رہے ہیں۔ انگریز چور تھے یا ہمارے حکمران چور ہیں۔

فنا، تخطیہ، کامل وقوع ایک شلت کی مانند ہونے کے باعث کہ جس کے ایک طرف بحیرہ مرمر دوسری طرف شاخ زریں اور تیسری طرف گھٹا جنگل اور پہاڑ تھے۔ جب یہی کسی جہاز کو اندر آنے کی اجازت دینا مطلوب ہوتی تو آہنی زنجیر بٹائی جاتی۔ شاخ زریں کے ساحل پر ایک فیری بوٹ ایشیائی استنبول جانے کے لئے تیار کھڑی تھی۔ ہم نے کاؤنٹر سے نوکن خریدے اور میٹرو سٹیشن کی طرح یہاں پر دھاتی پائپوں سے بنی رکاوٹوں سے گزر کر فیری میں داخل ہو گئے۔ فیری کا چھلا ڈیک مختلف قسم کی گاڑیوں سے اور عرشہ مسافروں سے بھرا ہوا تھا۔ ہم نے سیٹ پر بیٹھ کر سفر کرنے کے بجائے کھڑے ہو کر سفر کرنا مناسب سمجھا کیونکہ ہم عرصے کے چاروں طرف گھوم پھر کر آنا سے باسفورس کے نظارے کرتے ہوئے سفر طے کرنا چاہتے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد فیری اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئی۔ کنارہ آہستہ آہستہ دور ہونے لگا۔ ایک اور گردش منظر ہمارا حشر تھا۔

باسفورس میں رواں دواں بحری جہازوں اور فیری بوٹ کی روشنیاں دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا کہ ستارے آسمان سے باسفورس کی میر کے لئے نیچے اتر آئے ہوں۔ یورپی اور ایشیائی استنبول کی بلند و بالا عمارتوں کی رنگا رنگ روشنیوں کا عکس سمندر کے پانی میں جھللا رہا تھا۔ دور باسفورس کا پل رنگین نقوش اور پل پر چلتی گاڑیوں کی روشنیوں میں کھلساں کا منظر پیش کر رہا تھا۔ اچانک آہنائے باسفورس کے وسط میں ایک بحری جہاز سے آتش بازی کی جانے لگی ایسا لگ رہا تھا کہ رنگ و نور کے سیلاب نے باسفورس کا رخ کر لیا ہے۔ یورپی استنبول پر نظر ڈالی تو اک عجیب منظر تھا۔ مسجد سلیمانہ مسجد سلطان احمد اور مسجد ایا صوفیہ کے نوکیلے مینار

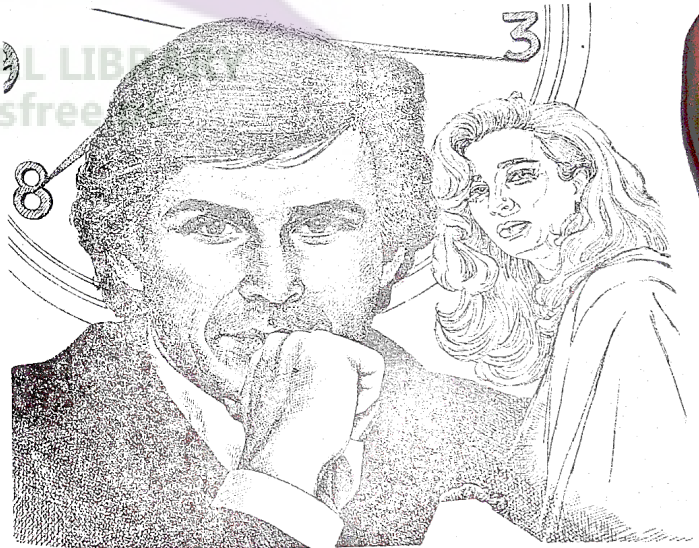
دلالت برائش رحمت

نوشاہ اختر

”اماں جانی! یہ ماہم ہے آپ کی بہو۔ ماہم اماں جانی سے ملو“ اور اماں جانی ہکا بکا ان دونوں کا منہ دیکھ رہی تھیں۔ پڑ سکون سمندر کی تہہ سے جو طوفان اٹھا تھا وہ ان کی سمجھ سے بالاتر تھا اور ان کا ذہن ماؤف ہو چکا تھا۔

ایک مروت کی کشادہ سرخی ان پر اس کا رحمت کے دور کے نال ہے جس سے

نیکی اور گناہ اور مختلف دھاروں پر چلنے والے احساسات کا نام ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا نیکی اچھے اخلاق کا نام ہے۔ گناہ وہ احساس ہے جو تیرے دل میں کھلے اور ٹوٹا پھیند کرے کہ دوسرے لوگ یہ جان سکیں کہ یہ فعل تجھ سے سرزد ہوا ہے۔ پھر آپ نے فرمایا نیکی کے بارے میں اپنے دل سے پوچھو جس پر دل مطمئن ہو وہ نیکی ہے اور جس کو دل برائے وہ گناہ ہے۔ خیر خواہی وہ عمل ہے جس میں بہتری ہی بہتری ہے اور دین کی راہ پر چلنے ہوئے خیر خواہی اور خیر گالی کے جذبول کو اجاگر کرنا سب سے زیادہ ضروری ہے۔ زندگی میں توازن رکھنے کے لئے دنیا کو دین پر ترجیح



ندو کہ کسی سے توازن میں بگاڑ پیدا ہونے لگتا ہے۔ انسان مروت مال کا براہریس ہے دو سے چار اور چار سے آٹھ اور آٹھ سے سولہ بنانے کی فکر اسے سونے دیتی ہے نہ بچپن سے جینے دیتی ہے اور اس کے لئے وہ ہر غلط راستے کا انتخاب کرتا چلا جاتا ہے اور ایک عام آدمی سے لے کر حاکم وقت تک اسی دور میں شامل ہیں۔

زندگی رب ذوالجلال کی عطا کردہ ایک بہت بڑی نعمت ہے اور فیصلہ کرنے کے اختیارات مکمل کے ساتھ ہمیں عطا کی گئی ہے۔ لہذا خیانت، لوٹ مار، سلنگ، لارڈی، جو سب بہت مال و دولت کی آماجگاہ ہیں۔ ان سے حاصل کردہ بہترین خوراک بھی بندے کے خون کو گندہ کر دیتی ہے۔ اور جب خون گندہ ہو جائے تو ساری سوچوں کے چشمے غلاط کے گز بن جاتے ہیں جو غلاطت کے اس ڈبیر پر بیٹھا ہے اس کے لئے فضا بالکل متعفن نہیں ہوتی اور وہ اس نفس کے ڈبیر میں دبا ہر رشتے، ہر ناٹے اور ہر انسانی رقی سے دور ہو جاتا ہے۔ کیا یہ بہتر نہیں اس حرام کثرت کے بجائے ایک فقرہ حلال کا اور رزق طیب کا مل جائے جس سے جسم میں خون بھی طیب پیدا ہو سوجھیں بھی صالح ہوں اور صالح عملوں کی توفیق بھی نصیب ہو جائے۔

وہ بھی ایک بڑے کتبے کا سردار تھا۔ باپ سردار بھی تو ہوتا ہے نا۔ دولت کی ریل پیل تھی۔ پہلی شادی حسن بانو سے ہوئی جو کنبے برادری کی لڑکی تھیں مگر خوبصورتی کے ساتھ حسن، سلیقہ اور آداب و شعور رکھنے والی ساس کی پسند تھی۔ اس لئے سب کی پسند تھی۔ اس کی ذات میں سے کسی نے کیڑے نہیں نکالے۔ گھر کی آرائش و زیبائش کے ساتھ ساتھ بہترین کھانے بنانے کی بھی ماہر تھی۔ یوں لگتا تھا اس گھر میں روشنی ہی روشنی پھیل گئی ہے۔ وقت پر نماز

ادا کرنا اس کی عادت تھی اور نماز یوں پڑھتی کہ کسی کے کام میں غل نہ ہوتی۔ ساس کی بھی خدمت گزار تھی۔ عالمگیر جب حسن بانو کو میاہ کر لایا تو روپہ پانی کی طرح بہایا اور حسن بانو کو بھی سونے میں تول دیا۔ برادری میں خوب واہ واہ ہوئی۔ لڑکیاں حسن بانو کی قسمت پر رشک کر رہی تھیں اور کئی تو جل کڑھ بھی رہی تھیں۔ حسن بانو کو سب کچھ خواب کی طرح لگ رہا تھا۔ وہ ایک درمیانے سے طبقے کے گھرانے میں پلی بڑھی والد صاحب سرکاری نوکر تھے۔ محدود آمدنی تھی۔ تین بیٹوں اور دو بیٹیوں کی پرورش کی ذمہ داری ان کی والدہ شاہ بانو کی تھی جو وہ بطریق احسن ادا کر رہی تھیں۔ عالمگیر نے اپنی والدہ محترمہ اختر کے سامنے اپنی پسند کی چند شرائط رکھ دیں۔ اور حسین اختر نے اپنی پرہیز دوست رابع کرن سے مدد لینے کی ٹھانی اور پھر کالج کے ایک مہائے میں انہوں نے حسن بانو کو پسند کر لیا۔ رابع کرن نے حسن بانو کی بہت تعریف کی اور اس طرح رشتہ پانے کا سلسلہ چل نکلا۔ حسن بانو کے والد نے عالمگیر سے ملاقات کی۔ عالمگیر کے والد وفات پا چکے تھے بظاہر عالمگیر میں کوئی اور بیٹے نہ باکر یہ رشتہ طے پا گیا اور حسن بانو کو عالمگیر والا کی رونق بن گئی۔

عصر حاضر کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ تعلیم تو عام ہوتی جا رہی ہے لیکن حسن تربیت کا روز بروز فقدان ہوتا جا رہا ہے۔ ہمارے زمانے میں اساتذہ تعلیم اور تربیت دونوں سے اپنے طالب علموں کو سنوارا کرتے تھے اور والدین کو بھی چونکہ عصر حاضر والی مصروفیات نہیں تھیں اس لئے بچوں کی ہر حرکت پر ان کی نگاہ ہوتی تھی۔

جدید دور کے والدین چاہتے تو ہیں کہ بچے ذہین اور مہذب ہوں لیکن ان کی گاڑی اس پٹری پر کبھی بھی نہیں چلتی جس پر چلنے سے یہ نتائج حاصل

سیرۃ ذابجٹ / اپریل ۲۰۱۶ء

قوم فساد جس میں ہلاک کی گئیں۔ معمولی مشکوک کو عذاب نہ کہو اور اللہ کے عذاب سے ہرگز ڈرتے ہوئے عافیت مانگو۔

بات ہو رہی تھی حسن بانو کی جس نے سرال میں قدم رکھتے ہی جہاں ساس اور خاوند کے دل پر اسے حسن کردار، حسن اخلاق اور حسن شعور کی دھاک بٹھائی وہیں ہر جگہ ہر گھر میں اس کے چہرے ہونے لگے کہ خوش قسمت ہے حسین اختر جسے اتنی شاندار بھول گئی۔

بڑے خوبصورت انداز میں وقت گزرنے لگا گھر میں آنے والے ہر مہمان کو خوش آمدید کہا جاتا تو کر چاکر ہونے کے باوجود حسن بانو خود اچھی اچھی ڈشز بناتی اور داد و تحسین وصول کرتی۔

ڈیڑہ سال بعد جب حسن بانو امید سے ہوئی تو حسین اختر کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ جہاں دوست احباب اور رشتہ داروں کو منگھنایاں کھلائی گئیں وہیں غریب غریب کو بہت نوازا گیا اور بہت سی خوشیوں میں حسن بانو کا زچگی کا دورانیہ گزرتا چلا گیا۔ چلتی پھرتی چھوٹے موٹے کام کاج کرتی حسن بانو نے نو ماہ بعد ایک بہت ہی خوبصورت بچی کو جنم دیا اور پوتی کی خوشی میں جہاں دادی نہال ہو رہی تھی وہیں عالمگیر خان بھی باپ بننے کی خوشی میں شاداں و فرحان سب کی مبارکبادیں وصول کر رہے تھے اور حسن بانو کا چہرہ ماں کا تقدس لئے چودھویں کے چاند کی طرح چمک رہا تھا۔

ساتویں روز رسم عقیقہ ادا کی گئی۔ بچی کو ماہ نور کے نام سے نوازتے ہوئے بہت بڑی دعوت کا اہتمام کیا گیا جس میں رشتہ برادری کے لوگ اور دوست احباب نے شرکت کی۔ حسن بانو نے رب کے حضور سجدہ شکر ادا کیا۔

اور اس کے بعد زندگی بڑے نامل حالات میں

سیرۃ ذابجٹ / اپریل ۲۰۱۶ء

بیاری میں مبتلا شخص اپنے آپ کو غلط سے غلط بات پر بھی صحیح کہتا ہے۔ وہ اپنا پرستی کی اس میز پر چڑھ جاتا ہے جہاں سے نیچے کی ہر چیز بہت چھوٹی نظر آنے لگتی ہے اور ایسے انا پرست لوگ اپنی انا کی بدصورتی کو پھیلانے بغیر آہستہ آہستہ کامیابی کی طرف بڑھنے لگتے ہیں اور یہی انا عالمگیر خان کا الیہ بن گیا۔

”اماں جانی! میں دوسری شادی کروں گا۔ مجھے ایک بیٹے کی نہیں بیٹیوں کی ضرورت ہے۔ آپ کوئی لڑکی ڈھونڈیں گی یا میں اپنے ذرائع استعمال کروں۔“ اور حسین اختر آنکھوں کی نمی کو چھپاتے ہوئے شرمندگی کا احساس لئے حسن بانو کے آزرہ چہرے کو دیکھنے لگیں۔

جب بات بہت زیادہ بڑھ گئی تو حسن بانو نے اپنی ساس کے سامنے دل کھول کر رکھ دیا۔

”اماں جانی! آپ خود اگر کچھ کر لیں گی تو شاید بہتری کی صورت نکلے۔ عالمگیر اللہ جانے کس قسم کی لڑکی کو گھر میں لے آئیں ایسا نہ ہو ہماری یہ جنت برباد ہو جائے۔“

ساس نے حیران نظروں سے حسن بانو کی طرف دیکھا کس محل اور بربادری کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ ان کا دل کٹ کر گیا۔ آگے بڑھ کے اس کی پیشانی پر اپنے محبت بھرے ہونٹ رکھ دیئے اور آنکھوں سے آنسو اس جذبے کی ترجمانی کر رہے تھے جو شاید الفاظ کبھی بھی ادا نہ کر سکیں۔

”کس ہمت کے ساتھ تمہارے اوپر سوکن لئے آؤں میری جان! وہ تو عقل کا اندھا ہو گیا ہے اس کی عقل پر تو ماتم کر رہی ہوں توخوڑا تو اور انتظار کر لے۔“ وہ بے جان ہو کر حسن بانو کے پاس ہی بیٹھ گئیں۔

”لیکن اماں جانی! اگر انہوں نے خود کوئی قدم اٹھالیا اور جائیداد اور دولت کی چکا چوند میں پھنسی کوئی

گرنے لگی۔ چاروں طرف رنگ ہی رنگ بکھرے ہوئے تھے اور یہ سب اللہ کی رحمتوں کی صورت میں دیکھتے تھے مگلتاتے ہوئے چھوڑ کر صورت میں حسن بانو اور اس کے چاروں طرف برس رہے تھے۔

ماہ نور نے نو ماہ کی عمر میں پاؤں پاؤں چلنا شروع کیا تو دادی نے اس کے پاؤں میں چھین چھانے والی پانچ ڈال دی کہ گھر کے درو دیوار اس آواز سے مگلتاتے رہیں۔ پھر اس نے تو کٹی زبان میں جب یوں شروع کیا تو حسن بانو نے سب سے پہلا لفظ اللہ سکھایا۔

چھوٹے چھوٹے خوبصورت واقعات جنم لیتے رہے اور دو سال بیت گئے۔ اب حسن بانو سے عالمگیر کی فرمائش تھی کہ مجھے بیٹا چاہئے اتنی چاہیداں گھر میں اب ایک بیٹے سے نہیں بلکہ بیٹیوں کے بغیر ہلکا ہے۔ حسن بانو نے محل سے عالمگیر کو سمجھانے کی کوشش کرتی کہ اولاد دلائی صرف عطائے ربی ہے جو چاہے عطا فرمائے لیکن عالمگیر کی رٹ ایک ہی تھی۔

کسی دانشور کا قول ہے کہ کامیابی کا حصول جتنا بھی اہم و اہل چیز انتخاب مقصد ہے۔ آپ اپنی عقل کا استعمال کرتے ہوئے دوسروں کو فائدہ پہنچائیں مسائل سے گھبرا کر عدم تحفظ کا شکار نہ ہوں۔ نیک نیت اور مسلسل کوشش سے ایمانداری کے ساتھ اپنی منزل کی طرف بڑھتے جائیں اور باقی کام اللہ کے ہر درگزر کی۔

مقدد کے لکھے کوکون نال سکتا ہے اور اب کی بار بھی حسن بانو نے بنی کو جنم دیا تو عالمگیر خان جیسے سے اٹھ گئے۔ ماں نے بھی بہت بھجایا کہ تم دونوں کو بڑھو تو نہیں ہو گئے اللہ سے اچھے کی امید رکھو جس نے بیٹیاں دی ہیں وہ بیٹا بھی عطا فرمائے گا۔

دراصل دولت کی فراوانی بسا اوقات انسان کو تکبر اور غرور میں مبتلا کر کے اس کے حق پر ڈال دیتی ہے کہ اس

کئے جاسکتے ہیں اور یہ کی شعوری بھی ہے اور لاشعوری بھی۔ بچوں کی تربیت یعنی سکھانے کا عمل ماں کی گود سے شروع ہوتا ہے اور اس طرح گھر اور سکول دونوں ایک ہی وقت میں ان نو مولود پودوں کی نگرانی اور دیکھ بھال کرتے ہیں اور حسن بانو جس گھر کی چشمہ و چراغ تھی وہاں والدین اپنی اولاد کو بہترین سے بہترین بنانے کی ہر سعی اور کوشش کرتے تھے اور اس لئے حسن بانو نے جب عالمگیر ولا کی دلہیز پار کی تو سوچ لیا کہ دنیا میں اسی گھر کو جنت بنانا ہے اور کسی کو بھی بھی کسی قسم کی کمی کا احساس نہیں ہونے دینا اور یہ وہی احساس تھا جو اس کی والدہ شاہ بانو نے اس کے اندر کوٹ کوٹ کر بکھریا تھا۔

دراصل بچے کا قلب پاکیزہ سادہ اور ہر قسم کے گردوغبار اور مصنوعی آلائشوں سے پاک ہوتا ہے۔ نئی نے فرمایا تھا کہ ہر بچہ مسلم پیدا ہوتا ہے پھر اسے اس کا ماحول اس کے والدین اور اس کے ساتھ رہنے والے کچھ بھی بنادیتے ہیں لیکن اگر اس قلب پر اچھے نقوش ثبت کئے جائیں اور والدین اور اساتذہ خود بہترین الفاظ کو استعمال کریں تو بچے بھی بہترین الفاظ کے استعمال کا سلیقہ سیکھ سکتے ہیں الفاظ بلکہ ہر لفظ ایک بہت بڑی قوت ہے۔

میں اب پھر اپنے والدین اور اپنے اساتذہ مرحومین کی مثال دوں گی رب العزت ان کے مراتب بلند کرے۔ جن کی زبانوں پر بھی کوئی ایسا لفظ آیا ہی نہیں تھا جو قابل گرفت ہو۔ میری مرحومہ والدہ بچوں کو شیطان نہیں کہتے دیتی تھیں کہ شیطان تو رلہ درگاہ ہوا۔ اسے تو رب نے ذلیل و رسوا کر کے اپنے دربار سے نکال دیا۔ ہم اپنے بچوں کو شیطان کیوں کہیں؟ کبھی عذاب کا لفظ استعمال نہیں کیا کہ رب کے عذاب سے ہمیشہ ڈرتے رہنا چاہیے کیونکہ عذاب وہ ہے جو قوم لوٹ پر آیا۔ قوم عاذ

سیارہ ڈائجسٹ کی ایک اور شہریت کاوش

الاحوال اسلامی واقعات

شائع ہو
گیا ہے

قیمت 175 روپے

★ رسول خدا خلفاء راشدین صحابہ کرام اور صالحین کی قابل تقلید زندگیوں سے لیے گئے سنہری واقعات

★ دور نبوت خلافت راشدہ اور تاریخ میں موجود عدل و انصاف کی عظیم روایات

★ مسلم خواتین کی ذہانت متانت اور شجاعت کے حیرت انگیز قصے

★ دور جدید میں نئی نسل کے جذبہ ایمانی کو از سر نو تازہ کر دینے والے روح پرور واقعات

★ ہر مسلم گھرانے کی لائبریری کی زینت، نوجوانوں کے لئے مشعل راہ۔ دعاؤں کے ساتھ

سیارہ ڈائجسٹ 244 ریواڑ گارڈن لاہور فون: 042-37245412

تخلی اس گھر کے آگن میں اتر آئی تو کیا ہوگا۔ بہتر نہیں اس سیلاب بلا کے سامنے آپ خود کوئی بند باندھ دیں۔ حسن بانو کی بات سن کر وہ آہستہ سے گھٹنوں پر ہاتھ رکھے انہیں اور سوچتی ہوں کہہ کر کمرے سے باہر نکل گئیں۔

حسن بانو کا دل کلڑے کلڑے ہو رہا تھا۔ ایک ہی سوچ دماغ پر چھائی ہوئی تھی کہ کیا دوسری عورت کی موجودگی میں میری بچیاں باپ کی وہ شفقت اور پیار پاکیس کی جوان کا ازلی حق ہے۔

یہاں بھی وہ اپنے متعلق نہیں سوچ رہی تھی یہاں بھی اس کی سوچوں کا محور اس کی بیٹیاں تھیں اور شادی کے صرف تین سال بعد اڑھائی سالہ ماہ نور اور چھ ماہ کی شاد بانو کی موجودگی میں عالمگیر خان ایک اور کھین لے آئے۔ جو کسی حد تک حسین اختر کی ہی پسندھی کیونکہ حسن بانو کا تقاضا یہی تھا۔

لیکن ہر کوئی حسن بانو تو نہیں ہوتا نا۔ گھر کا ماحول یکسر بدل گیا جب ایک ماہ بعد ہی روشن آراء کے امید سے ہونے کی خوش خبری ہوا کے دوش پر مسکرانے لگی۔

روشن آراء کا مزاج آسان کی وسعتوں کو چھوئے لگا یوں گویا اس کی کوکھ میں یقیناً ایک وارث ایک بیٹا ہی ہے۔ کام کرنے والوں کی ہر وقت دوڑ لگی رہتی کبھی اسے جس کی طلب ہوئی اور کبھی دودھ کی۔ ایک عام سے گھر سے آنے والی روشن آراء جیسے آسان کا ستارہ بن گئی۔ کہاں حسن بانو بھی کہ سارا دوران زندگی بیٹے کھیلنے گزار دیتی اور ایک یہ نیک پوین تھی کہ پانی کا گلاس بھی کوئی ہی لائے دیتا۔

قدرت کے رنگ نرالے۔ چوتھا مہینہ تھا سب لوگ کسی شادی کی تقریب میں گئے ہوئے تھے جانے کیا ہوا۔ روشن آراء دھڑام سے گری اور ترپنے لگ گئی۔ ہسپتال پہنچایا گیا ڈاکٹر نے چیک کرتے ہی

بتا دیا کہ بچہ ضائع ہو چکا ہے اور صورت حال کچھ ایسی ہے کہ چھوٹا آپریشن کرنا پڑے گا اور آپریشن کے بعد بچے کی پیدائش سے پتہ چل گیا کہ اب کی بار بھی عالمگیر خان کے مقدر میں بنی ہی تھی۔ جو دنیا میں آنے سے پہلے ہی روٹھ کر چلی گئی۔ اگر عالمگیر خان ذرا سا بھی منتقل اور سمجھ بوجھ سے کام لیتے تو شاید یہ اسرار ان پر کھل جاتا کہ کسی کا دل دکھانے اور کسی کو ناراض کرنے سے عافیت نصیب نہیں ہوتی۔ انسان کا نفس تو کافر ہے اور نا عاقبت اندیش بھی اور یہ نفس عمارہ انسان کے لئے اسی نا عاقبت اندیش کے سبب بظاہر اچھے لیکن دراصل بے حد غیر سود مند سودے کرتا رہتا ہے۔

اور اب کی بار عالمگیر خان نے بڑے آرام سے روشن آراء کے ہاتھ میں طلاق نامہ پکڑا دیا۔ کہ تم بھی بیٹیوں کی مشین بن کر آگئی ہو اور مجھے تہمیدی قطعاً ضرورت نہیں۔

اگر خود کی دور بین سے دیکھا جائے تو کوئی بھی رشید بدن پر چہنا ہوا لباس نہیں ہوتا جسے اُتار کر پھینک دیا جائے اور دوسرا پہن لیا جائے۔ لیکن شاید عالمگیر خان کے پاس عقل و خرد والی آنکھ ہی نہیں تھی اور کبھی اگر کبھی بھی تو اب اس پر دولت کی سیاہ شیون والی عینک چڑھا دی گئی تھی اور اس عینک سے اب اس نے اپنے لئے کوئی ہیرا خود ہی تلاش کرنے کی ٹھان لی۔ ایسا ہیرا جو اس کے لئے بیڑوں کی مشین ثابت ہو سکے۔ دراصل انسان اگر مشیت ایزدی کے سامنے سر جھکا دے اور اپنے نفس کے اوپر قابو پا کر مطمئن قلب پانے کی کوشش میں جت جائے تو رب رحیم و کریم کبھی اس کے ساتھ منصفانہ رویہ ہی اختیار کر لیتے ہیں لیکن جہاں ہم اس کے سامنے اس ضد کے ساتھ کلڑے ہو جائیں کہ جیسے بھی اور جہاں سے بھی مجھے تو لینا ہی لینا ہے تو اللہ تو پھر اللہ ہے نا

سیارہ واخبت / اپریل ۲۰۱۶ء

بچوں کے ہسپتال لے جایا گیا تو ڈاکٹر نے انکشاف کیا کہ بچہ پیدائشی طور پر دل کا مریض ہے یعنی اس کے دل میں سوراخ ہے اور اس کی خاص طریقے سے پرورش کرنا ہوگی۔

عالمگیر خان کو جب تفصیل سے بیماری کے متعلق بتایا گیا اور اسے ظلم ہوا کہ یہ بچہ ناریل بچوں سے پیچھے رہے گا اور ساری سرگرمیوں میں حصہ نہیں لے سکے گا تو جہاں حسن بانو دل پر دھچکا لگنے سے پریشان ہوئی وہیں اس نے رب کریم سے بچے کی صحت و زندگی کی دعا میں بھی کر ڈالیں۔ لیکن عالمگیر خان نے عجیب انداز سے بولنا شروع کر دیا۔

”مجھے صحت مند بچہ چاہئے تھا۔ ایک دائمی بیمار بچے کو لے کر اس کا کیا کروں گا۔“

”عالمگیر خان!“ ایک گرجدار آواز نے عالمگیر خان کے قدم پکڑ لئے اور یہ حسین اختر حسین ”اللہ سے ڈرو اس کی ناشکری نہ کرو اور سنبھل جاؤ کہ یہ تمہارے اپنے اعمال کی سزا ہے۔ یہ بچہ رب نے تمہاری گود میں ڈالا ہے کہ تم یہ جان سکو کہ اللہ قادر مطلق ہے۔ اگر اس کے سامنے جھک جاؤ گے تو وہ یقیناً رحیم و کریم ہے اور اس بچے کو شفا یاب کر کے تمہارا بازو بنا سکتا ہے۔“ لیکن عالمگیر خان نے شاید جھکتا سیکھا ہی نہیں تھا۔ شہزادہ گزرا ہوں سے ماں کی طرف دیکھا اور باہر نکل گیا۔

یہ کوئی اعلان بیماری تو نہیں تھی صرف وقت درکار تھا جو صبر سے گزارا تھا اور پیسہ جو عالمگیر خان پانی کی طرح بہا سکتا تھا۔

اور پانی کی طرح پیسہ بہانے کے لئے عالمگیر خان نے دل ہی دل میں تیسری شادی کا فیصلہ بھی کر لیا اور اب کی بار ای جان کی خدمات حاصل کرنے کے بجائے اپنی مدد آپ کے اصول پر چلنے کا فیصلہ بھی کر لیا۔ اور سب کچھ خاموشی سے کرتا ہے یہ بھی سوچ

جس نے عمرو کی موت کے لئے ایک چمچ بھیج دیا اور فرعون کی تباہی کے لئے موسیٰ کو بھیج دیا۔

اللہ سے طلب کے بھی الگ ہی انداز ہوتے ہیں۔ حضرت مریم علیہ السلام کے پاس بے موسم کے پھل دیکھ کر حضرت زکریاؑ نے پوچھا یہ کہاں سے آتے ہیں؟ اور یہ یقین کر لینے کے بعد کہ بے موسیٰ چیزیں دینے والی ذات عالی صفات بھی رب العزت ہی ہے۔ انہوں نے اس بڑھاپے میں رب سے بیٹے کی دعا کی۔ کیوں یہ دعا مانگی گئی کیونکہ ان کو اپنے آگے پیچھے کوئی بھی اس مذہب کی تبلیغ اور حفاظت کرنے والا نظر نہیں آ رہا تھا اور اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک بیٹے کی خوشخبری نہ صرف سنائی بلکہ ان کا نام بھی بھی رکھ دیا گیا۔ درخواست گزار نے دولت نہیں مانگی سوتا چاندی نہیں مانگا ایک ایسا بیٹا مانگا جو اس مذہب کو لے کر آگے چل سکے۔

دوسری طرف حسن بانو تھی جل، خود اعتمادی اور اللہ پر بھروسہ رکھنے والی، مشکل حالات کا سامنا کرنے کے لئے اللہ پر یقین سے بڑھنے والی اور ہر لمحہ سراپا دعا اور پھر ساس کی خدمت گزار بھی۔

اور اس بار اس نے حمل کی مدت خاموشی سے بگزار کر ایک بیٹے کو جنم دیا۔ تو اس کا رواں رواں رب کے شکرانے کے لئے ”تسبیح خواں تھا“ عالمگیر خان کا احساس تقاضا بہت زیادہ بڑھ گیا۔ رب کا شکر ادا کرنے کے بجائے اس نے ایک محفل رنگ و بو کا انعقاد ضروری سمجھا اور عالمگیر دلا کو جہاں پلٹے نور بنایا وہیں اس میں ہتھکڑیوں کی کھک بھی ہواؤں میں اچھال دی گئی اور شاید رب ذوالجلال کو عالمگیر خان کی یہ بات بالکل پسند نہ آئی۔ جشن ولادت شاہ جہاں کے ایک ہفتہ بعد جبکہ بچہ ابھی پندرہ روز کا تھا انتہائی گہدہ اشت کے باوجود بچہ کو شاید شش لگی گئی کہ اس کا سانس بند ہونے لگا اور رنگ نیلا ہو گیا فوراً

سیارہ واخبت / اپریل ۲۰۱۶ء

دہن ماؤف ہو چکا تھا۔

”عالمگیر خان! یہ تم نے کیا کر دیا ہے تین بچوں کے باپ ہوتے تمہیں شادی کرتے شرم نہیں آتی۔ یہ میری بہو نہیں ہو سکتی تم یہاں سے فی الحال چلے جاؤ۔“ اور وہ شرم بے ہوشی کی حالت میں سامنے رکھے صوفے پر گر گئی۔ حسن بانو بھی حیران و پریشان وہیں کھڑی تھی اس نے جلدی سے ساس کو سنبھالا۔ ماہ نور جلدی سے پانی کا گلاس لے آئی دو گھونٹ پانی پینے کے بعد جب حسین اختر کے اوسان بحال ہوئے تو حسن بانو ان کے قریب ہی بیٹھ گئی۔

”اماں جانی! ہمیں جل اور بردباری سے کام لینا ہے اب جبکہ عالمگیر اسے بے ہوش لائے ہیں تو ہماری جلد بازی سے کہیں معاملہ بگڑ نہ جائے ہمیں خاموشی اختیار کر لینی چاہئے۔“

اور آج پھر حسین اختر نے بہو کی پیشانی چوم لی۔ ”میری جان! میری بیٹی تم تنہا بردبار اور معاملہ فہم ہو اس ماں کو لاکھوں سلام جس نے تمہاری پرورش کی۔“

لیکن حسن بانو ہی جانتی تھی کہ اندری اندر اٹھنے والے زلزلے اس کی بنیادوں کو ہلا رہے ہیں۔

اور پھر حسین بانو نے عالمگیر خان کو دو ٹوک الفاظ میں سمجھا دیا کہ وہ اس دہن کو اس کھر میں نہیں رکھے گا دوسری دونوں کٹھنوں میں سے جس میں چاہیں چلے جائیں لیکن اس بیوی اور بچوں کو وقت دینا اس کے فرائض میں شامل ہے۔

اور اس کے بعد انہوں نے اپنے وکیل کو بلا کر جتنی بھی جائیداد ان کے اپنے نام پر تھی حسن بانو کے نام منتقل کروادی تاکہ حسن بانو اور اس کے بچوں کا مستقبل محفوظ ہو جائے۔

پورے ساڑھے آٹھ ماہ بعد ماہم نے ایک صحت مند بچے کو جنم دیا اور عالمگیر کی حسرت بھری زندگی میں

لیا اور اس خاموشی کو حسین اختر نے عالمگیر خان کا راضی برضا رہنا سمجھ لیا اور حالات آہستہ رومی سے آگے بڑھنے لگے۔ بغیر یہ جانے کہ بظاہر اسنے پرسکون سمندر کی تہ میں کون سے طوفان چھپے بیٹھے ہیں۔

حسن بانو اپنے فرائض سے ہل بھر کے لئے بھی غافل نہیں تھی جہاں وہ ایک بہترین ماں تھی وہیں بہترین نرس بھی بن گئی اور اس ساری مصروفیت میں شوہر کی ہر ضرورت کا خیال رکھنا اور دونوں بیٹیوں کی تعلیم و تربیت پر بھی بھرپور توجہ دینا اس کی زندگی کا ماحصل تھا۔ ساتھ ہی ساتھ ساس کی خدمت شکاری بھی اور ہر کام میں ان سے مشاورت بھی کرتے رہنا اس کا معمول تھا۔

چھ سات ماہ پرسکون حالات میں گزر گئے۔ شاہ جہاں نے بھی بیٹھا شروع کر دیا تھا ہر اس ماں کو چیک اپ کے لئے لے جانا حسن بانو کا معمول تھا۔ اس نے اس معاملے میں شوہر کو بھی پریشان نہیں کیا کہ وہ ایک مصروف انسان تھا لیکن ایسی بھی کیا مصروفیت جس میں باپ بچوں کو پیارا اور توجہ نہ دے سکے۔ ان کے بھلے بڑے کے متعلق نہ جان سکے۔

وہ سردیوں کا ایک روشن دن تھا۔ سب کچھ معمول کے مطابق چل رہا تھا دوپہر کے کھانے کا وقت تھا۔ بچیاں بھی سکول سے آچکی تھیں کہ عالمگیر کی مرید بزرگاریو سے ہوتی ہوئی اندر آ کے ٹک گئی۔ عالمگیر خان خود ہی دروازہ کھولا بہت گاڑی سے اتر کر دوسری طرف کا دروازہ کھولا بہت ماڈرن لباس میں لمبوں ایک لڑکی کا ہاتھ تھام کر گاڑی سے اتارا اور حسین اختر کے سامنے لا کھڑا کیا۔

”اماں جانی! یہ ماہم ہے آپ کی بہو۔ ماہم منہ دیکھ رہی تھیں۔ پرسکون سمندر کی تہ سے جو طوفان اٹھا تھا وہ ان کی سمجھ سے بالاتر تھا اور ان کا

میری عقل اور میرے علم کا کمال ہے۔ اس کفرانِ نعمت پر اچانک اس پر اللہ کی گرفت آگئی وہ پکڑا گیا اور یہ پکڑ خوبصورت ماہم کی شکل میں تھی۔ مسلسل بُرائی کرتے ہوئے وہ ایک بیمار دل و دماغ کا مالک بن چکا تھا ایسا دل و دماغ جو چھائی اور اچھائی کو قبول ہی نہیں کرتا۔ احکامِ الہی سے منہ موڑ کر اس نے اپنے ذہب پر زندگی گزارنا چاہی اور ماہم جو فطرتاً ایک کال گرل تھی اس کی مجاہدہ بن گئی۔ ماں نے جو چھائی اس کی فطرت میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی سب رائیگاں چلی گئی اور اس کی دولت اس کی سچائی کی راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ بن گئی۔ اس کی جسمانی اور مالی قوت اسے عذابِ الہی سے نہ بچا سکی۔

ماہم کے ہاں ذیشان کے بعد نہ کوئی بڑا پیدا ہوا نہ ہی اس نے ذیشان کی کوئی تعلیم و تربیت کی۔ پیدا ہوئے ہی بٹی کی گود میں ڈال دیا گیا اور پھر دولت کی فراوانی نے اسے بہت اچھے سکول بھی دے دیئے لیکن جب تک ماں کی محبت بھری آنکھوں میں سمٹ کر بیٹھ اچھی باتیں نہ سنے وہ کیا سیکھ سکتا ہے۔ بٹی کی خوراک صفائی کا خیال اس نے ضرور رکھا لیکن اس سے آگے بس.....

حسن آرا کی دونوں بیٹیاں شاندار کامیابیوں کے سہرے سجائے ماں اور دادی کے لئے ہی نہیں سارے خاندان کے لئے باعثِ فخر بن چکی تھیں۔ دونوں میڈیکل کالج کی زینت بنی اپنی کامیابی کے جھنڈے گاڑ رہی تھیں اور جہاں شاہ جہان کے اٹھارہ سال کی عمر میں اسے لیول کے بہترین نتائج کے ساتھ انجیئرنگ یونیورسٹی میں قدم رکھا۔ وہیں ذیشان کو اپنے بُرے دوستوں کی سنگت کی وجہ سے سکول کے آخری سال میں RESTIGATE کر دیا گیا کیونکہ بورڈنگ ہاؤس میں اس کے کمرے سے شراب کی بوتلیں

خوشی کی کوئٹل پھوٹ نکلی۔ اب ماہم اس کے سر کا تاج اور دل کی رانی تھی اور حسن ہانو کے بچوں کی اس کی زندگی میں کوئی اہمیت نہیں رہ گئی تھی۔

گزرتے وقت کے ساتھ سب نے حالات کے سامنے جھنجھار ڈال دیئے۔ روپے پیسے کی حسن ہانو کو کی کمی نہ تھی تینوں بچے اچھے سکول میں زیرِ تعلیم تھے۔ شاہ جہاں کی صحت کا اسے ہر گھڑی خیال تھا اور چیک اپ ہر ماہ کا معمول۔ حسین اختر بھی اس کے لئے ایک بہترین ماں اور مددگار تھیں لیکن شوہر کی طرف سے کسی بھی قسم کا التفات نہ اس کے لئے تھا نہ ہی بچوں کے لئے۔ وہ سوچتی تھی نہ کسی اپنے بچوں کو تو ان کا حق دے۔ ان کی زندگیوں میں جو باپ کی شفقت کی کمی آتی جا رہی ہے وہ اسے کیسے عمل کر سکتی تھی۔ رب کے حضور بھولی پھیلا کر وہ اپنے بچوں کے لئے بہترین مستقبل کی دعا بھی کرتی۔ اتنی ہی عمر میں تیرہ گزاد بن کر اس نے رب سے خاص ناطہ جوڑ لیا تھا جو اس کو اطمینانِ قلب بھی عطا کر رہا تھا۔

بادہ سال کی عمر میں شاہ جہان ایک کامیاب آپریشن کے بعد صحت و تندرستی کے مراحل بدرجہ اتم طے کر رہا تھا۔ اور حسن ہانو اور حسین اختر رب کا شکر ادا کرتے نہ تھے تھیں اور یہ سب حسن ہانو کے آنسوؤں کی قبولیت تھی۔

عالمگیر خان بیوی بچوں اور ماں سے بہت دور چلا چکا تھا۔ نہ کوئی فون نہ کوئی خیر خیر جب اللہ نے اس پر حسن آراء کی صورت میں اپنی رحمتوں کے خزانے لٹائے دو بیٹوں کی صورت میں رمتوں کی برکھا برساتی تو اس نے حقارت سے سب کو ٹھکرا دیا۔ بہترین رزق کے دیے اس کے قرب و جوار میں ٹھائیں مار رہے تھے۔ اتنی فراخی اتنی آسائشیں پاکر رب کا شکر ادا کرنے کے بجائے اُٹا اس بات پر اترانے لگا کہ سب تو میرا ذاتی کمال ہے۔ یہ تو

کون سا مشکل کام ہے۔ اسی شام عالمگیر فیکٹری کا دورہ کرنے کے لئے خود ہی گاڑی لے کر نکل گیا اور غنودگی کے عالم میں گاڑی چلاتے ہوئے کنٹرول نہ کر سکا اور گاڑی ایک درخت سے ٹکرا گئی۔ اسے زخمی حالت میں ہسپتال پہنچایا گیا۔

ماہم شاید ایسے ہی کسی موقع کی منتظر تھی گھر سے ساری قیمتی اشیاء اٹھ لی کر کے ذیشان کو ساتھ لے کر بغیر شہوت یا نشانی چھوڑے ذیشان ولا کو خیر باد کہہ گئی۔ اب نہ اسے عالمگیر کی ضرورت تھی اور نہ ہی کسی اور چیز کی۔ جتنا کچھ وہ لوٹنا چاہتی تھی دونوں ہاتھوں سے لوٹ چکی تھی۔

لیکن اس نے پلی بھر کو بھی نہ سوچا کہ عورت کے لئے شوہر اور بیٹے کے لئے باپ کا نعم البدل کیا نہیں مل سکتا ہے۔

بہر حال جب ذیشان ولا نے ہسپتال والوں کو کوئی بھی جواب نہ ملا تو انہوں نے عالمگیر کی گاڑی میں بڑی فون ڈائری میں سے عالمگیر ولا کے فون نمبر لئے اور پیگم حسن آرا کا فون نمبر بلا دیا۔ اجنبی نمبر دیکھ کر حسن آرا پریشان تو ضرور ہوئی لیکن فوراً فون سنا اور دوسری طرف سے آنے والی خبر نے اس کے پاؤں تلے سے زمین کھینچ لی۔

اٹھارہ سال، کتنا لمبا عرصہ حیات ہے۔ پیدا ہونے والا بچہ جوانی کی دہلیز پار کرتا ہے۔ شعور کی حدوں کو چھوئے لگتا ہے۔ اچھے بُرے کی پہچان شروع کر دیتا ہے۔ اٹھارہ سال شوہر کی بے التفاتی کا کھٹوہ نہ کرنے والی حسن ہانو نے بڑی سی چادر سر پر ڈالی پرس میں ڈھیر ساری رقم رکھی اور ضعیف العصر ساس کے پاس گئی۔

”اماں جانی! میں ایک ضروری کام سے جا رہی ہوں ہو سکتا ہے دیر ہو جائے بچے گھر پر ہی ہیں آپ

ماتہ کی گئی تھیں۔ جب دل کی گھری سیاہ پتھروں کی اہٹ میں چلی جائے اور دماغ سوئے چاندی کے سکول کی چھین چھینتے ہوئے مفلوج ہو جائے تو جہاں طرف سے ایک ہی صدا سنائی دیتی ہے ”یہ ب لوگ تم سے جلتے ہیں حد کرتے ہیں۔“ اور عالمگیر خان نے ہانگ دالیں یہ اعلان کر دیا کہ میں اپنے بیٹے کو باہر بھیج دوں گا لیکن یہ وہ نہیں جانتا تھا کہ باہر کی دنیا کے حکمران کھولے اور کھرے کی زیادہ پہچان رکھتے ہیں۔ وہ یہاں کے بہترین واکلز اور انجیئرز کو تو خیر مقدم کرتے ہیں لیکن انہوں کو ضرور کی حیثیت سے بھی قبول نہیں کرتے۔

ماہم نے جس انداز سے دولت خراج کی تھی اور عالمگیر خان نے اپنے برٹس اور فیکٹریوں کو جس طرز سے نظر انداز کئے رکھا اس سے اس کے خزانے کا ایک حد تک خالی ہو چکے تھے اور ماہم نے بہت کچھ تو اپنے اکاؤنٹس میں ٹرانسفر بھی کر دیا تھا اور ابھی تو وہ اس کی ایسے نازک لمحے کی منتظر تھی جب وہ کوئی لمبا ہاتھ مار سکے اور گلاس فیکٹری کو ذیشان کے نام کر دے کیونکہ اسے یہی ڈر اور خطرہ تھا کہ عالمگیر کے دوسرے بچے جواب جہان ہو چکے ہیں کسی وقت اپنے حق کے لئے نہ اٹھ کھڑے ہوں۔ اور اس مفید کھل کرنے کیلئے وہ عالمگیر کی نیند کی گولیوں کی مقدار آہستہ آہستہ بڑھا رہی تھی اور وہ لمحہ بھی اسے چھل ہی گیا فیکٹری میں مزدوروں کی ہڑتال تھی۔ عالمگیر گھومنا تو کافی مشکل اور پریشان تھا۔

ماہم نے اسے نیند کی ایک گولی کی بجائے تین یا چار گولیاں دے کر سلا دیا اور جب وہ غنودگی کی حالت میں تھا تو اس سے جائیداد کی منتقلی کے کاغذات پر دستخط کروائے۔ وہ سکھ صاحب اس کے نمونہ بن چکے تھے۔ ہماری اصل دولت تو ایمان کو فروخت کر دینا ہے اور پھر اچھی خاصی رقم لی رہی ہو تو ایمان پہنچنا

لوگ پریشان نہیں ہوتا۔ اگر دیر ہو رہی ہوئی تو میں اطلاع کروں گی اللہ حافظ۔“

وہ جلدی سے باہر نکلی ڈرائیور نے فوراً گاڑی کھولی اور منزل کا نام سن کر گاڑی چلا دی۔ حسن یالو نے بوڑھی ساس کو پریشان کرنا مناسب نہیں سمجھا اور بچوں کو بھی کچھ نہیں بتایا۔ بتائی بھی تو کیا کہ وہ شخص جو تمہارا نام نہاد باپ ہے میں اس کو دیکھنے جارہی ہوں۔ بہر حال اس نے زندگی کے چند سال اس کے ساتھ آسودگی کے تو گزارے ہی تھے نا۔ اور اب بھی اسی صحت کے نیچے رہ رہی تھی جو اس کے نام کے ساتھ وابستہ تھی۔

ہسپتال پہنچ کر اسے علم ہوا کہ ذیشان دلا کے دونوں پاسوں میں سے کوئی بھی ابھی تک وہاں نہیں پہنچا اور عالمگیر کا کوئی بے حد مجیدہ آپریشن جاری ہے۔ جب وقت کافی گزر گیا تو اس نے بیٹے کو فون کرنا مناسب سمجھا کہ وہ ایک بہت ہی سلیکھا ہوا لڑکا تھا لیکن اب بھی اس نے اسے یہی بتایا کہ کسی عزیز کا آپریشن ہو رہا ہے اس لئے شاید دیر ہو جائے۔ شاہ جہاں نے کہا بھی کہ ماما میں آپ کے پاس آ جاتا ہوں اس نے جواباً اسے مطمئن کر دیا کہ بیٹا ڈرائیور میرے ساتھ ہے لگتی کوئی بات نہیں۔

آپریشن ختم ہوا تو ڈاکٹر نے اسے بتایا کہ مریض کی حالت انشاء اللہ کچھ ٹھنوں کے بعد بہتر ہو جائے گی چونکہ بہت آئی ہیں لیکن جو کچھ ہم کر سکتے ہیں ہم نے اپنے طور پر کر دیا ہے اور اب خون بہتا بھی رُک چکا ہے۔ آپ دُعا کریں انہیں انتہائی نگہداشت میں رکھا گیا ہے۔ آپ انہیں باہر سے دیکھ سکتی ہیں فی الحال اندر جانے کی اجازت نہیں۔

حسن یالو سرتا یا دعائی اپنے سر تاج کے لئے رب کے حضور جھک گئی۔ اس عالمگیر کے لئے جو اٹھارہ سال سے اس سب کو پاؤں کی ٹوٹی جوتی کی

طرح اُتار کر پھینک چکا تھا۔ لیکن حسن آرا کو یقین تھا کہ صبح کا بھولا اگر شام کو گھر آ جائے تو اس کو بھولا نہیں کہتے۔

عالمگیر خان نے اپنے آپ کو حسن یالو اور حسین اختر سے جب بلا وجہ کی ضد میں کات کر علیحدہ کر لیا تو اس نے اپنی مشقی کو ڈوبنے کا انتظام کر ہی لیا۔ عالم فرماتے ہیں کہ اگر ایک مشق میں چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ڈالتے جائیں تو ایک دن وہ مشقی اتنی بوجھ ہو جائے گی کہ اس کا ڈوب جانا یقینی ہوگا۔ یہی حال ماما ہوں کا ہے۔ عالمگیر خان نے ماہم بیٹی کا ل گزل کو شربک حیات بنا کر ایک بیٹا بھی پالیا لیکن یہ عورت ہی دراصل اس کی روحانی موت کا باعث بنی گئی۔ جانے حسین اختر اور حسن یالو کی دعاؤں کا کتنا بڑا حصار تھا جو اسے ڈوبنے سے بچا رہا تھا۔ جو اس کی نیا کو شکر گزاری کے نکاروں پر لا رہا تھا۔ ہر قسم کے واجبات کی ادائیگی کے بعد اور کچھ وقت گزرنے کے بعد جب حسن یالو کو بہتری کی اطلاع ملی تو اس نے گھر جانا مناسب سمجھا اور وہاں پہنچ کر سب سے پہلے اپنی ساس کی خدمت میں حاضر ہوئی۔

”اماں جانی! آپ کے لئے ایک خوشخبری یہ ہے کہ آپ کا کم کردہ راہ مینا لوٹ آنے والا ہے۔

”کہاں ہے وہ؟“ منا کی ماری ماں اٹھ کر بیٹھ گئی۔ دراصل وہ ضعیف العمر تو نہیں تھی مگر بے حدانی نے جیسے اس کی کمری توڑ ڈالی تھی۔ حسن یالو نے ساری بات تفصیل سے بتائی اور یہ بھی کہ ان کی حالت اب خطرے سے باہر ہے اور وہ یقیناً اب یہیں آئیں گے۔ کیونکہ ماہم اپنے بیٹے کے ہمراہ بہت سارے مادی وسائل سمیٹ کر گئیں چلی گئی ہے۔

”خس کم جہاں پاک“ بے ساختہ حسین اختر کی زبان سے نکلا اور حسن یالو بچوں کی طرف چلی گئی۔

سیرۃ ڈائجسٹ کی ایک اور بے مثال پیشکش

اتنا کر قیامت نمبر

شائع ہو گیا ہے

تقریباً 175 روپے

”علامات قیامت“ قرآن کریم اور صحیح احادیث رسول کی روشنی میں
 واقعہ شق القمر..... سونے کا پہاڑ..... دمدار ستارے..... لشکر سفیانی کو
 شکست..... ظہور امام مہدی اور امام مہدی کی جنگیں..... قوم لوط.....
 قوم عاد..... ہیکل سلیمانی کی تعمیر نو..... فراموش کردہ شہر ریت کا سمندر
 فتنہ دجال..... پیغمبروں کی سر زمین عراق پر صلیبی امریکی حملہ جیسی
 قیامت کی نشانیوں پر مکمل تفصیلات!

گوانتا نامو بے میں عیسائیوں کے ہاتھوں قرآن مجید کی بے حرمتی اور
 عالم اسلام کی خاموشی سے قیامت کا تعلق

یہ ایک علمی تاریخی تحقیقی اور دلچسپ دستاویز ہے جس کے بغیر آپ کی لائبریری نامکمل ہے

سیرۃ ڈائجسٹ 240 ریزا کا فون لاہور فون 042-37245412

عالمگیر خان کی تربیت میں کہاں خطا ہوئی کہ ماں کے علاوہ بیوی بچے بھی دکھ کی بجھتی میں ڈال دیئے گئے۔ دراصل رب العزت بسا اوقات اپنے بندوں کو آزمائش میں ڈال دیتا ہے۔ یہ آزمائش اللہ اپنے نیک بندوں پر ڈال کر ان سے مجاہدہ کرواتا ہے عبادات کی کمی کو پورا کرواتا ہے کہ یہ سب ان کے ترقی درجات کے لئے ضروری تھا۔ بعض منازل قرب سے گزار کر ہی وہ بندہ اس منصب جلیلہ پر فائز ہوتا ہے جو اس کے رب نے اس کے لئے خاص کر رکھا ہے کہ نہ اس نے شکوہ کیا نہ شکایت کی بلکہ پورے سکون اور یقین کے ساتھ برابر رحمت رب کا طلب گار بننا۔ اس کے سامنے دست سوال دراز کئے کھڑا رہا اور پھر وہ دررحمت کھل بھی گیا۔

اور پھر پورے وقار و تدبر اور حسن اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہوئے حسن باتوں نے اپنے شرمندہ شوہر کی نگاہیں اذہر کروائیں وہ جو تائب ہو کر رب رحیم و کریم سے غفور و درگزر اور ان کی پناہ پا چکا تھا جسے رب نے دوسری زندگی دے کر بہتری کی راہوں کا مسافر بنادیا تھا، حسن باتوں انسان ہوتے ہوئے تکبر نہیں کر سکتی تھی کہ سرزدش کرنے بیٹھ جاتی۔

اور پھر تین چار سال کے مختصر عرصے میں انہوں نے مل کر بہت ہی اچھی طرح سے اپنی بیٹیوں کو رخصت کیا۔ ان دعاؤں کے ساتھ اور ان نصیحتوں کے ساتھ کہ ایمان کی چنگی اور کردار کی بلندی ہمیشہ کامیاب رہتی ہے اور سر کو بلند رکھنے کا حوصلہ بھی عطا کرتی ہے اور وہ جن کی رگ رگ میں محبتوں کی چاشنی اور محمود و درگزر کی روشنی بھری گئی ہو۔ وہ خود بھی دلوں کی دنیا میں محبتوں کے اچالے بھر دیئے ہیں اور پھر رب کی رحمتوں کے در کھلتے چلے جاتے ہیں۔

یقیناً اس نے اپنے بچوں کے دلوں میں والد کے خلاف کبھی کوئی غلط خیالات نہیں ڈالے تھے جن کو رب کی ذات پر مکمل اعتماد ہوتا ہے وہ راستے کی رکاوٹوں کی پروا نہیں کرتے اور اس ذات عالی صفات سے مانگتے چلے جاتے ہیں اس کے دروازے پر دستک دیتے ہی رہتے ہیں۔ اس یقین کے ساتھ کہ دررحمت ضرور کوا دیا جائے گا۔ تیوں بچوں کا اشتیاق قابل دید تھا۔ ساری بات سن لینے کے بعد وہ سب ہسپتال جانے کے خواہش مند تھے۔ حسن آراء نے ان سے حلیفہ بیان لئے کہ وہ کبھی اپنے والد کو ناشکی یا بدلا کر شرمندہ نہیں کریں گے اور اس رب کا شکر ادا کرتے ہوئے انہیں خوش دلی سے خوش آمدید کہیں گے۔ وہ رب جو اپنے بندوں کو برداشت سے زیادہ دکھائی نہیں دیتا مگر اوقات سے زیادہ سکھ اور خوشیوں سے لوازمات رہتا ہے کیونکہ سچے رشتوں کو سنبھالنا نہیں پڑتا۔ بس محبتوں کی گرہیں لگا لگا کر مضبوط ضرور کرنا پڑتا ہے اور یہی سمجھوتے بندوں کو تاراجی و دستاویز بنا دیتے ہیں۔

اور یقیناً یہ تاریخی دستاویز ہی تھی جو حسن آراء نے مرتب کر دی۔ ماں تو ماں تھی بیٹے کی ساری غلطیاں معاف کر کے اس نے بیٹے کی پیشانی پر مہر محبت ثبت کر دی۔ لیکن حسن آراء اور بچوں نے رشتے کی نزاکت کو کسی بھی غلط فہمی کی سیاحتی میں دفن نہیں ہونے دیا کہ اپنی بیٹیوں کے اعتماد کی ردا اوڑھا کر انہوں نے عالمگیر خان کو پورے احترام کے ساتھ عالمگیر ولا میں خوش آمدید کہا اور یوں جہاں عالمگیر کو شرمندہ ہونے سے بچایا وہیں ایک بار پھر ایک خوش حال گھرانے کی نشا بھی بحال کر دی گئی اور عالمگیر خان کو توبہ استغفار کے مواقع بھی فراہم کر دیئے گئے۔ ایک احساس جو تحسین اختری بھی نیک خاتون کو اندر ہی اندر دیکھ کی طرح چاٹ رہا تھا وہ یہ تھا کہ

گم ماہیں

اسب توقع کی طرف سے کتے کے بھونکنے یا غرانے کی آواز نہیں سنائی دی تاہم آگے بڑھنے سے پہلے اس نے ایک بار پھر سوچا کہ اسے یہ کام مکمل کرنا چاہیے یا واپس لوٹ جانا چاہیے۔ کچھ منٹ سوچنے کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ غریب سے کیا ہوا وعدہ ضرور پورا کرے گا لیکن اس آخری کام کے بعد۔

ایک شاطر کی کہانی جو زندگی کی آخری بازی ہار گیا تھا

جاوید راہی

اس کے پاس تجربات کا خزانہ تھا۔

آخر کار اس نے اس خزانے میں سے کچھ حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کیلئے اس کے پاس بہت سے ذرائع اور بہت سے کردار تھے۔ اکثر ہی تلاش رہتا تھا نوکری ملتی تھی چھوٹ جاتی تھی۔ کرایہ نہ دینے پر مالک

بازاروں بار یہ بات کہی گئی ہے لکھی گئی ہے کہ انسان فطری طور پر بڑا نہیں ہوتا وقت و معاملات اور حالات اس کی اپنی کوئی شخصیت نہیں رہنے دیتے۔ یہی کیفیت جمال الدین کی تھی۔ اٹھارہ سال کی عمر سے تیس سال کی عمر تک وہ بڑا نہیں تھا۔ عزت کی روٹی اور سر جھانے کا

”دینی میں آپ کا کیا کاروبار ہے؟“ اقرار احمد نے پوچھا۔

”بس گھر سے نکلنے کے بعد کچھ نہ کچھ کرنا پڑتا ہے۔ آپ فرمائیے میں کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“ جلال الدین نے گول مول سی بات کی۔

”میں ایک مشکل میں پھنس گیا ہوں۔ آپ کو علم ہے کہ عرب ریاستوں میں کاروبار کیلئے کسی مقامی آدمی کو اپنا سر بنانا پڑتا ہے جو مفت میں حصہ وصول کرتا ہے۔ بس میں بھی اسی الجھن کا شکار ہوں۔ میں بڑے ہنگامی حالات میں یہاں آیا ہوں۔ اس لئے وہاں معقول انتظامات کر کے نہیں آیا اور وہاں میرے پارٹنر کو اس کی مطلوبہ رقم نہیں مل سکی۔ آپ سمجھ رہے ہیں نا۔“

”جی۔ جی جلال الدین کی سمجھ میں ابھی تک تو کچھ نہیں آیا تھا۔“

”وہاں میرے پارٹنر نے اپنی رقم کیلئے ہنگامہ مچا رکھا ہے۔“

”اوہ“

”یہ لوگ جنہیں میں نے آپ کے ساتھ دیکھا ہے ارب پتی لوگ ہیں۔ یہ آپ کے دوست ہیں ان میں سے ایک کا تو دینی میں بہت بڑا برنس ہے۔ میں جانتا ہوں۔“

”بی بالکل۔“ جلال الدین نے کہا۔

”میرا نیچر سخت پریشان ہے اور بار بار مجھے فون کر رہا ہے میں وہاں دینی میں فوری طور پر دو لاکھ ریال بھیجتا چاہتا ہوں اگر مطلوبہ وقت پر رقم دینی نہ پہنچی تو میں سخت نقصان سے دوچار ہو سکتا ہوں۔“ اقرار احمد نے کہا۔

”میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟“ جلال الدین نے کہا۔

”میرے پاس یہ رقم پاکستانی کرنسی میں موجود ہے۔“ اقرار احمد نے اپنا بریف کیس سامنے کرتے

میں برائی جاگي لیکن اس نے اسے تھک تھک کر سلا دیا۔ لیکن وقت کہہ رہا تھا کہ کچھ تو ہو۔ ایک ہوٹل میں ان تینوں سے اس کا تعارف ہوا۔ ان میں ایک بدرالدین تھا جو ٹھیکیدار تھا دوسرا ایک سرکاری انفریٹیرا بھی اسی حیثیت کا بندہ تھا۔ جلال الدین خود بھی ان سے بڑی حیثیت کا مالک رہا تھا۔ ان تینوں نے اسے اپنے ساتھ کھانے میں شریک کیا تھا لیکن اس ملاقات کے دوران جلال الدین نے خاص طور پر اس شخص کو نوٹ کیا جو ان کی نگرانی کر رہا تھا۔ جلال الدین نے اس ملاقات میں تینوں کو خوب متاثر کیا۔ واپسی پر بدر الدین نے اسے اپنی شاندار گاڑی میں اس کی مطلوبہ جگہ چھوڑا۔ بدرالدین کی گاڑی چلی گئی تو جلال الدین نے اس شخص کو اپنی طرف جھپٹے دیکھا جو ہوٹل میں ان کی نگرانی کر رہا تھا۔ وہ جلال الدین کے قریب پہنچ کر بولا۔

”معاف کیجئے۔ آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔“

”میں نے کچھ دیر پہلے آپ کو ہوٹل میں دیکھا تھا نجانے کیوں مجھے آپ کی صورت آشنا لگی تھی۔“ جلال الدین اب اپنے آپ کو آزار مانا چاہتا تھا۔ دنیا اسی طرح قابو میں آتی ہے۔

”زندہ باد شکر ہے۔ میں نے آپ کو فوراً پہچان لیا تھا دینی میں میری دکان ہے۔ آپ اکثر وہاں آتے تھے۔“

”کمال ہے آپ نے مجھے خوب پہچانا۔“

”آپ کی شخصیت ہی ایسی ہے کہ کوئی بھول نہیں سکتا۔ مجھے کچھ وقت دیجئے‘ خوشی ہوگی ویسے میرا نام اقرار احمد ہے۔“

دونوں تھیل رہے تھے۔ دراصل اقرار احمد نے جلال الدین کو کچھ دولت مند لوگوں کے ساتھ دیکھا تھا اور وہ اسے شے میں اتار رہا تھا۔ جلال الدین کو اس بات کا اندازہ ہو گیا تھا۔ اب دونوں کو اعلیٰ پیمانے پر ایک دوسرے سے جھوٹ بولنا تھا۔

ہوئے کہا۔ ”اگر آپ اپنے دینی آفس کال کر کے اپنے متعلقہ منیجر کو حکم دے دیں کہ یہ رقم میرے آدمی کو پہنچا دیں تو میں سمجھ لیں کہ مجھے نئی زندگی مل جائے گی۔“

جلال الدین کے پورے بدن نے پسینہ چھوڑ دیا۔ دو لاکھ ریال کی پاکستانی کرنسی میں کتنی سی پی پی تھی اسے عجیب طور پر اندازہ بھی نہیں تھا۔ اقرار احمد نے بریف کیس کھول کر سامنے کر دیا۔ پانچ پانچ ہزار کے نوٹوں کی گڈیاں سی خیر نظر آ رہی تھیں۔

اس نے خود کو متنبہ کر کہا۔ ”ٹھیک ہے میں آپ کا کام مکمل کر دیتا ہوں۔“

اس کے بعد بقیہ کاروائی اس نے بڑی ذہانت سے کی تھی۔ اقرار احمد نے اپنی دانت میں اسے جعلی نوٹ دے کر اسے دو لاکھ ریال کی چوٹ دی تھی۔ نوٹوں کی گڈیاں پورا پورے نیچے لگے ہوئے نوٹ اصل تھے یا نقلی۔ لیکن وہ بھی پچیس ہزار بنتے تھے۔ جس کمپنی کو جلال الدین نے دینی کال کر کے یہ رقم ادا کرنے کی ہدایت کی تھی اس کا دنیا میں کوئی وجود نہیں تھا۔ مات اقرار احمد نے ہی کھائی تھی لیکن جلال الدین کو راستہ نظر آیا تھا۔

اس نے جرم کے راستے نہیں اپنائے تھے لیکن عقلی جرائم کی طرف قدم بڑھا کر ان کی ایسے کام کئے تھے جن سے اس کی مالی حالت بہتر سے بہتر ہوتی چلی گئی۔ اس نے ایسے جرائم پیشہ لوگوں کو اپنا شکار بنایا جو دوسروں کے ساتھ فراڈ کر کے ان کی رقمیں کھا جاتے تھے۔ وہ ان سے مختلف انداز میں اپنا حصہ وصول کرتا تھا۔ کبھی پولیس افسر بن کر کبھی بلیک میل بن کر۔ اس طرح وہ عالمی بہتر حالت میں آگیا۔ ایک اچھے گھر کو کرائے پر مائل کرنے کے ساتھ ساتھ اس نے ایک پرانی کار بھی خرید لی تھی اور پھر اسے عریض لگئی۔ ایک کروڑ پتی باپ کی بیٹی کے ساتھ راہ و رسم بڑھا کر اس سے شادی

کرنے کا تصور بڑا سنہرا تھا۔ عریضے رائے بلند اقبال کی بیٹی تھی اور بلند اقبال صرف بلند اقبال ہی نہیں تھے بلکہ ان کی دولت بھی بہت بلند تھی۔ جلال الدین کو یہاں اپنی تمام صلاحیتیں جمع کرنی پڑیں اور اس نے دوسرے تمام شغل ترک کر کے ان باپ بیٹی پر وقت صرف کرنا شروع کر دیا۔

آہستہ آہستہ اسے بلند اقبال کے بارے میں تفصیلات معلوم ہونے لگیں۔ جن میں کچھ تفصیلات بڑی حیرت انگیز تھیں مثلاً بلند اقبال نے قانون کی اعلیٰ ترین تعلیم حاصل کی تھی لیکن کبھی پریکٹس نہیں کی تھی بلکہ کاروبار پر توجہ دی تھی اور قانون کا بے حد احترام کیا تھا۔

جلال الدین نے ان کے گھر تک رسائی حاصل کر لی۔ اب وہ اکثر انکے گھر چلا جاتا تھا۔ کبھی کبھی تو ایسا ہوتا کہ عریضہ پر نہ ہوتی اور وہ صرف بلند اقبال کو مل کر چلا آتا۔ دراصل اس میں بھی اس کی گہری چال تھی۔ وہ بلند اقبال پر ہاتھ ڈال رہا تھا تاکہ بیٹی تک رسائی میں آسانی ہو۔

ایک روز بلند اقبال نے جلال الدین سے کہا: ”میں نے تمہارے بارے میں جو سوچا تھا تم اس پر پورے اترے ہو۔ میں ایک اہم ترین کام تمہارے سپرد کرنا چاہتا ہوں اور تم پر اندھا اعتماد دکنے لگا ہوں۔“

”یہ میری خوش بختی ہے۔“ جلال الدین نے اپنے جوش پر قابو رکھتے ہوئے کہا۔

”تم نے شاہ نگر دیکھا ہوا ہے؟“

”جی سر۔ میرے ملک کا بڑا شہر ہے۔“

”تمہیں میرے ایک اہم کام سے وہاں جانا ہوگا۔ کیا تم اس سے انکار کر دو گے؟“

”جی نہیں سر۔“

”چیتے رہو۔ مجھے یقین تھا۔ وہاں تمہیں راجہ

سیارہ ذابجٹ / اپریل ۲۰۱۶ء

سے ملنا ہوگا۔ راجہ سلطان وہاں کی ایک بڑی شخصیت ہے اور میرا بزنس پارٹنر بھی ہے۔ تم ایک اہم ترین دستاویز لے کر وہاں جاؤ گے جو تمہیں اس کے سپرد کرنی ہے۔ میں تمہاری آبادگی کے بعد فوراً شاہ نگر کیلئے تمہاری سیٹ کب کرادوں گا۔ یہ فلائٹ ساڑھے چار بجے روانہ ہوگی۔

”آپ کا حکم سر آنگھوں پر۔ میں انکار کیسے کر سکتا ہوں۔“ جلال الدین نے نیاز مندی سے کہا اور بلند اقبال بہت خوش نظر آنے لگا۔ پھر اس نے ایک لفافہ جلال الدین کو دیا جو بیل بندھا لیکن اس پر ایک چھوٹی سی تحریر تھی۔ ”یہ لفافہ اتوار کے دن نمک بارہ بجے دوپہر مسٹر جلال الدین راجہ سلطان کی موجودگی میں کھولیں۔“ جلال الدین کو حیرت ہوئی اس نے کہا۔

”یہ تحریر میرے لئے ہے۔“
”سو فیصدی۔ تمہارے اور راجہ سلطان کیلئے۔“
”لیکن۔۔۔۔۔۔“

”میں میری جان۔ یہ لیکن پھر مجھے القاف زندگی میں بڑی مشکلات پیدا کر دیتے ہیں۔ ان کے چکر میں نہ پڑو۔ تم آج ساڑھے چار بجے کی فلائٹ سے شاہ نگر پہنچ جاؤ گے اور وہاں کسی اچھے ہوٹل میں قیام کرو گے۔ کل ہفتہ ہے پرسوں اتوار کے دن تم راجہ سلطان سے ملو گے۔ یہ سب کچھ ایک بڑے مسئلے کا حصہ ہے اور میں نے بڑے اعتماد کے ساتھ تمہیں اس راز میں شریک کیا ہے۔ اس امید کے ساتھ کہ تم میرے معیار پر پورا اتر دو گے اور ہمارے ساتھی بن جاؤ گے۔“

”جی ٹھیک ہے۔“
”تمہارے جانے کے بعد مجھے بھی سنگ پور روانہ ہو جانا ہے۔“
”آج ہی“ جلال الدین حیرت سے بولا۔
”ہاں۔ تم سے پہلے۔ جب تم انیر پورٹ پر پہنچو

گے تو میری فلائٹ جا چکی ہوگی۔ میرا آدمی تمہیں تمہارا ٹکٹ اور دوسری چیزیں انیر پورٹ پر تمہارے حوالے کر دے گا۔ اوکے میں چلتا ہوں۔“ بلند اقبال نے اٹھتے ہوئے کہا۔ جلال الدین کو بادل ناخواستہ باہر نکلتا پڑا۔

اپنی دانست میں جلال الدین عریضہ پر ڈورے ڈال کر بلڈر اقبال کا داماد بننا چاہتا تھا لیکن یہ تو کام ہی دوسرا شروع ہو گیا تھا۔

شاہ نگر کے موسم کے بارے میں اسے معلوم تھا کہ بہت سرد ہوتا ہے۔ اس لئے اس نے اس مناسبت سے لباس منتخب کئے۔ انیر پورٹ پر اسے جو جس ملا اسے جلال الدین نے پہلے بھی نہیں دیکھا تھا لیکن وہ سیدھا اس کی طرف آیا اور مسکرا کر بولا۔ ”میں بہت دیر سے آپ کا انتظار کر رہا تھا۔ جلال الدین صاحب اگر آپ جلدی آجاتے تو میں آپ کو ایک کب کافی کی پیشکش ضرور کرتا اور ہم کچھ دیر بیٹھ کر باتیں کرتے لیکن اب وقت کم ہے۔ آپ یہ چیزیں سنبھال لے اور اس کے بعد۔۔۔۔۔۔ اس نے مسکرا کر جملہ اوجھڑ دیا۔

ٹکٹ، کرنسی اور کچھ دوسری چیزیں جلال الدین کے حوالے کر کے اس نے اسے الوداع کیا اور واپسی کیلئے مڑ گیا۔ کافی مہذب آدمی تھا لیکن جلال الدین نے اسے اپنے ذہن پر سوار نہیں کیا اور پوری توجہ سے اپنے آگے کے کام میں مصروف ہو گیا۔

جہاز کے سفر کے دوران وہ سوچ رہا تھا کہ آخر کار اسے مطلوبہ راستے ملتے چارہ ہے ہیں۔ لیکن احتیاط ضروری ہے پھر جہاز شاہ نگر انیر پورٹ پر اتر گیا۔ لیکن جہاز سے باہر نکلنے ہی سے کچھ کا احساس ہوا۔ سردی اپنی آخری حدوں کو چھو رہی تھی۔ اس نے قتل سے کام لیا تھا۔ انیر پورٹ آنے والے شخص نے دوسری چیزوں کے ساتھ ایک کاغذ پر اسے شاہ نگر کے ہوٹلوں کے کچھ نام بھی دیئے تھے جن میں مکھ نام جانے پہچانے تھے۔

سیارہ ذابجٹ / اپریل ۲۰۱۶ء

پوری طرح جلال الدین کو جان بھی نہیں پایا تھا کہ وہ چیز کیا ہے؟ کیوں۔ اس نے یہ کیوں کیا؟ پھر وہ پراسرار لفافہ۔ اس نے اس پراسرار لفافے کو نکال لیا اور اس کا ہر طرف سے جائزہ لینے لگا۔ کوئی ایسی جگہ نہیں تھی جہاں سے لفافے کو کھول کر دیکھا جاسکے۔ وہ پوری طرح سیل بند تھا۔

اس کا ذہن برق رفتاری سے کام کرتا رہا پھر کسی خیال کے تحت اس نے ویٹر کو بلانے کیلئے تیل بجائی اور چند لمحوں کے بعد دروازے پر دستک ہوئی۔

”ایک عمدہ سا رائیٹنگ پیڈ اور قلم لے آؤ۔“ اس نے ویٹر کو رقم دیتے ہوئے کہا اور وہ گردن جھکا کر چلا گیا۔ ویٹر نے اسے مطلوبہ اشیاء لا کر دیدیں۔ رات کو بہت دیر تک رائیٹنگ پیڈ پر کچھ لکھتا رہا پھر گہری نیند سو گیا۔

راجہ سلطان کا آفس بے حد شاندار تھا لیکن اس کی اپنی شخصیت اس آفس کے برعکس تھی۔ سیدھا سادا منکسر المزاج انسان تھا۔ جلال الدین کبھی یقین نہ کرتا کہ اس شاندار آفس کا مالک یہ شخص ہے لیکن طویل و عریض میز پر مختلف ڈیزائنوں کے جدید ترین وائریس فون رکھے ہوئے تھے پیچھے رکھی انتہائی قیمتی کرسی پر بیٹھنے شخص کو دیکھ کر یقین کرنا پڑا کہ وہی راجہ سلطان ہے۔ جلال الدین بڑی شان سے اس آفس میں داخل ہوا تو راجہ سلطان اپنی کرسی سے کھڑا ہو گیا۔

”آئیے چناب۔ آئیے تشریف رکھیں۔“ اس نے سامنے رکھی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ ”مجھے آپ کے آنے کی اطلاع ملی تھی۔“

”یہ لفافہ رائے بلند اقبال کی طرف سے ہوئے کہا۔“

”جی۔ جی۔ اسے کھولیں۔“ راجہ سلطان نے بے چینی سے کہا۔

ایک عرصے کے بعد اس نے اسے اپنی ٹیکسی پر چلنے کی پیشکش کی اور فوراً اُتار دیا۔

”ہیٹ اس نے ٹیکسی میں بیٹھ کر کہا۔“

”جی سر۔“ مسند ڈرائیور نے ٹیکسی اشارت کر کے آگے بڑھا دی۔

چند لمحوں کے بعد خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتا رہا پھر اس نے کپڑائی آواز میں کہا۔ ”ڈرائیور!۔۔۔۔۔۔“

”جی سر۔“

”گازی میں بیٹھ نہیں ہے؟“

”نہیں سر۔“ آج کل گاڑیوں میں میٹر کہاں لگتے ہیں۔“

”میں میٹر نہیں دیکھ سکتا بات کر رہا ہوں۔ میٹر جو گاڑیوں کو اندر سے گرم کر دیتے ہیں۔“

”اگر میں نہیں صاحب جی۔ یہ پرانی گاڑیاں ہیں۔ ان میں انجن ہی ہوتے ہیں یہ بڑی بات ہے۔“

”گازی میں بیٹھ نہیں لگتا ان میں۔“

”میں سردی میں بیٹھ کر باتیں کرتے لیکن اب وقت کم ہے۔ آپ یہ چیزیں سنبھال لے اور اس کے بعد۔۔۔۔۔۔ اس نے مسکرا کر جملہ اوجھڑ دیا۔

ٹکٹ، کرنسی اور کچھ دوسری چیزیں جلال الدین کے حوالے کر کے اس نے اسے الوداع کیا اور واپسی کیلئے مڑ گیا۔ کافی مہذب آدمی تھا لیکن جلال الدین نے اسے اپنے ذہن پر سوار نہیں کیا اور پوری توجہ سے اپنے آگے کے کام میں مصروف ہو گیا۔

جہاز کے سفر کے دوران وہ سوچ رہا تھا کہ آخر کار اسے مطلوبہ راستے ملتے چارہ ہے ہیں۔ لیکن احتیاط ضروری ہے پھر جہاز شاہ نگر انیر پورٹ پر اتر گیا۔ لیکن جہاز سے باہر نکلنے ہی سے کچھ کا احساس ہوا۔ سردی اپنی آخری حدوں کو چھو رہی تھی۔ اس نے قتل سے کام لیا تھا۔ انیر پورٹ آنے والے شخص نے دوسری چیزوں کے ساتھ ایک کاغذ پر اسے شاہ نگر کے ہوٹلوں کے کچھ نام بھی دیئے تھے جن میں مکھ نام جانے پہچانے تھے۔

سیارہ ذابجٹ / اپریل ۲۰۱۶ء

دوسرے خط میں راجہ سلطان کو ہدایت کر دی گئی ہے کہ وہ آپ کے ساتھ خاطر خواہ سلوک کریں اور آپ کو ایک پیسہ بھی نہ دیں۔

میں نے غلط تو نہیں کہا۔ آپ اپنی اور میری حیثیت دیکھیں آپ کی اوقات میرے گیٹ کے چڑاؤ سے زیادہ نہیں ہے اور آپ نے میری قربت کے خواب دیکھے تھے۔ افسوس۔ خیر آئندہ خیال رکھئے اور اپنی اوقات کو نظر انداز نہ کیجئے۔“

عریشہ اقبال۔

جلال الدین نے خط پڑھا۔ سارے طبق روشن ہو گئے تھے لیکن ایک بڑی کار آمد بات تھی۔ وہ بے حد ڈر پوک اور بات بات پر خوف زدہ ہو جانے والوں میں سے تھا لیکن جب اس نے کرباجی تھی اور یہ سوچا تھا کہ اب اسے ہر طرح کے حالات کا سامنا کرنا پڑے گا اس نے اپنے اعصاب کو مضبوط کیا تھا اور رفتہ رفتہ اس میں پختہ ہوتا چلا گیا تھا۔ اس کی ذاتی قوتیں بڑھ چکی تھیں۔ چنانچہ اس نے پرسکون انداز میں پرچہ تہہ کر کے رکھا اور دوسرا پرچہ کھول لیا۔ اس میں لکھا تھا راجہ بلند اقبال کی طرف سے راجہ سلطان کیلئے۔

”پیارے راجہ سلطان۔“

اس نوجوان کے بارے میں تفصیل سے تو ہمیں ملاقات پر ہی بتاؤں گا مگر ابھی حال تم اس کیلئے اتنا کہ وہ اسے ٹرین کا تھروڈ کلاس کا ٹکٹ دلو کہ شاہ نگر سے بھگا دو۔ میں اس وقت سٹگ پور جا رہا ہوں وہاں سے واپسی پر تمہیں فون کروں گا۔

راجہ بلند اقبال۔

فلتھا وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑا اور راجہ سلطان اچھل پڑا۔

”کیا لکھا ہے؟“ اس نے اشتیاق سے پوچھا۔

”پہلے پرچہ پر تو آپ کی مکملی ہنسی لکھی ہے کہ ان کے آپ کے درمیان کس طرح کے تعلقات

سیارہ ذابجٹ / اپریل ۲۰۱۶ء

لحوں کے بعد امان خان آگیا۔ یہ غالباً فرم کا کیشیر تھا۔ امان خان پچیس لاکھ کیش بڑے نوٹوں کی صل میں لے آؤ۔ کیش ہے؟“

”جی سر موجود ہے۔“

”دوسری مضبوط لفافے میں لے آؤ۔“

”جی سر۔“ امان خان باہر نکل گیا۔ اتنی دیر میں کافی آگئی۔ کافی کا آخری گھونٹ ختم ہوا تھا کہ پانچ پانچ ہزار کے نوٹوں کی پانچ گنڈیاں لفافے میں پیک ہو کر اندر پہنچ گئیں۔ جلال الدین نے نوٹ سنہال کر بیک میں رکھتے ہوئے راجہ سلطان کا شکر یہ ادا کیا۔

”دونوں چیزوں کا شکر یہ۔ راجہ صاحب آپ بہت اچھے انسان ہیں۔ میں دوبارہ آپ سے ملاقات ضرور کروں گا۔“ یہ کہہ کر وہ باہر نکل آیا تھا۔

نوسر بازی میں ہوشیاری ہی کارآمد ہوتی ہے ورنہ کچھ نہیں کیا جاسکتا۔ حالانکہ جلال الدین کے فرشتوں کو بھی یہ شبہ نہیں ہوا تھا کہ رائے صاحب اتنے کاویاں نکلیں گے۔ اور اُن کی بیٹی عریض بھولی بھالی صورت والی جلاد۔ بظاہر اس نے جلال الدین سے متاثر ہونے کا ڈھونڈ رکھا تھا لیکن اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ جلال الدین اس پر صرف اپنے مغلوبہ کیلئے ڈورے ڈال رہا ہے۔

ہوش کی طرف رخ کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ سیدھا ریلوے اسٹیشن پہنچا۔ ایک گاڑی روانگی کیلئے تیار تھی۔ تھوڑے لمحوں کا ٹکٹ لیا اور ڈبے میں گھس کر بیٹھ گیا۔

پچیس لاکھ کی گری سینے کے قریب موجود تھی۔ پچیس لاکھ پر اپنے شہر یا گھر واپسی کا تصور بھی خطرناک فوری طور پر اپنے کچھ وقت کسی پر نفعا مقام پر گزارا تھا۔ اس نے سوچا کچھ وقت کسی پر نفعا مقام پر گزارا جائے پھر دیکھیں گے آگے کیا ہوتا ہے۔ ریل چل پڑی اور اس کے ذہن میں یہ نئی کہانی چل پڑی۔ جن کے پاس دولت ہوتی ہے وہ بیوقوف نہیں ہوتے۔ بلند

ہیں اور کس طرح ہوتے ہیں۔ گویا آپ کی مکمل تفصیل ہے جن انہوں نے یہ نہیں لکھا کہ آپ اس قدر کنبوں ہیں۔“

”نہیں؟“ راجہ سلطان نے حیرت سے کہا۔

”ہاں۔ اس قدر سردی ہو رہی ہے لیکن آپ نے نہ پائے کیلئے اور نہ کالی کیلئے پوچھا ہے۔“

جلال الدین نے کام دکھا دیا۔ اس کی جیب سے وہ دوسرا پرچہ نکل آیا جو اس نے دیش سے کاغذ قلم منگا کر خود لکھا تھا۔ یہ اس کے پیشہ وارانہ فن کا کارنامہ تھا اور نہایت کامیاب تھا۔ اس نے خط پڑھا۔

ذخیرہ راجہ سلطان۔ سلام

حال رتھ کو ایک نہایت اہم مشن پر روانہ کر رہا ہوں۔ صورتحال کچھ ایسی ہے کہ میں اسے تو اپنے پاس سے کیش دے سکتا ہوں اور نہ اسے چیک الیشو کر سکتا ہوں جلدی بھی بہت ہے کیونکہ میں سٹگ پور جا رہا ہوں تم فوری طور پر اسے پچیس لاکھ کی رقم فراہم کر دو۔ ہم بعد میں حساب کر لیں گے۔ والسلام۔ بلند اقبال۔

جلال الدین نے پرچہ پڑھ کر راجہ سلطان کو دیکھا۔ راجہ سلطان مطمئن تھا۔ جلال الدین نے کہا۔

”بہت سے کام سونپ دیئے ہیں بلند اقبال صاحب نے مجھے۔ آپ سے رخصت ہو کر دارالحکومت جاؤں گا وہاں میرے لئے تھائی لینڈ کی فلائٹ تیار ہو گی جہاں پہنچ کر صرف ایک دن گزارنا ہوگا پھر سٹگ پور۔“

”جی جی۔“ راجہ سلطان نے دوبارہ ہنسنی بجائی اور آؤلی حاضر ہو گیا۔ ”کافی نہیں آئی ابھی تک۔“

”نہیں آئی ہے سر۔“

”امان خان کو بلاؤ۔“ راجہ سلطان نے کہا۔ کچھ

سیارہ ذالحجٹ / اپریل ۲۰۱۶ء

نے اس کے بارے میں معلومات حاصل کیں اور پھر اس نے یہاں بھی اپنی ذہانت کے کارنامے دکھانے شروع کر دیے۔ یہاں ذرا زیادہ خطرناک لوگوں سے واسطہ تھا اس لئے وہ محتاط انداز میں کھیلتا تھا لیکن اس کی جیت نے بہت سی آنکھیں اس کی طرف گھراں کر دیں۔ انہیں میں دو خوبصورت آنکھیں بھی تھیں۔

”میرا نام فرازیہ ہے۔ فرازیہ انعام علی۔“

”واہ۔ دونوں نام خوبصورت ہیں۔“ جلال الدین نے ترکی بہ ترکی کہا۔

”کیسے؟“ وہ بھی بے تکلفی سے بولی۔

”فرازیہ۔ یعنی بلندی۔ فرازیہ بلندیوں کی طرف رواں دواں اور پھر انعام علی یعنی قدرت کی طرف سے انعام علی کو بلندی انعام میں ملی ہے۔“

”ارے آپ تو کافی منتقلی ہیں۔ ویسے ہوتا چاہیے آخر کار ہندوستان پر کامیاب حکومت کر چکے ہیں۔“

”ہندوستان پر؟“ جلال الدین نے کچھ نہ سمجھ کر کہا۔

”جلال الدین محمد اکبر۔“ اس نے کہا اور کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ جلال بھی خوب ہنسا اس نے تعریفی لہجے میں کہا۔ ”حاضر دماغ لوگ میری کمزوری ہیں۔ میں انہیں بے پناہ پسند کرتا ہوں۔ آپ نے جس طرح مجھے ہندوستان کا بادشاہ بنا دیا وہ کمال ہے۔ مزید کمال یہ ہے کہ آپ میرا نام بھی جانتی ہیں۔“

”رہیں کورس کی دنیا میں آپ اجنبی نہیں ہیں۔“

”آپ کی زبانی سن رہا ہوں۔“

”اور آپ دوست بھی نہیں بناتے کسی کو۔“ وہ بولی۔

”بہت اکتشافات کر رہی ہیں آپ۔“

”ایک اور اکتشاف کروں؟“ وہ بولی۔

”جی ضرور۔“

”میں آپ کو پسند کرتی ہوں۔“ اس نے بیباکی

اقبال اور اس کی بیٹی کی چابک دستی نے اپنی دانست میں ایک دلچسپ کھیل کھیلا تھا لیکن جلال الدین کی ذہانت کام آگئی تھی۔ اس نے دوسرا خط تیار کر لیا تھا اور یہ خط بھی کام آگیا اور نہ واقعی شاہ نگر کی سڑکوں پر لوگوں سے اور امداد مانگی جا رہی ہوتی۔

آخری فیصلہ اس نے یہ کیا تھا کہ خوبصورت لڑکیوں سے خاص طور پر ہوشیار رہا جائے۔ رائے بلند اقبال پر کیا گزری نہ اس نے معلوم کرنے کی کوشش کی نہ اسے معلوم ہوا۔ اس نے اپنا کام جاری رکھا اور کئی بڑے بڑے ہاتھ مارے۔ بے ایمان اور بد دیانت لوگوں سے وہ خراج وصول کرتا تھا اور اس کے شکار اس طرح کے لوگ ہوا کرتے تھے جو غریبوں کا خون چوس کر دولت جمع کرتے ہیں اور انہیں کچھ نہیں دیتے۔

جیسے ابرار احمد شاہ۔ شاہ جی ایک بہت بڑے ڈیری فارم کے مالک تھے۔ ڈیری فارم میں سینکڑوں ٹن دودھ پورے شہر میں نہیں بلکہ آس پاس کے شہروں وغیرہ میں بھی جاتا تھا اور ان کی بے شمار گاڑیاں جن پر شاہ ڈیری لکھا ہوتا تھا صبح ہی صبح ان بھینسوں کا دودھ لے کر نکل پڑتی تھیں جن کا اس دنیا میں کوئی وجود نہیں تھا۔ ہاں پندرہ بھینسیں بے شک فارم پر موجود تھیں لیکن ان میں سے ہر بھینس ایک وقت میں آٹھ دس سن دودھ ضرور دیتی تھی کیونکہ ان کی سپلائی اتنی ہی تھی۔

ان شاہ صاحب کو جلال الدین نے ایک شاندار گمشدہ فردخت کی تھی جس کی اصل قیمت کوئی دو ڈھائی کروڑ تھی لیکن چونکہ مالک ملک چھوڑ کر ملک سے باہر جا رہا تھا اس لئے اس نے یہ کچھ صرف ایک کروڑ بیس لاکھ روپے میں دے دی تھی۔ البتہ اب اس کے کئی مالکان انہیں میں مقدمہ بازی کر رہے تھے۔

جاننے والوں کے کئی کھیل کھیلنے کے بعد جلال الدین نے سوچا کہ اب ٹریک بدلا جائے اور پھر ایک دن اس کا خیال رہیں کورس کی طرف ہو گیا۔ پہلے اس

سیارہ ذالحجٹ / اپریل ۲۰۱۶ء

دی تھی اس نے فروخت نہیں کئے۔ وہ ان ہیروں کیلئے دیوانہ بے رات کو سونے سے پہلے وہ ان ہیروں کو تجوری سے نکال کر دیکھتا ہے جب سو جاتا ہے۔“

”گڈ۔“ جلال الدین نے کہا اس کے بعد وہ ہیرے اس کی آنکھوں میں ٹپانے لگے۔ اپنی نوسر بازی کی زندگی میں اس نے کبھی چوری کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا وہ اسے ایک گھٹیا کام سمجھتا تھا جبکہ بڑے بڑے غفلندوں کو گھاس کھانا وہ ایک فن سمجھتا تھا لیکن یہ ہیرے اس کے ذہن میں انکب گئے تھے۔

فرازیہ کے ذریعہ ہی اس نے زاہد باری سے ملاقات کی تھی۔ اس کی عمر زیادہ نہیں تھی بیوی امریکی تھی کوئی اولاد نہیں تھی۔ بیوی نوعمر تھی اور شادی کے کچھ عرصے کے بعد ہی کسی حادثے میں ہلاک ہو گئی پھر اس نے دوسری شادی نہیں کی تھی۔ ایک عایشان بنگلے میں رہتا تھا اور ملازموں کی پوری فوج بنا کر رکھی تھی۔

جلال الدین نے اس کے ڈرائیور کو تاکا تھا کیونکہ اس نے محسوس کیا تھا کہ ڈرائیور زاہد باری کے زیادہ قریب ہوتا ہے۔ زاہد باری نے شہر کے باروق اور کاروباری علاقے میں اپنا دفتر بنا رکھا تھا۔ جلال الدین نے کئی روز تک اس ڈرائیور کی نگرانی کی اور پھر ایک روز وہ خود بھی ڈرائیوروں والی وردی پہن کر اور اپنا حلیہ ایسا ہی بنا کر اس ڈھابے میں جا بیٹھا جہاں زاہد باری کا ڈرائیور بیٹھا تھا۔

اس نے بڑی مہارت سے ڈرائیور اعجاز سے تعارف حاصل کیا۔ پورے ایک ہفتے اعجاز پر محنت کی تب وہ راہ پر آکا۔

”ایک بات بتاؤ اعجاز۔“

”ہوں۔ پوچھو۔“

”کیا ہم ڈرائیور پیدا ہوئے تھے؟“

”پیدائش کے وقت کے معلوم ہوتا ہے کہ آگے چل کر وہ کیا بننے والا ہے؟“

”اس بات پر مجھے خاموش ہو جانا چاہیے۔“

جلال الدین نے کہا اور دونوں خوب ہنسے۔ یوں دوستی ہوئی۔ انعام احمد بھی دولت مند انسان تھا اور فرازیہ اس کی چٹائی بیٹی۔ اس کے ساتھ ہی بے باک بھی۔ جلال الدین کو اکثر اس نے ایسے لمحات سے دوچار کر دیا تھا کہ اس کی رائیں بے سکون ہو جاتی تھیں اور وہ اپنے چہرہ کو کسی لمس سے دوچار کرنے کا خواہشمند ہو جاتا

فائنس وقت سے اسے بڑے بچوں کے دیئے تھے اس لئے وہ بے حد محتاط تھا۔ بہت غور و خوض کے بعد اس نے فیصلہ کر لیا کہ فرازیہ سے شادی کرنے میں کوئی راز نہیں ہے سب سے بڑی بات یہ تھی کہ فرازیہ ایک بہت بڑے گھرانے سے تعلق رکھتی تھی اس کے ذریعہ اپنے گھرانے تک رسائی حاصل ہو سکتی تھی۔ پھر عمر کے بنیامال سے کتنی گزیرے تھے۔ چنانچہ اس نے فرازیہ کو اپنا لیا اور اس کی رسائی بہت بلندیوں تک ہو گئی۔ اب ہی اس نے ایک دن بیٹھ باری کو دیکھا۔

”اس میں کیا خوبی ہے جو لوگ ان پر کھینچوں کی گزراں لگ رہے ہیں؟“

”انبار دیکھتے ہو؟“

”نہیں۔“

”نہیں ہے۔“

”کیوں؟“

”بڑی راقی شخصیت ہے بیٹھ باری کی۔“

”وہ کیسے؟“

”جہانلی میں یہ بڑا ہم جو رہا ہے۔ ساری زندگی کوئے اور جہازات تلاش کرتا رہا ہے اور آخر اس نے ہاتھ حاصل کر لیا۔“

”وہ کیسے؟“

”ایک کے قیدی ترین ہیرے ہیں اس کے پاس۔“

”کون سا علاقہ؟“

”ان ہیروں کی قیمت کروڑوں پاؤنڈ لگا

دن بھی مقرر کر لیں گے۔“
اعجاز نے سمجھتی ہوئی سی نظروں سے ادھر ادھر دیکھا اس پاس کوئی بھی نہیں تھا کہ ان کی گفتگو سن سکتا۔ گرد و پیش سے مطمئن ہو کر اعجاز نے قدرے اچکچاہٹ سے کہا ”فرض کرو ہم۔ میرا مطلب ہے کہ میری مدد سے تم اس چکر میں کامیاب ہو گئے تو مجھے کیا ملے گا؟“

جلال کو کافی دیر سے اس سوال کی توقع تھی اور جواب اس کے ذہن میں تیار تھا۔ ”دیکھو میاں ایک صورت تو یہ ہے کہ نو ہیروں میں سے اپنی پسند کے تین ہیرے تم لے لینا چھ ہیرے میرے ہوں گے اور تم چاہو تو میں ہیرے حاصل ہونے کے دوسرے ہی دن تمہیں پانچ لاکھ روپے نقد لا دوں گا اور تم اس بات سے کوئی سروکار نہیں رکھو گے کہ ہیرے کتنے کے فروخت ہوں گے بولو کون سی صورت قبول ہے تمہیں؟“

”پانچ لاکھ روپے والی بات ٹھیک ہے۔“ اعجاز نے اپنے مخصوص شریلے لہجے میں کہا ”میں کہاں ہیرے فروخت کرتا پھر دوں گا۔“

جلال کو اسی بات کی توقع تھی۔ دو دن بھر ملاقات کا وقت طے کر کے وہ لوگ اس جگہ سے باہر نکل گئے۔ دوسری طرف جلال کی شام کی مصروفیات بھی جاری تھیں روزانہ شام کو فرازیہ کے ساتھ وہ کسی ایسے ہوٹل میں پہنچتا یا پھر کسی نئی تقریب میں ان کی ملاقات پہلے سے طے ہوتی تھی۔ اعجاز سے بھی اس کا پروگرام طے ہو چکا تھا۔ اگلے اتوار کی رات عمل کیلئے منتخب کی گئی تھی۔ ابھی اس میں تین چار دن باقی تھے کہ نیو انیئر ٹائٹ ایگنٹی جن حلقوں میں جلال کا اٹھنا بیٹھنا تھا ان میں نیو انیئر ٹائٹ دیواگنی آمیز جوش و خروش کے ساتھ منائی جاتی تھی۔ جلال بھی اس رات فرازیہ کے ساتھ ایک صاحب کی طویل و عریض کونھی میں موجود تھا۔ تقریبات کیلئے اس کونھی میں خاص ہال موجود

ہوئے کہا۔ ”بالفرض تم رات کو عقیقہ دیوار بھاند کر آؤ اور میں تم کو گوشت میں بے ہوشی کی دوا کھلا کر اسے پہلے ہی سے سلا رکھوں اور میں صاحب کے بیڈ روم تک نہا رہنے کی بندوبست بھی کر دوں جب بھی کوئی ناکہ نہیں۔ سردی ہو یا گرمی صاحب اپنا بیڈ روم منتقل کر کے سوتے ہیں سردیوں میں ہیٹر آن رہتا ہے بالفرض کسی اور گرمیوں میں انیئر کنڈیشنر چلتا رہتا ہے۔ بالفرض کسی زیک سے تم بیڈ روم کا تالا بھی کھول لو تو تجوری کے تالے کا مسئلہ آجاتا ہے۔ اس کے تالے کی چابی صاحب اپنے سر ہانے رکھ کر سوتے ہیں اور کھولنے کا سہم چوڑا ہے کہ ایک خفیہ بین دیباے بغیر اگر تالے میں جالی لگائی جائے تو الارم بجنے لگتا ہے۔“

”لیکن تمہیں یہ سب باتیں کیسے معلوم؟“ جلال نے اعجاز کو گھورتے ہوئے کہا۔

”ان کی بہت خاص باتیں ہم نوکروں کو معلوم ہیں اور پھر تمہارا کیا خیال ہے کہ میں نے ان ہیروں کے بارے میں بھی نہیں سوچا لیکن کیا کروں اکیلا چنا کیا ہمارا پھوڑ سکتا ہے؟“

”ہوں۔“ جلال نے پر خیال انداز میں ہنکارا کر ”آری کام کے ہو۔ بہر حال اب یہ سمجھو کہ ایک اور ایک گیارہ ہو گئے ہیں۔ اچھا یہ بتاؤ کہ تمہارے صاحب کی نیند کیسی ہے؟“

”ہیروں کو دیکھ لینے کے بعد تو وہ اتنی گہری نیند سوتے ہیں کہ شیری ان کے سر ہانے دھاڑے تو ان کی آنکھ نہ کھلے۔“ اعجاز نے جواب دیا۔

”بس تو پھر تمہو سارے مسئلے حل ہو گئے۔“

جلال نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا۔ ”میں ذرا اس مسئلے پر غور کروں برسوں تمہیں بتاؤں گا کہ الارم کو ہٹا کر دے کو بے ہوش کیسے کیا جاتا ہے اور چابی کی انوکھلی کیسے بنوائی جاتی ہے اس کے بعد ہم باقی کچل چوٹی باتیں بھی طے کر لیں گے اور اپنے کام کا

سیارہ ذابحہ / اپریل ۲۰۱۶ء

ماپوسی سے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”میں جانتا ہوں ان ہیروں کے بارے میں دیکھے بھی ہیں میں نے تم ہم انہیں چرائیں سکتے۔“

”کیوں۔ آخر کیوں؟“ جلال الدین جوشے بولا۔

”میں ان کے بارے میں تقریباً کچھ جانتا ہوں حتیٰ کہ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ وہ سرخ رنگ کے ایک مختل ڈبے میں رکھے ہوئے ہیں اور تعداد میں پانچ یا چھ نہیں پورے نو ہیں۔ یہ بات مجھے خاندان نے بتائی تھی وہ ایک مرتبہ صاحب کو دودھ کا گلاس دے تین اس وقت ان کے بیڈ روم میں چلا گیا تھا جب ہیروں کا ڈبہ کھول کر سامنے رکھے بت بنے بیٹھے صاحب گویا ان ہیروں کی پوجا کرتے ہیں ان کے سامنے رکھ کر صاحب کو دیر تک کسی بات کا ہوش نہیں ہوتا وہ ہیرے ہی اتنے خوبصورت کہ انہیں دیکھ کر آدمی مبہوت ہو سکتا ہے لیکن انہیں چراتا ممکن نہیں ہے۔“

”دنیا میں کسی چیز کا چراتا نامکن نہیں ہے بشرطیکہ عقل سے کام لیا جائے۔“

”دیکھو بچے پر دو چوکیدار ہیں دونوں مل کر چوٹیں گھسنے کی ڈیوٹی دیتے ہیں ان کو سختی سے حکم ہے کہ گیت نہ چھوڑا جائے اور صاحب کی عدم موجودگی میں کسی کو گھر میں داخل نہ ہونے دیا جائے اگر کوئی خود کو رشتے دار یا عزیز بتائے تو گیت پر لگے فون سے فون کر کے صاحب سے تصدیق کی جائے پھر اسے اندر آنے دیا جائے۔ چپکے چپکے میں انہوں نے ایک کتا رکھا ہوا ہے جو کھلا رہتا ہے اور اگر وہ سو بھی رہا ہوں تو ذرا سی آہٹ پر جاگ جاتا ہے۔ خیر۔ اگر میں نے تمہارے ساتھ مل کر ہیروں کی چوری کا منصوبہ بنایا تو دن میں بچنے میں داخل ہونے کی جرات نہیں کر سکتا۔“

پھر اس نے مختار انداز میں بات کو آگے بڑھا دیا

”تمہارے بچے ہیں؟“

”ہاں۔“

”بیٹا کوئی؟“

”دو بیٹے ہیں۔“

”کتنے بڑے ہیں؟“

”ایک چار سال کا ہے دوسرا ڈھائی سال کا۔“

”انہیں گاڑی چلانا سکھا دو۔“ جلال الدین نے کہا۔

”ابھی سے؟“ معصوم اعجاز نے حیرت سے کہا۔

”میں تو لکھا ہے ہماری تقدیر میں۔ ہمارے بچے بھی وہی کریں گے جو ہم کر رہے ہیں ہم ان کیلئے اور کیا کر سکتے ہیں؟ مالکوں کیلئے کاروں کے دروازے کھولنا ان کی چیزیں سننا اور بس۔“ جلال الدین کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

”پھر کیا کریں ہم؟“ وہ بولا۔

”تقدیر بدلوانی اپنے بچوں کی۔“

”مگر کیسے؟“

”اس کیلئے سوچنا پڑے گا۔ غور کرنا پڑے گا۔“

”تمہارے بچے ہیں؟“

”ہاں اور میں انہیں بہت پیار کرتا ہوں۔“ جلال الدین نے کہا۔

”ان کے بارے میں بھی یہی سوچتے ہو؟“

”ہاں لیکن میں انہیں ڈرامیور نہیں بناؤں گا۔“

”پھر کیا کر دے؟“

”محنت عمل تم بھرنا کرو گے۔“

”میں۔“

”ہاں تمہارے مالک کا نام زاہد باری ہے نا۔“

”ہاں۔“

”بہت دولت مند ہے وہ شاہ اس کے پاس بڑے قیمتی ہیرے ہیں کیا وہ ہیرے ہماری ملکیت نہیں بن سکتے؟“ اعجاز دیر تک بکتے میں رہا پھر اس نے

تھاجس میں شام ہی سے خوب بھیڑ بھاڑ تھی اور مختلف مشاغل جاری تھے۔ بارہ بجے سے ذرا پہلے تمام بقیں بچا دی گئیں۔ تمام شور شراب ختم گیا۔ ماحول پر یوں اندھیرا اور سکوت چھا گیا جیسے گہمی میں کوئی ذی روح موجود نہیں ہے۔ پھر جیسے ہی وال ہالک ہالک نے بارہ کا پہلا گھنٹہ بجایا شور کا ایک طوفان اُمنڈ پڑا۔ لوگ چیخ رہے تھے۔ جھوم رہے تھے، تاج رہے تھے۔ جلال اور فرازیہ بھی ان سب کے ساتھ شریک تھے پھر فرازیہ کو اس کا کوئی کزن لں گیا اور اس سے باتیں کرتے کرتے وہ کچھ دور چلی گئی یا شاید مہمانوں کے ریلے میں جلال خود ہی ایک طرف کھسک گیا تھا۔ اسی دوران اس کی کہنی کسی کی کمر سے لگرائی اور اس کا گلاں چمک گیا۔ دونوں نے ایک وقت مڑ کر دیکھا اور دونوں ہی اپنی جگہ ساکت ہو گئے اس سے لگرائے والی کو عریضہ بلند اقبال تھی۔ ہوتی شکل والا ایک بے بسگم سونو جوان اس کے ساتھ تھا جس کے بھدے وجود پر ایک نہایت نفیس سوٹ اپنی قسمت کو درود رہا تھا۔

بہر حال عریضہ نے بھی اسے پہچان لیا تھا اور پوری طرح اس کی طرف محکم گئی اس نے اپنے ساتھی کو نظر انداز کر دیا تھا۔

”تمہارے وجود سے دولت کی خوشبو آ رہی ہے۔ لگتا ہے دھندہ زوروں پر جا رہا ہے۔“ اس کی آواز اتنی مدہم تھی کہ صرف جلال ہی اسے سن سکے۔

”کونسا دھندہ؟“ جلال نے خود پر قابو پا سٹے ہوئے کہا۔

”نوسر بازی کا اور کونسا دھندہ؟“

”آپ کی جس مزاح بوڑی خالمانہ ہے مس عریضہ۔“ جلال نے کھوکھلا سا ہتھکڑ لگایا۔ اس کے ساتھی سونو جوان نے منمنائے ہوئے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا لیکن عریضہ نے ہاتھ کے کھمسانہ اشارے سے اسے پیچھے کر دیا اور وہ کھسکا ہوا بے بغیر کی اور طرف چلا گیا۔

”ذرومت میں تمہارے کارناموں کا تذکرہ کی اور سے نہیں کروں گی میں تو تم سے کچھ اور باتیں کرنا چاہتی تھی“ آؤ باہر چلتے ہیں۔ تمہارے ساتھ کوئی ہے کیا؟“ اس نے جلال الدین کا ہاتھ پکڑتے ہوئے اس سے پوچھا۔

”ہاں فرازیہ میرے ساتھ ہے۔“ جلال نے ہچکچاہٹے ہوئے جواب دیا۔

”اسے گولی مار دو اسے مگر مجھ کی بچی کو اتنی دل لائی کے ساتھ تم کیا جھک مارتے پھر رہے ہو؟“ اس نے اسے تقریباً کھینچتے ہوئے کہا اس کے گرم و گدھا ہاتھ اس کے جسم میں ایک اور انوکھی منفی اور حرارت پیدا کر رہا تھا حالانکہ یہ پہلی لڑکی نہیں تھی جس کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں آیا تھا۔ تب اس نے سوچا کہ جیسوں کے رد عمل بھی تو دراصل ذہن اور محسوسات کے نتائج ہوتے ہیں اسے یاد تھا کہ جیہ وہ لڑکی تھی جو پہلی نظر میں اسے بھیجی تھی مگر وہ اسے اپنی دانست میں بھلا چکا تھا۔

وہ ہال کا ساؤنڈ پروف دروازہ کھول کر باہر نکل آئے باہر تازہ اور خشک ہوا میں انہیں اپنے وجود بے حد بیکے پھٹکے محسوس ہونے لگے۔ وہ عمارت سے نکل کر لان میں چلے گئے اور فوراً سے گرد بنی ہوئی سرسریں دیوار پر بیٹھ گئے۔ چاند کی دھندلی چاندنی میں وہ جلال کی طرف دیکھ کر مسکرائی اور اس کی مسکراہٹ نے پیچھے چاند کا سارا دھندلا پن ختم کر دیا۔

”تمہیں یہ سن کر حیرت ہو گی کہ مجھے اس وقت تاسف یا ناگواری کے بجائے ایک عجیب سی خوشی محسوس ہوئی تھی جب ڈیڈی نے غصے کے عالم میں مجھے تمہارے کارنامے کے بارے میں بتایا تھا اور میں اپنے کمرے میں جا کر بیٹھنے بیٹھنے سے حال ہو گئی تھی اور اس کے بعد ہفتوں تک تمہارے بارے میں سوچتی رہی تھی۔“ وہ اس کے اور قریب کھسک آئی۔ جلال کو یہی

”بہر عورت جس مرد کو تھوڑا بہت پسند کرتی ہے یا جس سے اس کی شادی ہو جاتی ہے اسے وہ مکمل طور پر اپنی ہی مرضی کا آدمی بنانے کی کوشش کیوں کرتی رہتی ہے؟“ جلال نے نہایت سادگی سے پوچھا اور وہ گھور کر جلال کو دیکھنے لگی پھر قدرے پرے کھسک کر بولی۔

”چالاک انسان۔ میں تم سے تمہاری ذات کا کوئی جزو نہیں چھینوں گی۔ تمہیں کچھ دینے کی کوشش کروں گی میں تمہیں تو ڈنکا پھونکا نہیں تھیر کرنا چاہتی ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ تم اس سوسائٹی میں سب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ سکو۔ آئندہ تمہیں کوئی اور ایسی نظر نہ آئے جسے دیکھ کر تمہارا رنگ فق ہو جائے۔“

”کیا تمہیں واقعی مجھ سے محبت ہو گئی ہے؟“ جلال نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

”اور اب تم یہ بات اور کس طرح مجھ سے کہلوانا چاہتے ہو؟“ اس نے قدرے خشکی سے جلال کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا۔ ”اب تم ہمیں ایبرز تو ہیں نہیں کہ تم تنہائی پا کر مجھ سے اقرار محبت مانگو گے اور میں اثبات میں سر ہلا کر دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر اندر بھاگ جاؤں گی ہم دونوں نہ تو اب اس عمر میں ہیں اور نہ ہی اس کلاس میں۔“

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن کیا تمہارے ڈیڈی مجھ سے تمہاری شادی کرنے پر رضا مند ہو جائیں گے؟“ جلال نے گویا فیصلہ پر پہنچتے ہوئے کہا۔

”ہاں بشرطیکہ میں ان سے کہوں۔“ وہ کھسک کر دوبارہ جلال کے قریب آتے ہوئے مسکرائی۔ ”آخر میں ان کی انگوٹھی بیٹی ہوں اور اب تو ان کا آدھ سے زیادہ بڑس بھی چلا رہی ہوں لیکن میں ان سے تب کہوں گی جب مجھے یقین ہو جائے گا کہ تم اپنی لائن بدل چکے ہو اور مجھ سے خالص ہو کیونکہ اپنا سب کچھ کسی کو سونپ دینا بڑا نازک کام ہے بہت سوچ سمجھ کر کرنا پڑتا ہے۔“

محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہو۔

”شخصیت کے اعتبار سے بھی بہر حال تم اسارت اور بندم ہو۔“ وہ جلا جھک بات جاری رکھتے ہوئے بولی ”لیکن تمہاری اسارت نس نے مجھے زیادہ متاثر کیا کہ تم کسی بھی قسم کی صورتحال میں ہاتھ پاؤں نہیں چھوڑے نروس نہیں ہوتے اور اپنا کام بہر حال دکھا جاتے ہو۔ خواہ حالات موافق ہوں یا غیر موافق۔ یہ سب ذہانت اور مستعدی کی دلیلیں ہیں۔ ایسی ذہانت اور مستعدی جو غلط راہ پر پڑنے سے اور میں تمہیں سچی بات بتاؤں میں خوابوں کی دنیا میں کھوئی رہنے والی لڑکی نہیں لیکن اگر میں کسی خواب دیکھتی تھی تو ایسے ہی چیز طرار چالاک اور اسارت نوجوان کے خواب دیکھتی تھی۔ ہم امیروں میں تم جیسے لڑکے کم ہی ہوتے ہیں۔ عموماً بڑے ڈل اور لیکر کے فقیر ہوتے ہیں باپ نے بڑس کر دیا یا بس اس کو چلا رہے ہیں۔ اپنے طور پر کوئی اچھوتی بات نہیں سوچ سکتے۔“

وہ جیسے اپنے جوش کو دباتے ہوئے بول رہی تھی۔ جلال اب نہایت ممبر و سکون سے بیٹھا تھا اور توجہ سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔

”لیکن میں تمہیں مکمل طور پر فراڈ بھی نہیں دیکھنا چاہتی تھی کہ تمہاری کز رواقات جلسا بازی اور نوسر بازی پر ہواور میں تمہیں سو فیصد پارسا انسان بھی نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ سو فیصد پارسا انسان بھی آج کی دنیا داری میں نہیں مل سکتا۔ حتیٰ کہ میں نے ڈیڈی کو بھی قائل کر لیا کہ تم بوسے کام کے آدمی ثابت ہو سکتے ہو لیکن اس کے بعد تم کبھی مجھے نظر ہی نہیں آئے اور پھر رفتہ رفتہ تمہارا تصور ذہن کے کھڑ خانے میں جا گرا۔“

”میں تمہیں نظر آتا تو کیا کرتیں؟“ جلال نے ملاحت سے پوچھا۔

”تمہیں اپنی مرضی کا آدمی بنانے کی کوشش کرتی کام کا آدمی۔“

سیراہ ڈائجسٹ / اپریل ۲۰۱۶ء

کرنے لگا زندگی اسے آج جتنی حسیں لگ رہی تھی اس سے پہلے کبھی نہیں لگی تھی۔

پھر محل کی رات جلال بے حد چاق و چوبند تھا۔ اس نے چیتے کی سی پھرتی اور خاموشی سے بیٹھنے کی دیوار پھاندی اور چند لمحوں کے لیے سفیدے کے درخت کے عقب میں دبک گیا۔ حسب توقع کسی طرف سے کتے کے بھونکنے یا غرانے کی آواز نہیں سنائی دی تاہم آگے بڑھنے سے پہلے اس نے ایک بار پھر سوچا کہ اسے یہ کام مکمل کرنا چاہیے یا واپس لوٹ جانا چاہیے۔ کچھ منٹ سوچنے کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ عریضہ سے کیا ہوا وعدہ ضرور پورا کرے گا لیکن اس آخری کام کے بعد۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ شادی کے بعد عریضہ کا سب کچھ کبھی طور پر جلال ہی کا ہو جاتا تھا اور وہ اتنی محبت کرنیوالی اور اعلیٰ ظرف لڑکی تھی کہ کبھی جلال کو اپنے مقابلے میں کم ظرف ہونے کا احساس نہیں دلا سکتی تھی لیکن جلال اپنی سہیلی اور اپنی آنکھیں کیسے اپنے پاؤں زیادہ سے زیادہ مضبوط رکھنا چاہتا تھا تاکہ ضرورت پڑنے پر وہ یہ ثابت کر سکے کہ شادی کے وقت اس کی اپنی حیثیت بھی معمولی نہیں تھی۔

بہروں کی کامیاب چوری کے بعد وہ خود کو مزید مستحکم کرنے لگا یہی سب کچھ ذہن میں دہراتے ہوئے اس نے برآمدے کی طرف دیکھا۔ برآمدے میں دو دھوپا بلب نشان منزل کی طرف روشن نظر آ رہا تھا۔ اعجاز نے کہا تھا کہ اگر بلب روشن نظر آئے تو راستہ صاف ہے ورنہ یہ سمجھ لینا چاہئے کہ کوئی بڑ ہو سکتی ہے یا کسی وجہ سے تیاریاں مکمل نہیں ہوئیں۔ اس صورتحال میں وہ وہیں سے واپس لوٹ جائے۔ پھر اس نے دے قدموں لان عبور کیا اور عقی برآمدے میں پہنچا۔ عقی دروازہ غیر متعلق تھا اعجاز نے اسے سمجھا دیا تھا کہ یہ دروازہ کھول کر وہ اندر آ سکتا ہے۔ چنانچہ جلال نے دروازے کی تاب اس طرح جھانکی کہ ذرا

”بے شک۔“ جلال نے تسلیم کیا اور ایک لمحوں کے توقف سے بولا۔ ”بہر حال اگر تمہاری یہی منشا ہے تو یوں ہی سہی ہم نے اپنا آپ آج ہی سے تمہارے نام لکھ دیا۔“

”او ہاؤ سویٹ یو آر۔“ لگن گچی ہو تو سن کا میت تاخیر سے ہی سہی مل ہی جاتا ہے اگر تم کچھ عرصہ اور مجھے نہ ملتے تو میری شادی اس بوقت نوجوان سے ہو جاتی جسے تم نے اندر ہل میں میرے ساتھ دیکھا تھا اور ہاں اب ہمارے درمیان عہدو پیمان ہو گئے ہیں لیکن مجھے تمہارا اصل نام معلوم ہی نہیں، ویسے اتنا مجھے یاد ہے کہ پہلی ملاقات میں تم نے اپنا نام جلال بتایا تھا مجھے۔“

”میرا اصل نام جلال ہی ہے۔“ جلال اس کا رخسار چمپتہ ہوتے مسکرایا۔

”بڑے دیدہ دلیر ہو، وارداتوں میں بھی اصل نام استعمال کرتے ہو۔“

”در اصل میں نے کبھی ایسا خاص قابل گرفت کام نہیں کیا جسے صحیح معنوں میں واردات کہا جاسکے یا ثابت کیا جاسکے۔“ جلال نے مناسبت سے جواب دیا ”آؤ اب اندر چلیں۔“

وہ واپس ہال میں آگئے جہاں مشروبات کے بعد موسیقی کی بدلی ہوئی دھن پر اب باقاعدہ رقص کا آغاز ہو چکا تھا۔ فرازیہ رقص نہیں کر رہی تھی اس نے دونوں کو نکھیا اور غائبانہ کے چہروں پر ایک خاص تعلق خاطر کا برتو بھی محسوس کیا وہ ایک لمحے کیلئے حیران ضرور ہوئی لیکن اس ایک لمحے کی حیرانی کے سوا اس نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔

جلال نے فرازیہ کی طرف دیکھ کر رہی انداز میں مسکراتے ہوئے سر ہلایا اور فرازیہ منہ پھیر کر جھج جھج میں لمبوں ایک نو عمر لڑکے کی طرف بڑھ گئی جو اکیلا ہی ڈانس کر رہا تھا۔ جلال عریضہ کے ساتھ رقص

سیراہ ڈائجسٹ / اپریل ۲۰۱۶ء

نہیں ہوئی تھی لیکن ایک لذت و جب اضطراری طور پر اسے اٹھانے کیلئے جھکا تو اس کی کبھی تجوری کے دروازے سے لگرائی اور دروازہ ایک سیکڑے سے بند ہو گیا۔ یہ کھٹکا خاصا زور دار تھا اور گہری نیند سوئے ہوئے انسان کو بھی بیدار کرنے کیلئے کافی تھا۔ یہ احساس جلال کو ڈب اٹھانے کے بعد ہوا اس نے ہڑ بڑا کر بیڈ کی طرف دیکھا لیکن سیٹھ اسی طرح لیٹا تھا، کسسا یا تک نہیں تھا۔

جلال کو اس کا انداز غیر حقیقی محسوس ہوا۔ پہلی بار اس کی چمپنی حس نے جھربھری لی اور وہ دبے قدموں بیڈ کے صحن قریب جا پہنچا اور بہت کوشش ہو گیا مگر اسے سیٹھ کی سانسوں کی آواز نہ سنائی دی تب اس نے احتیاط کو ہالے ہالے طاق رکھتے ہوئے سیٹھ کے اوپر جبکہ کر اس کا چہرہ بخود دیکھا۔ چہرہ زندگی سے محروم تھا نہایت دھشت کے عالم میں اس نے سیٹھ کے ہمسے کیلئے کہل مٹایا اور فوراً ہی اسے خنجر کا دبہ نظر آ گیا جس کا پورا پھل سیٹھ کے پہلو میں چبوت تھا۔ ایک لمحے کیلئے تو اسے یہ سب کچھ ڈراؤنا خواب محسوس ہوا۔ اعجاز۔ وہ بہت شرمیلا اور اناڑی نوجوان اتنی ہنرمندی سے چال نہیں بن سکتا تھا۔

دفعتاً اس کی چمپنی حس نے اس کے جسم میں بھگان سا برپا کر دیا۔ پہلی کی تیزی سے پلٹا کر یہ تیزی اس کے کسی کام نہ آئی کیونکہ خوں چیز اس کے سر سے گرنی اور فوراً ہی اس کا ذہن یوں اندھیرے میں ڈوب گیا جیسے کسی بلب کا سوچ آف کر دیا گیا ہو۔ آٹھ کی تو سب سے پہلا احساس اسے سر میں تکلیف کا ہوا۔ اس نے سر کو جھپٹنے کیلئے ہاتھ بلانا چاہا تو احساس ہوا کہ ہاتھ بندھے ہوئے ہیں اس نے ثابت آہستہ آہستہ انداز میں ادھر ادھر دیکھنے کی کوشش کی۔ کمرے میں کچھ بچہ جھانپناں سفید صحن سا نظر آ رہا تھا اور اس میں کچھ پر چھانپناں ادھر سے ادھر جارہی تھیں۔ پھر اس نے قریب ہی نہیں

کی آواز سنا۔ وہ پھر وہ خواب گاہ کے دروازے سے نکلتا تھا۔ دروازے کے قریب پہنچ کر اس نے اندر کی گلی کی اور پھر پانچ منٹ کے بعد اس نے کمرے کے دروازے کی دھکیلتی چابی نکال کر تالے کے سوراخ میں داخل کی۔ چابی گھمانے میں اس نے پورے پانچ منٹ صرف کیے تھے خواب گاہ میں داخلے کا مرحلہ بھی پھر دہرایا ہو گیا۔ خواب گاہ کے ایک گوشے میں چابی پر ہات بلب روشن تھا اور مدہم روشنی میں سیٹھ کی لپٹے دینا و مانیا سے بے خبر سوتا دکھائی دے رہا تھا اس کے سر ہانے سے چابی نکالنا بے حد کڑا ثابت ہوا۔ اس کیلئے اس دوران جلال کے اعصاب تن گئے تھے۔ یہی وہ مرحلہ تھا جس کے بارے میں اعجاز نے انہیں آگاہ کیا تھا کہ اگر وہ اسے سر کرنے کی ہمت کرتا تو کب کا خود ہی بہروں پر ہاتھ صاف کر چکا ہوتا۔

چابی نکال لینے کے بعد بھی دیر تک جلال دیوار سے ٹک لگائے اپنے اعصاب کو معمول پر لانے کی کوشش کرتا رہا۔ اس کے بعد اس نے تجوری کھولنے کا عمل شروع کیا۔ دو تین ثانیوں میں اسے تجوری کھولنے کی ترکیب پتا چل گئی اور اس نے ترکیب آزما کر تجوری کھول لی۔ دروازہ کھولنے کے بعد اس نے فوراً سے مسکن انداز میں تجوری کے اندر ہاتھ مارا اور ڈواہ اسے نکلی ڈبے کا کاس محسوس ہو گیا۔ ڈبہ نکال کر وہ اسے کھول کر دیکھنے بغیر نہ رہ سکا۔ ڈبہ کھولنے ہی کیوں کی جھلپا ہٹ سے گویا کمرہ منور ہو گیا۔ ابھرے ڈاکیٹ پوسٹ نوٹے اور ان کا حجم خوبصورت تراش اور چمک دک ان کے۔ بے حد قیمتی ہونے کا پتا دے رہی تھی اس کی اس کی قیمت بار آور ہو چکی تھی۔

وہ خاصا غیر جذباتی آدمی تھا لیکن اس وقت کائنات کیوں خوشی سے اس کی ہاتھ پاؤں پیچھے سے قابو سے ہوئے اور وہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر قالین پر گر پڑا۔ قالین پر ڈبہ گرنے سے تو کوئی خاص آواز پیدا

سیارہ ذابحث / اپریل ۲۰۱۶ء

سے ایک آواز سنی اس آواز کو وہ پہچانتا تھا یہ اس کے ساتھی اس کے شریک جرم اعجاز کی آواز تھی۔

”ہاں جی۔ گہراج میں گاڑی کھڑی کر کے میں خواب گاہ کے نیچے سے گزر کے اپنے کوارٹر کی طرف جا رہا تھا۔“ وہ غم زدہ انداز میں کہہ رہا تھا ”میں نے اوپر کھنکے کی سی آواز سنی میں نے احتیاطاً پھیلے دروازے پر ہاتھ مار کر دیکھ لیا مجھے اس کا تالا ٹوٹا ہوا ملا۔ میں دوڑا دوڑا اوپر آیا بیڈ روم کا تالا بھی ٹوٹا ہوا تھا اور دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا میں نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا تو نظر آیا کہ صاحب کہنی کے بل بیڈ سے اٹھ کر اس فضا کو دیکھ رہے تھے جو ہیروں کا ڈیہ نفل میں دبائے باہر جانے کے لیے مڑی رہا تھا صاحب نے غالباً چیخنے کی کوشش کی مگر اس بد بخت نے انہیں مہلت نہ دی اور میرے سامنے ہی خیران کی پالیوں میں گھونب دیا۔ صاحب نے اس کے باوجود اس پر جھپٹنے کی کوشش کی مگر وہ بس بیڈ سے لٹک کر رہ گئے میں حواس باختہ ہو گیا تھا مگر پھر مجھے دروازے کے قریب ہی پتیل کی یہ اسٹینڈ والی بھاری سی ایٹس ٹرے رکھی نظر آگئی اور میں نے یہ اٹھا کر اس کے سر پر دے ماری پھر میں نے چوکیدار کو آواز دی اس نے آکر اس چور کے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے۔“

”کسی نے لاش کو چھوا تو نہیں۔“ ایک تھکسانہ سی آواز نے پوچھا۔

”نہیں صاحب ہمارے اندر تو اتنی ہمت ہی نہیں تھی۔“ اعجاز نے جواب دیا۔

”ہیروں کو بھی کسی نے نہیں چھیڑا؟“

”نہیں جاب یہ اسی طرح بھر گئے تھے جب میں نے چور کو ایٹس ٹرے ماری۔“

”یہ تعداد میں نویں تھی؟“

”میرے خیال میں نویں ہوں گے صاحب ہمارے صاحب آفٹر خفاق میں کہا کرتے تھے کہ ان

کے پاس نو ایسے ہیروں سے ہیں جن سے وہ کسی بھی اچھے علاقے میں بونگے خرید سکتے ہیں۔“ اعجاز نے اب سسکیاں بھی لینی شروع کر دی تھیں۔ جلال حیران و پریشان تھا اگر اعجاز نے ہیروں پر بھی ہاتھ صاف نہیں کیا تو اس نے مجھے کس لیے اس جال میں پھنسا یا ہے؟ میری اس سے کیا دشمنی تھی؟ پھر اس احساس سے اس پر بے ہوشی طاری ہونے لگی کہ کس طرح عین کنارے پر پہنچ کر اس نے اپنی کشتی ڈبو لی۔ اگر وہ ہیروں کے چکر میں نہ پڑتا چوری جیسے مکروہ جرم کا ارادہ ترک کر دیتا تب بھی کیا عرشہ سے شادی کے بعد اس کی زندگی میں کوئی کی رہ جاتی؟ اب اسے یہ سوال اہم نہیں لگ رہا تھا کہ وہ بچ جائے گا یا نہ کردہ جرم میں تختہ دار تک پہنچ جائے گا اس کا دل تو اس سوال سے ہول رہا تھا کہ وہ عرشہ کو کیا صورت دکھائے گا اور آبادہ اس کی صورت دیکھنے حالات یا جیل میں آئے گی بھی یا نہیں۔

ہائی کورٹ نے بھی اس کی سزائے موت برقرار رکھی تھی۔ اعجاز نے ان تمام چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال رکھا تھا جن کی بنا پر جلال کو شک کا فائدہ دے کر پری کیے جانے کا کوئی امکان موجود تھا۔ جلال کو اگر صحیح معنوں میں حیرت کا دورہ پڑا تھا تو وہ اس بات پر کہ اعجاز نے کس خوب صورتی سے کس صفائی سے جھوٹ بول کر جلال کو تختہ دار تک پہنچانے کا سامان کیا تھا۔ جلال بہت چنچا چلا پتا تھا اس نے اپنے وکیل کی معرفت پوری اصل کہانی بار بار دہرائی تھی لیکن عدالت ثبوت اور گواہوں پر یقین کرتی ہے بغیر گواہ اور ثبوت کے اسے محض کہانی ہی سمجھا گیا۔ عدالت اس بات کو تسلیم کرتے پر تیار نہیں تھی کہ ہیروں کی چوری کا منصوبہ ان دونوں نے مل کر بنایا تھا اور بعد میں اعجاز نے اسے جال میں پھنسا دیا تھا۔ لیکن ہیروں کے جوں کے توں موجود تھے کوئی اور چیز بھی چوری نہیں ہوئی تھی۔ جلال

سیارہ ذابحث / اپریل ۲۰۱۶ء

بہ نام نظم کیا تھا کہ اعجاز سے اس کی کوئی دشمنی نہیں تھی۔ اسے بھی اس کی کیا عداوت ہو سکتی تھی؟ اس نے اس کے الزام جلال کے سر پر ڈالتا۔ جلال کے وکیل نے سپریم کورٹ میں اپیل کی جہاں جلال کو یقین دلایا تھا کہ اپنی ضرر کر دی تھی اور جلال کو یقین دلایا تھا کہ اپنی بات کے لیے منظور ہو جائے گی۔ لیکن سپریم کورٹ کا فیصلہ کیا ہو گا اس بارے میں وہ قطعاً پر یقین نہیں تھا۔

شرع شرع میں جلال کو بڑا سہارا رہا کہ اسے اپنے وکیل کی خدمات حاصل تھیں مگر اب اس کا ہاتھ بچا تھا یہ بھی عرشہ ہی کی نوازش تھی کہ اسے ایک بڑا وکیل سپریم کورٹ کا دم غنیمت تھا اور اس کی ہر بات پر جلال کی توقعات کے قطعی خلاف وہ اپنی کورٹ کے فیصلے تک جیل میں اس سے لے کر رہی اور جو کچھ بھی اس کے بس میں تھا کرتی رہی کی بلکہ آخری ملاقات پر اس نے ڈیڈ بائی انکس سے جلال کی طرف دیکھتے ہوئے اتنا ضرور کہا ”اگر تم نے اب مجھ کو غلط وقت پر کیا جلال بہت غلامت پر جب منزل دو چار گام ہی رہ گئی تھی دیے کی باتیں میرے چرانے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ تمہارے پاس کس چیز کی کمی تھی؟ بہر حال جلال نے اس میں جو کچھ بھی تھا میں نے وہ کیا لیکن غصہ جب انسان کے خلاف ہو تو ہر جگہ ہاتھ اٹا دیتی ہے۔ میں نے یہ سب کچھ اپنی عزت و ناموس اور گلاں ساکھ کو داؤ پر لگا کر کیا ہے۔ جلال؟ اخبار والوں کو یہ بات معلوم ہے کہ میں تمہارے لیے بھاگ رہا ہوں اور جیل میں بھی تم سے ملنے آتی ہوں ان کے لیے یہ بہت بڑا اسکیٹل ہے۔ لیکن وہ کیوں کچھ لکھتے ہے اب تک اس لیے باز رہے ہیں کہ ان کے اخباروں کو ڈیڑی کے گرد پ آف کینیز سے ہاتھ اشارات ملنے ہیں مگر مجھے معلوم ہے یہ پردہ

داری زیادہ دیر نہیں چلے گی جلد ہی کوئی مہرمان اخبار کوئی نہ کوئی شوشا چھوڑ دے گا اور پھر ایک نیا عاز کھل جائے گا۔ مجھ میں اس صورت حال کا سامنا کرنے کی جرأت نہیں میں جتنا آگے جا چکی ہوں اتنا ہی کافی ہے میں اب تمہیں حالات کے رم و کرم پر چھوڑ کر واپس اپنی دنیا میں جا رہی ہوں اگر تمہاری اپیل سماعت کے لیے منظور ہوگئی تو تمہیں جھول گری جیل منتقل کر دیا جائے گا ظاہر ہے وہاں تو میں دیسے بھی تم سے ملنے نہیں آسکوں گی۔ مجھے معاف کر دینا۔“

عرشہ کی آنکھوں نے نئی رخساروں پر جھلک آئی تھی اور آواز رندہ گئی تھی اس نے جسم پر ایک بڑی چادر اوڑھ رکھی تھی اسی چادر کے پلوے آسپو پھینچے پو پھینچے کب لٹ مڑی اور ملاقات کے مخصوص حصے سے باہر چلی گئی۔ اس کے ساتھ ہی جیسے جلال کی زندگی سے محبت بھی چلی گئی ایک دم اس کا وجود کھوٹا ہو گیا اپنی نظر میں تو وہ گرہا چکا تھا اب تو اپنا وجود ریت کے گھر وندے سے بھی زیادہ بے وقعت ہو کر رہ گیا تھا۔ بکا یک ہی ساری چیزوں ساری باتوں سے اس کی دلچسپی ختم ہوگئی اسی شام اس کے وکیل عامریک نے اس سے ملاقات کی اور سپریم کورٹ میں اپیل کی تیاریوں کے بارے میں بتایا۔ ”نہیں وکیل صاحب اب میں کسی کی کورٹ میں اپیل نہیں کرنا چاہتا۔“

اس اپیل کے دوران کوئی ایسا ثبوت کوئی ایسی چیز ہاتھ آ جائے جو اس کیس کو پلٹ دے دیکھو میں ایک پیشہ ور وکیل ہوں بعض اوقات ہمارا مقصد کیس جیتنا ہوتا ہے لیکن اس طرح کے کیسوں میں حد سے زیادہ ضروری ہے ایک انسان کی جان بچانا اگر تم بے گناہ ہو تو چاہی یا عرقیدہ سے تمہاری جان ضرور بچنی چاہیے اس لیے میں یہ اپیل ضرور کروں گا۔“

”غصہ ہے وکیل صاحب جیسی آپ کی مرضی۔“

اور گاڑی کو چلتی ہوئی حالت میں لے آیا۔
شام کو وہ تیار ہو کر باہر نکلا کسی خیال کے تحت
ایک پبلک بوتھ کے سامنے کار روک کر اس نے بوتھ
سے عرشہ کے گھر کا نمبر ڈائل کیا دوسری طرف سے
ایک بھاری مردانہ آواز سنائی دی۔

”کس عرشہ ہیں؟“ جلال نے پوچھا
”آپ کون بول رہے ہیں۔“ بھاری بھر کم آواز
نے پوچھا۔

”میں جی، وہ جی میں عرشہ کا دوست۔“

”نشت اپ نان سنس۔“ دوسری طرف سے اتنا
کہہ کر فون بند کر دیا گیا تھا۔ جلال ریسور ویکٹارہ گیا
پھر باہر نکل آیا۔ اس کے بعد دیر تک جلال بلا مقصد
ادھر ادھر گاڑی گھماتا رہا۔ وہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ
اسے عرشہ کے گھر جانا چاہیے یا نہیں۔ اس نے سوچا
کہ جس اس کے گھر کے سامنے پتھر لگا لینے میں تو کوئی
خرج نہیں عرشہ کی کوئی پر آرائش لائسنس دیکھ کر اس کا
ہاتھ ٹھکا لیکن جب وہ کھلے گیٹ کے سامنے سے گزرا
تو اسے کوئی بالکل سنسان نظر آئی۔ ان کی روش پر
صرف ایک شخص جھپٹا نظر آ رہا تھا۔ جو شاید چونکیدار
معلوم ہوتا تھا جلال گاڑی سے اتر کر اس کے پاس
پہنچا۔ ”سب لوگ کہاں ہیں؟“ اس نے پوچھا۔
”سب گھر والے صبح ہال گئے ہوئے ہیں۔“
چونکیدار نے جواب دیا۔

”کیوں؟“ جلال نے سرسراہٹ ہوئی آواز میں
پوچھا۔ چونکیدار نے اس کی طرف اس طرح دیکھا جیسے
کہنا چاہتا ہو کہ کیا اب بھی کسی سوال کی منجاش باقی ہے
پھر بھی اس نے طوعاً و کرہاً جواب دیا۔
”عرشہ بی بی کی شادی ہے تاحصاحب آج۔“

جلال جب وہاں سے روانہ ہوا تو اسٹیرنگ پر اس
کے ہاتھ کب رہے تھے اور وہ بار بار کونٹ کی پستین
سے ہاتھوں میں آئے ہوئے آنسو حاف کرنے لگتا

کر فلاں تاریخ کو وہ جنس سے رہا ہو کر باہر کی دنیا میں
بچھ جائے گا۔ پھر وہ بھی آئی گیا جب اس نے
جنس کے بلند و بالا گیٹ کے چھوٹے سے چھکی
دروازے میں قدم رکھا اور آزادی کی فضا میں سانس لی
ایک خاکے لٹاؤ اس کی بغل میں موجود تھا جس میں اس
کی وہ چیزیں موجود تھیں جو اس کی ملکیت تھیں اور جنیل
والوں نے اسے واپس کر دی تھیں۔ اس نے سوارہ کی
حالت میں ایک طرف قدم بڑھا دیے۔

نیکسی کا پیپر گرش میں آیا تو اس کی رگوں میں
خون کی گردش بھی جیسے تیز ہو گئی۔ باپسی کا غبار ذہن
سے جھٹکنے والی بھر حال اپنے فلیٹ والی بلڈنگ کے
سامنے جھکی روکائی اور پھر وہ ایک چلا گیا بارکیٹ پہنچ
کر اس نے شیدہ بنوائی شیدہ خوانے سے چہرہ نکھریا تھا
لیکن اس کے رخساروں کی پڑیاں کچھ ابھرا آئی تھیں وہ
اوپر پارٹنٹ پہنچا اس کی سمر پڑھی عورت اپنے
دروازے میں کسی کام سے کھڑی تھی اسے دیکھتے ہی وہ
پلٹ کر اپنے فلیٹ میں گئی واپس آ کر اسے نے ایک
جالی جلال کو دیتے ہوئے کہا۔

”آپ کا نوکر دے گیا تھا گھر میں پیسے ختم ہو
گئے تھے تو وہ کبھی چلا گیا۔“ جلال نے طرے کے
ساتھ چالی نے لی سا پارٹنٹ کے بیرونی دروازے
کے نیچے مختلف بلوں اور فزوں کا پلندہ دیکھ کر اسے
اندازہ ہوا کہ گھر کی بجلی اور فون کٹ چکا ہے لیکن پانی
آ رہا تھا لہذا خوب سی گھر کر نکلیا تھا دھو کر اس نے
چھوٹے سے فلیٹ کا جائزہ لیا اور اسے ایک خوشگوار
حیرت ہوئی کہ نوکر نے کئی چیز غائب نہیں کی تھیں۔

کھانے پینے اور دوسرے معمولات سے فراغت
کے بعد اس نے سب سے پہلے بجلی کی بحالی کا
تلاش کی۔ فون کی بحالی کی بجائی میں دیر تھی۔ بجائی کو
بھانسنے کے بعد اس نے کھانا بنایا۔

نے ایک لان چیئر کو کھوکھو کر بھی ماری کرسی الٹ کر دور
جا گری۔ فرازیہ، نیل پائش کی شیشی اور برش پنج کراٹھ
کھڑی ہوئی وہ غصے سے کانپ رہی تھی۔ اس نے زور
سے اپنے نوکروں کو آواز دی مگر کسی نوکر کے نمودار
ہونے سے پہلے ہی جلال مڑا اور لمبے لمبے قدم اٹھا کر
ہوا گیٹ کی طرف چل دیا۔

اس کے اپارٹمنٹ کی تمام سہولیات بحال ہو گئی
تھیں مگر اس کے باوجود زندگی سے اس کا رابطہ تمام تر
کوششوں کے باوجود بحال نہیں ہوا۔ اس کے من میں
بدستور اندھیرا تھا اس کا دل بجھ گیا تھا۔ وہ روزانہ
بالکونی میں کرسی ڈال کر بیٹھ جاتا اور کھوئی کھوئی نظروں
سے رواں دواں ٹریفک کو دیکھتا رہتا اس کا بیشتر وقت
وہیں گزرتا۔ اس وقت بھی جبکہ شام کا دھند لکا پھیل
چکا تھا اور وہ وہیں بیٹھا تھا۔ دفعتاً کال تیل نے اسے
چونکا دیا پچھلے دنوں میں کوئی بھی اس سے ملنے نہیں آیا
تھا۔ چند لمحے بعد نوکر نے اسے اطلاع دی کہ کوئی
عورت اس سے ملنا چاہتی ہے۔ وہ پر اشتیاق انداز میں
اٹھ کر ڈرائنگ روم کی طرف لپکا مگر نوکر نے عورت کو
ڈرائنگ روم میں نہیں بیٹھایا تھا وہ بیرونی دروازے کی
طرف بڑھا وہ عورت راہداری میں ہی کھڑی تھی وہ نہ تو

عرشہ بلند اقبال تھی اور نہ ہی فرازیہ انعام احمد وہ شاید
کوئی بھکانا تھی۔ مفلوک الحالی نے سر سے پاؤں تک
اس کے وجود کو ڈھانپ رکھا تھا۔ اس کی گود میں ایک
بچہ تھا اس کے کپڑے موسم کے لحاظ سے ناکافی اور میلے
چیلے تھے اس کی ناک بہہ رہی تھی اور میل زدہ
رخساروں پر آنسوؤں کی لکیریں تھیں۔ عورت کا چہرہ
بتاتا تھا کہ زیادہ پرانی بات نہیں کہ ان لبوں کی لالی
گلاب کی چمکڑیوں کو شرماتی تھی۔

جلال نوکر کو آواز دینے ہی لگا تھا کہ وہ اس عورت
کو دس پانچ روپے دے کر رخصت کر دے مگر اسی لمحے
عورت کے خشک ہونٹ کپکپائے اور وہ آنسوؤں سے

”کھانسی اور تھذیب“
میں کہا جس میں غصہ بھی
میں اس



سیارہ ذابجٹ / اپریل ۲۰۱۶ء

بھگی آواز میں بولی۔ ”میں بڑی مشکل سے آپکا پتہ لگاتی ہوئی اور ڈھونڈتی ڈھانڈتی ہوئی یہاں تک پہنچی ہوں جلال صاحب۔“

جلال کو حیرت ہوئی کہ وہ اسے اس کے نام سے مخاطب کر رہی تھی عورت نے اس کی آنکھوں میں ابھرتا ہوا سوال پڑھ لیا تھا دیوار کا سہارا لیتے ہوئے وہ بولی۔

”میں سیٹھ صاحب کے ڈرائیور اعجاز کی بیوی ہوں۔ بیوی کیا بیوہ ہی سمجھئے آپ نے شاید اخبار میں پڑھا ہو کہ تین دن کے بعد اسے پھانسی دی جانے والی ہے میں ہی وہ عورت ہوں جس نے اسے تختہ دار تک پہنچایا ہے لیکن اگر میں ایسا نہ کرتی تو زندگی بھر دہری اذیت میں مبتلا رہتی اب اگر میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا ہے تو صرف اپنے کردار کی نفرت پر ہی کرتا ہے لیکن کم از کم یہ اطمینان تو ہے کہ اصل قاتل پھانسی کے تختے پر پہنچ رہا ہے خواہ وہ میرا شوہر ہی ہے۔“

”کیا مطلب ہے آپ کی باتوں کا، میں سمجھا نہیں۔“ جلال نے عجب سے لہجے میں کہا۔

عورت نے اپنی مٹکی سی چادر سے آنکھیں پونچھیں اور لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔

”میں نے اس وقت اخبار میں آپ کی تصویر دیکھی تھی جب آپ کو پھانسی کی سزا سنائی گئی تھی مجھے معلوم تھا کہ سیٹھ صاحب کا قاتل اعجاز ہے اور اس کے جیسے کی سزا ایک بے گناہ کو مل رہی ہے۔ پھر اعجاز نے مجھے تالے کنڈیوں میں بند کر رکھا تھا لیکن میں نے طے تصلوں سے اس کا جینا حرام کر دیا اچھے بیٹھے میں آپ کی تصویر اس کے سامنے کر دی اور کہتی دیکھ تو سہی کیسا خوب صورت جوان ہے۔ یہ بھی کسی ماں کا لعل ہوگا کسی کا دلبر و دلدار ہوگا کسی کا چہیتا ہوگا کسی کی آرزوؤں کا مرکز ہوگا اور یہ محض تھجے جیسے مکار اور بد دل کے لئے کی سمجھت چڑھ جائے گا۔ اسے تیری غیرت پر ایسی ہی چوٹ لگی تھی تو مجھے مار دیتا اور اگر سیٹھ ہی کو

مارنا تھا تو سینہ تان کر اس کی سزا میں پھانسی چڑھ جاتا مگر تو لومڑی کا بچہ ہے۔ مکار اور منحوس مجھے تیری صورت سے نفرت ہے۔“ ایک لمحے کے لیے وہ خاموش ہو گئی پھر اس نے رندھے ہوئے لہجے میں کہا۔

”جلال صاحب وہ یہ سب کچھ سننا تھا دانت پینا تھا اور غصے کے عالم میں میری طرف دیکھتا تھا میرا خیال تھا کہ کسی روز وہ مجھے بھی قتل کر دے گا مگر اس نے ایسا نہیں کیا اور ایک روز خود کو پولیس کے سامنے پیش کر کے اقبال جرم کر لیا اس سارے فساد کی جڑ میں ہوں جلال صاحب، میں۔“

آنسو اس کے رخساروں پر ڈھلک آئے تھے وہ بری طرح یا سیت کا شکار تھی اس کے لہجے میں بے پناہ کرب تھا۔ جسے جلال محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا اس نے پھر کہا۔

”نہ میں بھگتی نہ اتنا فساد کھڑا ہوتا۔ لیکن میں بھی کیا کروں جلال صاحب میری کھینے کو دے کی عمر تھی جب ماں باپ مر گئے اور میں دور پار کے رشتے داروں کے در پر ٹھوکریں کھانے کے لیے رہ گئی۔ انہوں نے جتنی جلدی ہو سکا مجھے بوجھ کی طرح سر سے اتار پھینکا بلکہ کچھ رقم بھی کھری کر لی میں کس جتنی تھوڑی سی پڑھی لکھی تھی شادی کے بارے میں میرے کچھ خواب تھے جلال صاحب بڑے معصوم سے خواب میں کسی پڑھے لکھے تعلیم یافتہ شخص کی بیوی بننے کے خواب دیکھتی تھی میری سہیلیاں مجھے احساس دلاتی رہتی تھیں کہ میں بڑی حسین ہوں میرا بیاہ کسی بابو صاحب سے ہو گا لیکن پھر میری شادی ایک کالے کلونے ڈرائیور سے کر دی گئی جو تقریباً چوبیس سمٹھے سیٹھ صاحب کی خدمت میں حاضر رہتا تھا۔ گھر میں غربت و افلاس کے سامنے تھے تقریباً ساری تنخواہ وہ گاؤں اپنے ماں باپ کو بھیج دیتا تھا اور تنخواہ بھی کیا ہی ملتی تھی۔ میں سیٹھ کے ڈرائیور رہتا تھا اسے بیچ گئی،

لیکن ظاہر ہے میرے پاس اس کے اس امر کوئی ثبوت نہیں تھا۔ میں جیل میں اپنی زندگی گمن رہا تھا میرے وکیل نے سپریم کورٹ میں دائر کر دی لیکن مجھے یقین تھا کہ کوئی فائدہ نہیں مجھے پھانسی ہو کر رہے گی۔

پھر ایک دن صبح میرا وکیل میرے پاس آیا اور نے بتایا کہ اعجاز نے پولیس کے سامنے پیش ہو کر افواہ جرم کر لیا ہے اور پھر میرے وکیل کا دوشوں سے جیل سے باہر آ گیا اور اب اعجاز کو پھانسی ہو جائے لیکن میری ایک درخواست ہے تم سے۔“ جلال نے کہا کہ عورت کچھ دیر کے لیے اپنا رونا بھول کر اس کی صورت دیکھنے لگی تھی۔ جلال نے پھر کہا۔

”اگر ہو سکے تو تم مجھے اپنالو۔“

”سک۔۔۔ کیا کیا کہا آپ نے؟“

”جو تم سن رہی ہو وہی کہا دیکھو ہم دونوں دنیا کی چمک میں اپنی ذکر سے بھگ گئے تھے لیکن اب ہماری زندگی میں کچھ بھی نہیں رہا۔ نہ اس دنیا میں تمہارا کوئی ہے نہ میرا میں نہیں یہ پیش کش کرتا ہوں کہ ہم دونوں مل کر ایک نئی زندگی شروع کر دیں جس میں خوشیاں ہی خوشیاں ہوں۔ اپنے لیے اس بچے کے لیے لاؤ اسے مجھے دو۔“

جلال نے بچہ اس کی گود سے لے لیا اور اسے پیار کرنے لگا پھر اس نے عورت کو دیکھ کر کہا۔

”چلو اب اندر یہاں کھڑی کھڑی میرا منہ کیا دیکھ رہی ہو۔ اندر چلو آج دو بیٹے ہوئے راہی پہلی مرتبہ ایک ساتھ اپنے گھر میں داخل ہونے لگے ہیں آؤ اندر آ جاؤ۔“

عورت تھوڑی دیر تک حیران سے انداز میں اسے دیکھنے لگی پھر اس نے اپنا چہونا سا بیگ اٹھایا اور جلال کے ساتھ فلیٹ کے دروازے سے اندر داخل ہو گئی۔

جس دکن بچل بلا مصداق

نیم

بہت سے لوگ مسز جین ڈکن کو امریکی جاسوس ادارے سی آئی اے کا ایجنٹ بھی کہنے لگے اور دعویٰ کرنے لگے کہ سی آئی اے دوسرے ممالک میں جو کچھ کر دانا چاہتا ہے وہ جین ڈکن کی پیش گوئی کے طور پر پہلے سے مشہور کر دیتا ہے تاکہ جو کچھ وہ کرنے لگا ہے اسے ”قسمت کا لکھا“ سمجھ لیا جائے۔

امریکی صدر کی بیٹی کا لکھنا کہ اسے قسمت کا لکھا ہے کہ وہ امریکی جاسوس ادارے کی ایجنٹ بنے گی۔

مستقبل میں کیا ہونے والا ہے جو لوگ یہ جانتا چاہتے ہیں، انہیں مژدہ ہو کہ اب ایک بنگالی بابا اور امریکہ میں بھی نمودار ہو چکا ہے جو اگرچہ بنگال میں پیدا تو نہیں ہوا مگر اس کی پیش گوئیوں کا ان دنوں بہت جرجا ہے۔ جسے ہم ”امریکہ کا بنگالی بابا“ کہہ

رہے ہیں وہ کوئی ایریا غیر ایما جھانگا نہیں بلکہ امریکہ کا صدر باراک اوباما ہے اور ہر چند کہ اس کی یہ قدر گوئی امریکہ کے ایوان بالا میں دیئے گئے اپنے پالیسی بیان یا ”سٹیٹ آف دی یونین خطاب“ میں کی گئی ہے مگر پیش گوئی تو پیش گوئی ہی ہوتی ہے جس



”استغفار کیجئے“

ایک دن صبح سو کے اٹھا تو بائیں بازو اور اس کے ساتھ سینے کے کچھ حصے میں شدید درد تھا۔ ایسا لگا کہ دل کا دورہ ہے۔ بھائی کو کہا کہ فوراً مجھے دل کے ہسپتال لے چلو۔ راستے میں ایک خیال آیا کہ کئی سال پہلے شغل میں ایک بندے کو ہاتھ دکھایا تھا تو اس نے ہاتھ دیکھ کر کہا تھا کہ تمہاری زندگی بہت کم ہے شاید اب میرا وقت آ گیا ہے۔

ہسپتال پہنچ کر پتہ چلا کہ یہ صرف غلط طریقے سے سونے کی وجہ سے پٹھے کا درد ہے۔ ایک دفعہ گھر میں بیوی سے کچھ ان بن ہو گئی جو کہ ہر گھر میں ہی تقریباً ہو ہی جاتی ہے۔ فوراً خیال ہاتھ دیکھنے والے کی کبھی ایک بات کی طرف چلا گیا کہ تمہاری شادی کامیاب نہیں ہو پائے گی۔ مگر کچھ دیر بعد ہم دونوں میں صلح ہو گئی۔ حاصل بحث یہ ہوا کہ بھلے ہی ہم نے وہ کام شغل میں کیا لیکن شیطان نے اس عمل کو سنبھال کر رکھا اور مہلک جتھیا ر بنا کر عین موقع اور وقت پر عین ایمان کے اوپر حملہ کیا۔ اسی لیے اگر کبھی آپ نے بھی یہ حرام کام خواہ مذاق یا ازارہ تجسس ہی کیا ہو تو اللہ سے استغفار کیجئے کیونکہ ام المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

”جو (مستقبل کی باتیں) بتانے والے کسی (نجوی) کے پاس آیا اور اس سے کچھ پوچھا تو اس کی چالیس دن تک نماز قبول نہیں ہوگی۔“

(صحیح لمسلم حدیث نمبر 5773- کتاب السلام)
(تحریر: زاہد علی خان- سوات)

گرد گرد ہوں کی پناہ گاہ بنیں گے کی علامت
بحران کی پلیٹ میں آئیں گے یا پھر قحط سالی اور بے
گزینیوں کی نئی لہر کا سامنا کریں گے۔“
یادش بخیر کسی زمانے میں ایک امریکی خاتون
مسز جین ڈکن کا بڑا شہرہ تھا جو اپنے شیشے کے گؤ-
میں دیکھ کر مستقبل میں پیش آنے والے حالات ک
پیش گوئی کیا کرتی تھی اور یہ پیش گوئیاں بڑی حد تک
سچی ثابت ہوتی تھیں۔ لوگ بہت حیران ہوتے
کہ بھلا وہ کس طرح مستقبل قریب یا مستقبل بعید

وارداتوں، جاسوسی سرگرمیوں اور سربراہان مملکت کے قتل کے بارے میں ٹھیک ٹھیک پیش گوئیاں کرتی ہے۔ امریکہ اور یورپ میں ایسے مستقبل بین افراد کی بڑی قدر کی جاتی ہے ان کی پیش گوئیوں کے سچ ثابت ہونے پر ان کی شہرت بھی بڑھتی جاتی ہے وجہ یہ ہے کہ ہمارے ملک کی طرح یہ لوگ فٹ پاتھ پر بیٹھ کر طوطے سے لفافہ اٹھا کر پیش گوئی نہیں کرتے۔ چنانچہ جین ڈکسن کی پیش گوئیاں سچ ثابت ہونے لگیں تو انہیں بھی عالمی شہرت مل گئی۔ البتہ اس شہرت میں کسی حد تک رسوائی بھی یوں شامل ہوگئی کہ بہت سے لوگ مسز جین ڈکسن کو امریکی جاسوس ادارے سی آئی اے کا ایجنٹ بھی کہنے لگے اور دعویٰ کرنے لگے کہ سی آئی اے دوسرے ممالک میں جو کچھ کروانا چاہتا ہے وہ جین ڈکسن کی پیش گوئی کے طور پر پہلے سے مشہور کر دیتا ہے تاکہ جو کچھ وہ کرنے لگا ہے اسے ”قسمت کا لکھا“ سمجھ لیا جائے اور بھلا قسمت کے لکھے سے کون لڑ سکتا ہے!

اس پر ہمیں وہ نیک بی بی یاد آئی جو ایک رات گھر والوں کے سو جانے کے بعد چپکے سے اپنے آشائے کے ساتھ فرار ہوگئی تھی۔ اگلی صبح جب وہ گھر میں نہ پائی گئی تو آس پاس اس کی تلاش کی گئی جو ظاہر ہے بے سود رہی البتہ مسائے اظہار ہمدردی کے بہانے جب حق مساویہ ادا کرنے کی خاطر اس کے گھر پہنچے تو اس کی ماں نے اس کے غیاب کا تھوڑا بہت واویلا کرنے کے بعد بڑے عارفانہ لہجے میں کہا کہ ”اے لوگو! میری بیٹی نے جو بھی کیا وہ الگ بات“ لیکن وہ بھی بڑی ہی اللہ والی اسے آنے والے وقت کا پہلے سے پتہ چل جاتا تھا“ کئی دنوں سے مجھ سے

ایسی پیش گوئیاں کرنے میں ہماری پولیس بھی بڑی ذہین ہے جسے ”پکس“ کہا جائے تو زیادہ اچھا لگتا ہے کسی یورپی ملک میں جرائم کی سطح کتنی کے موضوع پر ایک کانفرنس ہو رہی تھی۔ امریکی پولیس چیف نے فخریہ کہا کہ ہم جرم کے ارتکاب کے چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر مجرموں کا سراغ لگا لیتے ہیں، برطانوی شریف نے کہا کہ ہمیں اس کام میں محض بارہ گھنٹے لگتے ہیں، اطالوی پولیس کمشنر نے اکر کر دعویٰ کیا کہ ہمارا نظام اتنا بے عیب ہے کہ ہم تو تین گھنٹے کے اندر اندر مجرموں کو گرفتار بھی کر لیتے ہیں۔ پاکستانی پولیس چیف یہ سب سن کر مسکراتا رہا اور جب اس کی باری آئی تو بولا ہمیں تو کسی واردات سے پہلے ہی معلوم ہوتا ہے کہ کون ایسا کرنے والا ہے۔

امریکہ کے بنگالی بابا نے جو کچھ کہا اب ہم اس پر بھلا کیا تبصرہ کریں؟ بہتر یہی ہے کہ قارئین کو مسز جین ڈکسن کی پیش گوئیوں کی حقیقت ہماری پولیس کی تقیتی مہارت اور گھر سے بھاگنے والی کی ”اللہ والی“ ہونے کے بارے میں اس کی ماں نے جو کچھ کہا تھا اس پر غور و خوض کرنے اور اپنی عقل کے گھوڑے دوڑانے کے لئے کھلا چھوڑ دیں، ہمیں یقین ہے کہ بہت سے عاقل بالغ لوگ بھی بنگالی بابا کے بیان سے وہی نتائج اخذ کریں گے جو ہم جیسے کم فہم نے کئے ہیں اور مستقبل میں اپنے وطن عزیز پر مزید آفات، مزید دہشت گردی، مزید دھماکوں، مزید معاشی بد حالی کا سامنا کرنے کے لئے تیار رہیں گے کہ بنگالی بابا جو کہتا ہے اس کے بعد یہ بھی کہتا ہے کہ ”مستند ہے میرا فرمایا ہوا۔“

”گمشدہ قبر“

”گمشدہ قبر“

نواز خان

وہ کالے پانی کا قیدی تھا اور اس کے سینے میں ایک راز دفن تھا۔ وہ راز جاننے کے لئے ضروری تھا کہ قیدی کو رہا کرایا جائے۔

ہم دونوں گاڑی سے نیچے اتر آئے۔ نوجوان محکوم کرڈکی کی طرف آیا اور چابی لگا کر ڈکی کھول دی۔ ڈکی کا منظر دیکھ کر میری آنکھیں حیرت سے کھل گئیں۔ وہاں جولڑی مڑی تری بڑی تھی وہ کوشیلا تھی۔ وہ سرخ اسکرٹ پہنے ہوئے تھی۔ اس کا بالائی جسم چست اسکرٹ میں پھنسا ہوا تھا اور اسکرٹ سے نیچے ٹانگیں عریاں تھیں۔ جونہی ڈکی کھلی کوشیلا نے تڑپ کر باہر نکلتا چاہا لیکن نوجوان نے اسے دھکیل کر دوبارہ ڈکی میں گرا دیا۔

”خبردار“ وہ اس کی کینٹی پر رپوٹ اور رکھتے ہوئے غریباں ”چنگلی لٹی“ رہو ورنہ مار کر پیس چھینک ڈوں گا۔“ کوشیلا پر اس دمکی کا مطلق اثر نہیں ہوا اس نے حلق کی پوری قوت سے چیختے کیلئے منہ کھولا تاہم نوجوان نے بروقت ڈکی بند کر دی۔ کوشیلا کی زوردار چیخ ڈکی کے اندر ہی گونج کر رہ گئی۔

”آؤ چلیں۔ اب یہ لڑکی ہمیں جین سے نہیں رہنے دے گی۔“ نوجوان نے کہا اور مجھے لے کر پھر گاڑی میں آ بیٹھا۔ چند ہی لمحے بعد اسپتال گاڑی سڑکوں پر فرائے بھرتی نامعلوم سمت میں جاری

تھی۔ ڈکی سے مسلسل دھماچو کڑی کی آوازیں آرہی تھیں۔ تڑپنے جھلنے کے ساتھ ساتھ کوشیلا چیخ و پکار بھی کر رہی تھی۔ اگر وہ ڈکی سے باہر ہوتی تو شاید یہ چیخ و پکار سن کر جزیرے کی ساری پولیس ہمارے پیچھے لگ گئی ہوتی لیکن اب یہ آوازیں بمشکل ہم تک ہی پہنچ رہی تھیں۔

قریباً نصف گھنٹے بعد ہم ایک شاندار کوشی میں بیٹھے تھے۔ یہ سرکاری کوشی تھی اور نوجوان پولیس آفیسر کو رہائش کے لئے ملی ہوئی تھی۔ نوجوان کا نام سنت سنگھ تھا اور وہ عہدے کے لحاظ سے انسپکٹر تھا۔ ایک انسپکٹر کا ایسی عالی شان کوشی میں رہنا کچھ عجیب لگتا تھا۔ تاہم بعد میں معلوم ہوا کہ ”کالا پانی“ جیسی

دور دراز خواتین جگہ پر ڈپوٹی انجام دینے والے سرکاری اہلکاروں کو خاص سہولتیں اور آسائشیں فراہم کی جاتی ہیں۔ سنت سنگھ کوشیلا کو پہلے سے جانتا تھا اس نے راستے میں مجھے بتایا تھا کہ کوشیلا ایک چالاک عیار کال کرل ہے۔ ماضی میں جزیرہ کے کئی سول اور فوجی افسروں سے اس کے تعلقات رہے ہیں لیکن اب ڈیڑھ دو سال سے وہ مونڈ بوٹ

نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا ”بھئی! میں نے تو آج تک کسی عورت پر ہاتھ نہیں اٹھایا! اگر تم اس سے کشتی لڑنا چاہتے ہو تو بخوشی لڑ سکتے ہو۔“ سنت سنگھ نے ہنسنے ہوئے کہا ”اس کی نوبت ہی نہیں آئے گی کہ برادر! اس کم بخت کا بڑا کارگر علاج میرے پاس موجود ہے۔“

پھر اس نے اپنے ایک ملازم کو آواز دی۔ ادھیڑ عمر ملازم اندر آیا تو سنت سنگھ نے اس کے کان میں کچھ کہا۔ ملازم باہر چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد باؤنڈریس کا ایک بے حد تنیم کتا لے کر اندر آ گیا۔ یہ کتا غیر معمولی طور پر ذہنی اور قد آور تھا۔ اس کی سرخ آنکھوں میں جھانک کر ایک کچھ سی جسم پر طاری ہو جاتی تھی۔ کتے کو دیکھ کر کوشیلا کے

ہونٹوں سے دلی دبی دبی نکل گئی اور وہ جو چند لمحے پہلے بہت غصے میں نظر آرہی تھی ایک دم ہلکی کی طرح زرد ہو گئی۔ ظاہر ہے وہ ایک چلتی پھرتی لڑکی تھی۔ اسے مار پیٹ کا خوف تھا اور نہ اپنی عزت کے جانے کا۔ یہ بھی اسے یقین تھا کہ ہم اسے قتل نہیں کر سکتے یہی وجہ تھی کہ وہ دلیر نظر آرہی تھی۔ مگر اب ایک خنخوار کتے کو سامنے دیکھ کر اس کی کھسی بندھ گئی۔ کوشیلا کے سرخ اسکرٹ کو دیکھ کر کتا اور زیادہ متعجب ہو گیا اور اس کے حلق سے دھیمی دھیمی مسلسل غراہٹ بلند ہونے لگی۔ یہ آواز جیسے کسی

بہت بڑے کنویر سے آرہی تھی اور اپنے اندر عجیب درندگی سمیٹے ہوئے تھی۔ کوشیلا نے چلا کر اپنی ٹانگیں صوفے پر چڑھائیں سنت سنگھ کے اشارے پر اس کے ملازم نے کتے کی زنجیر کو لپکا سا جھکا دیا۔ کتے کی ڈم سے تیزی سے گردش کی اور وہ زوردار آواز میں بیونکا ہوا کوشیلا پر حملہ آور ہوا۔ اس نے جب اپنے دونوں اگلے پچھے اٹھائے تو اس کا قد چھ فٹ سے بھی بلند نظر آنے لگا۔ کوشیلا کی

ہاتھ کے مالک عبداللہ نصیری کے پاس تھی۔ یہ کتا کوشیلا کی ہوشیاری چالاک سے واقف تھا اس نے اسے ڈکی سے اس وقت تک نہیں نکالا کہ اس کے دونوں ہاتھ پشت پر باندھ دیے گئے۔ پھر بھی وہ جنگی بلی کی طرح غرا ہوا اور اچھل کھل کر سنت سنگھ پر حملے کی کوشش کر رہی تھی۔ کوشی کی لٹت گاہ میں پہنچ کر انسپکٹر نے کتے اسے صوفے پر دھکیل دیا۔

انسپکٹر مارکٹ کنڈھے سے پھینکا ہوا تھا۔ اس کا ایک بازو بھی چند خراشیں موجود تھیں لگتا تھا کہ کتے سنت سنگھ کے ساتھ اس کی مار کھائی بھی ہو چکی ہے۔ سنت سنگھ نے کھانا نہ کچھ میں پوچھا۔

”اس شخص کو جانتی ہو؟“ سنت سنگھ کا اشارہ کیا کہ کتے کو جانتی ہو۔

”ہاں میں نے دی تھی اور ڈکے کی چوٹ پر دی گئی۔ اور اب تو صرف اطلاع ہی دی ہے جو کئی میرا کتا چلا اس کے ہاتھ پاؤں تو ذکر اسے سمندر میں ڈال دیں۔ نہ بھگوان تو میرا نام کوشیلا نہیں۔“ ”تم کو نہیں کر سکتی ہو؟“

”اگر اس شرط ہے۔“ وہ غرائی ”تم میرے کتے کو کھال دوا بھی اس کے ناک منہ سے خون نہ بہاؤ تو میں تم کو کھال دے دوں۔“

وہ جھوڑ کر اٹھ کر دوڑ نہیں تھا۔ نہ ہی کوئی یہ کہتا تھا کہ اس کے لڑکیاں بھی لڑائی بھڑائی میں ماہر ہیں۔ لیکن یہ لڑکی کسی اور ہی ٹاپ کی تھی۔ وہ لڑکی بھی تھی لیکن پھر بھی ہمیں دھمکا رہی تھی اور اس کا پہنچ کر رہی تھی۔ سنت سنگھ نے مسکراتی

میں کردی جائے۔

کل رات جب انسپکٹر سنت سنگھ نے اسے انگریز افسر کی کونھی سے نکلنے دیکھا تو اس نے بھی خیال کیا کہ وہ افسر کو اس کیخلاف سیکھا پڑھا کر نکلی ہے۔ وہ اس سے بہت تنگ آچکا تھا۔ تنگ آمد جنگ آمد کے مصداق اس نے کوشیلا پر ہاتھ ڈالنے کا فیصلہ کر لیا۔ ایک مناسب جگہ پر اس نے کوشیلا کو دوپچا اور اسے اپنے ساتھ لے جانا چاہا۔ کوشیلا نے زبردست مزاحمت کی۔ سنت سنگھ کے ایک ساتھی نے عقب سے کوشیلا کے سر پر چوٹ لگائی جس سے وہ بے ہوش ہو گئی۔ ان دونوں نے اسے ڈگی میں ڈال دیا۔ کوشیلا کے لباس کی تلاشی سے انہیں ایک خط بھی ملا یہ خط کوشیلا نے اپنی ایک دوست کو لکھا تھا لیکن ابھی پوسٹ نہیں کیا تھا۔ اس طویل خط سے یہ انکشاف ہوا کہ کوشیلا انگریز افسر سے کسی اور سلسلے میں ملاقات کر کے آ رہی تھی۔ حیات خاں نامی ایک شخص نے (یعنی میں نے) موٹر بوٹ میں اس کی بے عزتی کی تھی اور عبداللہ نصیری سے اسے ڈانٹ پلوائی تھی۔ حیات خاں غیر قانونی طور پر ”کالابانی“ آیا تھا۔ اب کوشیلا نے اس کی تجویز کر کے اسے گرفتار کرانے کی کوشش کی تھی۔ بعد ازاں اس خط کی تصدیق بھی ہو گئی۔ اعلیٰ افسران کی طرف سے انسپکٹر سنت سنگھ سمیت کچھ پولیس اہلکاروں کو یہ حکم ملا کہ وہ عبداللہ نصیری کی رہائش گاہ پر چھاپے ماریں اور وہاں سے حیات خاں کو (یعنی مجھے) گرفتار کر لیں۔

..... خیراب میں کوشیلا کے معاملے کو کچھ دیر کے لئے ایک طرف رکھتا ہوں۔ کالابانی اور جزیرہ ہدو میں میرے آنے کا اصل مقصد اس شخص کی تلاش تھا جسے ناکردہ گناہ کی سزا میں کالابانی بھیجا گیا تھا۔ وہ شخص یہاں نہانے کس تاریک کونجری میں بند تھا اور اس کے ساتھ ہی اس اجتماعی قبر کا راز بھی دفن تھا جو

آئندہ دہشت سے بچتی ہوئی تھیں اور وہ ہندیائی انداز میں چلتی چلی جا رہی تھی۔ تین چار منٹ یہ کش مکش جاری رہی کبھی کتا کوشیلا کے بالکل نزدیک پہنچ جاتا کبھی ملازم اسے کھینچ کر پیچھے ہٹا لیتا۔ کتے کا خوف کوشیلا کیلئے تھوڑا ڈرگری سے بڑھ کر اذیت ناک تھا۔ سنت سنگھ نے اس کے سامنے چند سادہ کاغذات اور قلم رکھ دیا اور کہا کہ وہ اپنی جان چھڑانا چاہتی ہے تو ان کاغذات پر دستخط کر دے۔ پانچ منٹ کے اندر اندر کوشیلا نے تمام کاغذات پر دستخط کر دیے۔ اس کے بعد ایک تحریر شدہ کاغذ لایا گیا اور اس پر دستخط کرائے گئے۔

سنت سنگھ نے مجھے بتایا کہ کوشیلا کسی ناممکن کم نہیں لیکن سادے کاغذات پر دستخط کرا کے اس نے اس ناممکن کے دانٹ نکال دیے ہیں۔ کوشیلا کو چھوڑ دیا گیا تھا اور وہ واپس عبداللہ نصیری کے پاس موٹر بوٹ پر چلی گئی تھی۔ جہاں تک میرا سوال ہے میں سنت سنگھ کی کونھی میں بالکل محفوظ تھا۔ حالات سے اندازہ ہو رہا تھا کہ جزیرہ ہدو میں جگہ جگہ تلاشی ہو رہی ہے لیکن تلاش کرنے والوں کے خیال میں بھی نہیں آ سکتا تھا کہ میں ایک ایسے شخص کے گھر میں ہوں جو ان کے ساتھ مل کر تلاش کے کام میں مصروف ہے۔

انسپکٹر سنت سنگھ نے مجھے کوشیلا کے بارے میں جو کچھ بتایا اس سے پتہ چلا کہ اس نے کوشیلا کو ایک انگریز افسر کی کونھی سے نکلنے ہوئے پکڑا تھا۔ دراصل کوشیلا اور انسپکٹر سنت سنگھ میں پرانی چپقلش چلی آ رہی تھی ایک موقع پر انسپکٹر سنت سنگھ نے کسی بات پر ناراض ہو کر کوشیلا کو تھپڑ مار دیا تھا جس اس وقت سے وہ انسپکٹر کے اعلیٰ افسروں کو اس کیخلاف بھڑانے میں لگی رہی تھی۔ اس کی کوشش تھی کہ انسپکٹر سنت سنگھ کی تبدیلی ایک دوسرے جزیرے فریلاں

سیارہ ڈائجسٹ کی ایک اور عظیم پیشکش

فرمان الہی

۱۱ مئی ۲۰۱۶ء

قرآن کے اہم موضوعات

- ★ وہ قرآنی احکام جن کا جاننا ایمان، اعتقاد اور اعمال درست رکھنے کیلئے انتہائی ضروری ہے۔
- ★ اس نمبر کا مقصد پیغام الہی تک ایک آسان راستہ فراہم کرنا ہے اپنی مرضی کا عنوان فہرست میں دیکھیں اور قرآن کی تمام متعلقہ آیتوں پر غور کر لیں۔
- ★ اس نمبر میں کلام الہی عربی متن اور اردو میں انتہائی آسان عام فہم اور دلکش پیرائے میں پیش کیا گیا ہے۔
- ★ اللہ تعالیٰ کی رضا کے مطابق زندگی بسر کرنے کیلئے اس نمبر کا مطالعہ ہر ایک کے لئے ضروری ہے۔

37245412

سیارہ ڈائجسٹ 240 ریلوے کارڈز مین مارکیٹ لاہور فون نمبر: 37245412

سیارہ ذابجٹ / اپریل ۲۰۱۶ء

روشنیاں گل ہو گئیں۔ دھواں دھار بارش سے بچنے کے لئے پھریدار بھی کونوں کھدروں میں چھپ گئے تھے۔ ایسے میں ایک قیدی جس نے اپنی زنجیر پلے سے کاٹ رکھی تھی ہسپتال سے فرار ہو گیا۔ وہ ریاض عثمانی تھا۔ مقامی پولیس جو اپنی خست گیری میں مشہور ہے اسے دھوڑنے کی سرتوڑ کوشش کر رہی تھی لیکن اسے ابھی تک کامیابی نہیں ہوئی تھی۔

یہ بالکل نئی صورتحال سامنے آئی تھی۔ میں ریاض عثمانی سے ملنے اور اس کی مدد کرنے کے لئے اتنا طویل سفر کر کے یہاں تک پہنچا تھا اور وہ یہاں ایک لاپتہ شخص تھا۔ سنت سکھ کی زبانی مجھے پتہ چلا کہ جیل میں ایک راجہ نامی شخص سے ریاض عثمانی کی ان بن ہوئی تھی اور راجہ نے عثمانی سے مار پیٹ بھی کی تھی۔ یہ راجہ جیل میں مقدم تھا۔ جیسا کہ اکثر قارئین جانتے ہوں گے مقدم وہ قیدی ہوتا ہے جسے کچھ اختیارات دے کر دیگر قیدیوں پر نگران بنا دیا جاتا ہے۔ بعض ایسے نگرانوں کو خاص وردیاں فراہم کی جاتی ہیں اور کالا پانی میں ایسے نگرانوں کو یہ رعایت بھی حاصل تھی کہ وہ جیل سے باہر اپنے گھر میں رات گزار سکتے تھے۔ اتفاقاً راجہ کا گھر زیادہ دور نہیں تھا۔ انسپکٹر سنت سکھ کی کوٹھی کے پیچھاڑے ایک بڑبڑہ فرلاگ کے فاصلے پر "ناڈو" نام کی کالونی میں راجہ کا کوارٹر تھا۔ انسپکٹر سنت سکھ نے مجھے کوارٹر کا نمبر بھی بتا دیا۔ اس نے مجھے راجہ کی ایک تصویر بھی دکھائی جو اس کی فائل میں لگی ہوئی تھی۔

انسپکٹر سنت سکھ کی ڈیوٹی رات کی تھی۔ ایک رات جب وہ ڈیوٹی پر چلا گیا تو میں کوٹھی سے نکلا اور پوچھتا پچھاتا ناڈو کالونی تک جا پہنچا۔ بے شک جزیرے میں میری تلاش بوری ہی نہیں میری شکل و صورت سے صرف وہ دو تین سپاہی ہی واقف تھے جن سے میری "مکہ" لات" ہوئی تھی۔ باقی لوگوں

سیارہ ذابجٹ / اپریل ۲۰۱۶ء

حیرت ہوئی کہ عباس علی ریاض عثمانی کے بارے میں جانتا ہے اور اسے یہ بھی معلوم ہے کہ راجہ اور ریاض عثمانی میں پچاس رسی ہے۔ دراصل عباس بھی جیل ہی کی نوکری کرتا تھا اور جیل کے مٹے چنے مسلمان قیدیوں کے بارے میں اسے بیشتر معلومات حاصل تھیں۔ اس نے بتایا کہ راجہ نے ایک عرصہ قیدی رہتے ہوئے ریاض عثمانی کا اس سے جھگڑا ہو گیا۔ مقدم راجہ نے ریاض عثمانی کے گریبان میں ہاتھ ڈال دیا۔ دونوں میں مارا ماری ہوئی۔ راجہ نے گھوٹا مار کر ریاض کے دو دانت توڑ ڈالے۔

بعد ازاں جیل کے قانون کے مطابق ریاض کو ایک ماہ قید تنہائی کی سزا بھی ہوئی۔ تاہم ریاض عثمانی چونکہ پڑھا لکھا تھا اور انگریزی بھی لکھ پڑھتا تھا لہذا اس سے نرم رویہ اختیار کیا گیا۔ نہ تو اسے کڑوں کی سزا ہوئی اور نہ راتیں وغیرہ میں کی کی گئی۔ ذرا توقف کر کے میرے میزبان نے مقدم اور عثمانی میں کشیدگی کی اس واقعہ کے بعد سے راجہ اور عثمانی کی کشیدگی بھی بلکہ مجھے تو شک ہے کہ عثمانی کی بیماری کا باعث بھی راجہ ہی تھا۔ ہو سکتا ہے کہ اس نے عثمانی کو کوئی زہریلی چیز کھلا دی ہو۔ اس کے لئے ایسا کرتا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ وہ لنگر خانے میں بھی کام کرتا تھا اور لاگروں سے اس کے قریبی تعلقات تھے۔ میں نے پوچھا "عثمانی کو ہوا کیا تھا؟"

"دست اور التیاس لگ گئی تھیں۔" عباس علی نے جواب دیا۔ "ایک ہی روز میں برسوں کا بیمار نظر آنے لگا تھا اسے ہسپتال نہ پہنچایا جاتا تو شاید زندہ ہی نہ بچتا۔"

میں نے کہا "عباس علی صاحب! پھر تو ایک اور بات بھی سوچی جاسکتی ہے ممکن ہے کہ عثمانی ہسپتال سے فرار نہ ہوا ہو۔ اسے اغوا کر لیا گیا ہو جیسا کہ آپ بتا رہے ہیں راجہ کافی اثر و رسوخ والا شخص ہے

جس نے اپنی ہی تھی تھا۔ نہ کسی کے پاس میری کوئی کوئی اور نہ شامت۔ رات قریباً دس بجے میں ایک آگنی روزارے پر دستک دی۔ چھوٹے قد کا لکڑی ہندوستانی باہر نکل آیا۔ نجانے کیوں نہ کیا کہ مجھے یقین ہو گیا کہ وہ راجہ نہیں ہے بلکہ اسے راجہ کے بارے میں پوچھا وہ پہلے تو لڑنے لگا تھا رہا پھر پوچھنے لگا "راجہ سے تمہیں کیا پتا ہے۔"

پھر بولا راجہ تو دو ہفتے پہلے یہ کوارٹر چھوڑ کر ہٹا ہے اور مجھے شک ہے کہ یہ نہیں کہ وہ کدھر گیا ہے۔ اسی دوران بارش ہونے لگی رات کا وقت تھا پڑا نہیں چلا کہ مطلع آ رہا تو وہ اب آتا تھا قدرت تیرا پڑنے لگا۔ صاحب خانہ نے مجھے گھبراہٹ سے کہنے کی دعوت دی۔ میں اندر چلا گیا۔ کوئی کوئی خاتون بھی موجود تھی لہذا مجھے بیشک ہنسی چلا گیا۔ صاحب خانہ کا نام عباس علی تھا۔ وہ ایک بڑبڑہ قیدی تھا لیکن پڑھا لکھا تھا لہذا اسے ایک دفتر میں ملک کی نوکری مل چکی تھی۔ اچھی بھلی نوکری دہنے کے لئے کوارٹر تھا اور شادی یا "نارایان" کرنے کی بھی اجازت تھی۔ شرط صرف اتنی کہ اس کی بیوی کا تعلق جزیرہ اندمان سے ہو۔ والدی ہندوستانی بیوی کو اندمان میں نہیں لاسکتا تھا اور نہ خود وہاں جاسکتا تھا۔ جزیرہ اندمان کے بیشتر بڑے گھسے قیدیوں کو یہ ہولتیں حاصل تھیں بلکہ ان میں سے کئی تو ان جزیروں میں ایک خوشحال اور مطمئن زندگی گزار رہے تھے۔

باقول باتوں میں عباس اور میں سمجھ مل گئے۔ میں نے عباس کو بتا دیا کہ میں یہاں ریاض عثمانی نام کے ایک قیدی کو ملے آیا ہوں (لیکن نہیں بتایا کہ غیر قانونی طور پر آیا ہوں) میں نے اس پر ظاہر کیا کہ عثمانی میرا کوئی قریبی عزیز ہے مجھے یہ جان کر

امرتسر کے نواحی جنگل میں واقع تھی اور اپنے پیٹ میں کم از کم آٹھ انسانی لاشیں چھپائے ہوئے تھی۔ سنت سکھ مجھے ایک مخلص اور بے لوث دوست نظر آ رہا تھا لہذا میں نے اس سے کچھ بھی نہیں چھپایا۔ شروع سے آخر تک سب کچھ بتا دیا یعنی کس طرح ریاض عثمانی نامی رپورٹر شراب کی بیٹیوں کا کھوج لگاتا ہوا امرتسر کے ایک نواحی علاقے میں پہنچا اور وہاں اس نے ایک انگریز افسر کو آٹھ دیہاتیوں کے خون سے ہاتھ رنگتے اور انہیں مشرک قبر میں دفناتے دیکھا۔ پھر کس طرح اس رپورٹر کو چھوٹے مقدمات میں پھنسا کر "کالے پانی" کی سزا دی گئی اور اب اس بد نصیب قیدی کے لاوارث بیوی بچوں کو کیسی کیسی اذیتوں سے گزارا جا رہا ہے۔ میں نے سنت سکھ سے کلثوم کا ذکر کیا اور اس کی معصوم بچی حیدہ کا بھی جسے آصف خاں نے انگریز افسر مسز راک کی آشر باد سے زندگی کا نشانہ بنایا تھا۔

میری اس کھانکھانہ سنت سکھ پر خاطر خواہ اثر ہوا اور وہ "جزیرہ ہڈ" میں ہر طرح میری مدد کرنے پر تیار گیا۔ اس نے اپنے ذرائع استعمال کئے اور ایک ہی روز میں پتہ چلا لیا کہ ریاض عثمانی جزیرے کی کس جیل میں اور جیل کے کون سے حصے میں ہے۔ اپنے وعدے کے مطابق اگلے روز سنت سکھ نے مجھے عثمانی سے ملنا تھا لیکن ان روز وہ میرے لئے کوئی اچھی خبر نہ لاسکا۔ اس نے بتایا کہ عثمانی وہاں نہیں ہے قریباً تین ماہ پہلے وہ شدید بیمار ہو گیا تھا اور اسے جیل سے ہسپتال میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ ہسپتال سے پتہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ وہ وہاں بھی نہیں ہے۔ اس کے بعد سنت سکھ نے ریکارڈز میں جھان بین کروائی۔ اس جھان بین سے ایک اور غمناک خبر انکشاف ہوا۔ پتہ چلا کہ عثمانی جیل کے ہسپتال سے فرار ہو گیا تھا۔ وہ ایک طوفانی رات تھی ہسپتال کی

سیارہ ڈائجسٹ / اپریل ۲۰۱۶ء

یہاں ویسے ہی سیاہ و سفید کے مالک ہیں ان کا خیال ہے قیدی عورتوں سے ”تفتیش“ کرنے کا صحیح طریقہ یہی ہے۔

میں نے نرس ہیم کے بارے میں عباس علی سے کچھ معلومات مزید حاصل کیں اور پھر اس سے رخصت ہو کر باہر آ گیا۔ رات کے بارہ بج چکے تھے۔ اس وقت کسی عورت کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹانا مناسب نہیں تھا لہذا میں اسپیکر سنت سنکھ کی کوئی دھمکی آگیا۔

ہیم نامی نرس سے میری ملاقات اگلے روز رات نو بجے ہوئی۔ اس رات پھر بارش ہو رہی تھی تاہم میں مکمل انتظام کر کے نکلا تھا۔ پرسانی کے علاوہ میرے پاس ٹارچ اور چھتری بھی تھی۔ میری دستک پر ایک درمیانی عمر کی عورت نے دروازہ کھولا یہی ہیم تھی۔ اس کے نقوش بہت اچھے نہیں تھے لیکن رنگ گورا چٹا اور جسم گدرایا ہوا تھا۔ میں نے اس سے اپنا تعارف اسی حیثیت سے کرایا جس حیثیت سے عباس علی سے کرایا تھا یہ جان کر کہ میں عثمانی کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے آیا ہوں ہیم شکر نظر آنے لگی شاید اس کا خیال تھا کہ یہ بھی پولیس کی کوئی چال ہے۔ میں نے اپنی تمام صلاحیتیں صرف کر کے اسے اپنے بارے میں مطمئن کرنے کی کوشش کی اور اس کوشش میں کافی حد تک کامیاب رہا۔

وہ مجھے کوارٹر کے اندر لے آئی اس کے ساتھ دو اور عورتیں بھی کوارٹر میں مقیم تھیں۔ ایک نرس تھی اور دوسری ہسپتال میں دایہ کا کام کرتی تھی۔ یہ ایک ادیبہ عرصہ عورت چاکلی کور تھی۔ چاکلی کور نے مجھ سے بہت مکمل کھلا کر باتیں کیں اس نے انگریز افسروں کو بے تحاشا سلوا میں ستائیں اور ہیم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ حرمیوں نے اس

کیا ہے اس نے اپنے کارندوں کے ذریعے عثمانی کو ہسپتال سے اٹھایا ہوا اور مار کر کہیں گاڑ دیا ہو۔“

عباس کے چہرے پر ابھرنے کے آثار نظر آنے لگے بولا ”میں اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا ویسے یہ بات ایسی نامکن بھی نہیں ہے۔ اس معاملے کی اچھی طرح چھان بین کی جائے تو بہت کچھ سامنے آ سکتا ہے۔“ میں نے کہا ”سنا ہے پولیس بھی چھان بین کر رہی ہے۔ انہوں نے کیا نتیجہ نکالا ہے؟“

”نتیجہ خاک کھٹا ہے۔“ عباس نے جواب دیا۔ ”نتیجہ اس وقت کھٹا ہے جب تفتیش غیر جانبداری سے کی جائے یہاں کی پولیس کو تو مسلمان قیدیوں کیخلاف کیس بنانے کے علاوہ اور کوئی کام ہی نہیں ہے۔ بہانے بہانے سے مسلمانوں کو مقدمات میں پھنساتے ہیں اور سخت سزاؤں دیتے ہیں۔ اب یہ عثمانی والا سلسلہ ہی دیکھ لیں ہسپتال سے دو نرسوں اور ایک ڈاکٹر کو گرفتار کیا گیا۔ ان پر الزام تھا کہ وہ عثمانی کے فرار میں ملوث ہیں۔ انہیں قاتلوں میں زبردست تشدد کا نشانہ بنایا گیا وہ تینوں مسلمان ہیں۔“

میں نے پوچھا ”اب وہ تینوں کہاں ہیں؟“ عباس نے بتایا ”دونوں نرسوں کو تو چھوڑ دیا گیا ہے لیکن ڈاکٹر ابھی تک پولیس کے قبضے میں ہے۔“ میں نے کہا ”دونوں میں سے کسی نرس کا پتہ بتا سکتے ہو مجھے؟“

وہ بولا ”نرس ہیم“ ناؤ کا لونڈی میں رہتی ہے۔ اشارہ نمبر لین میں دسواں کوارٹر ہے اس کا۔ بچواری کے ساتھ بہت برا سلوک ہوا ہے۔ دو پولیس افسروں نے چار روز تک اسے اپنے قبضے میں رکھ کر دن رات بے آرام کیا ہے۔ کئی روز تو وہ ہستر سے نہیں اٹھ سکی ہے لیکن یہاں پوچھنے والا کون ہے اور انگریز افسروں

سیارہ ڈائجسٹ / اپریل ۲۰۱۶ء

اسے کالے پانی لایا گیا ہے مجھے تو لگتا ہے کہ قیدی والے معاملے سے ضرور کشن کمار کو کوئی ننگی ٹانگا ہے آج کل اس کی انچوں سچی میں ہیں۔ چھٹی کے دن صاف سترے کپڑے پہن کر کھاڑی کے شراب خانے میں جاتا ہے ولایتی شراب پیتا ہے اور سو کر کاٹلا ہوا گوشت کھاتا ہے آج کل اس کی جیب گرم کیسے ہوتی ہے۔“

نرس ہیم اور دایہ چاکلی وغیرہ سے میری بہت کارآمد گفتگو ہوئی۔ اس گفتگو سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ عثمانی کا کھون لگانے کے لئے میرا وارڈ بوائے کشن کمار سے ملتا ہے حضور ویسے میں نے اس وقت ضائع کرنا مناسب نہیں سمجھا اور نرس ہیم کے کوارٹر سے نکلنے ہی کشن کمار کے درشن کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس وقت تک رات کے گیارہ بج چکے تھے بارش اب ختم ہو چکی تھی اور تیز رفتار بدلیوں کی اوٹ سے ستارے جھانک رہے تھے۔ وہ بچنے کی رات تھی لہذا جزیرے کی سڑکیں سنسان نہیں ہوئی تھیں یوں لگتا تھا کہ ابھی ابھی شام پڑی ہے میں درمیانی رفتار سے گلی نمبر 18 کی جانب چل دیا۔ آدھ پون گھنٹے کے اندر میں نے نصف گلی وصول لی بلکہ مطلوب مکان بھی تلاش کر لیا لیکن اس سے پہلے کہ میں مکان کے دروازے تک پہنچتا اور دستک دیتا ہنگامے میں ایک تارکب گلی میں داخل ہونا پڑا۔ کشن کمار کے کوارٹر کا دروازہ اچانک کھلا تھا اور دو افراد بائیں کرتے ہوئے باہر نکل آئے تھے۔ ان میں ایک نائے قد کا تھا دوسرا لپسا چوڑا تھا اور اس کی نوکدار مونچھیں اوپر کو اٹھی ہوئی تھیں گلی کی روشنی میں میں ان دونوں کے چہرے صاف دیکھ سکتا تھا۔ میں نے دیکھا تھا میں اس کی تصویر والے کو پہچان لیا۔ بلاشبہ وہ راجہ تھا میں اس کی تصویر اسپیکر سنت سنکھ کے پاس دیکھ چکا تھا۔ میرے جسم

پہاں کو ہلکا کر دیا۔ ”میں اتنا طویل سفر طے کرنے چلی ہے کہ“ میں یہاں آیا تھا۔ وہ رشتے میں براہ راست ہے اور مجھے اس سے ایک بے حد ضروری کام ہے لیکن یہاں اس کا کچھ پتہ نہیں چل رہا کوئی کہے کہ وہ ہسپتال سے فرار ہوا ہے کسی کا کہنا ہے کہ اسے اغوا کیا گیا ہے میں تمہارے پاس یہ ہونے لگا رہا ہوں کہ تم اس سلسلے میں میری کچھ دھمکی دے سکتے ہو۔“

ایک گہری سانس لے کر ڈھی لچھے میں بائیں جانب رات یہ واقعہ ہوا ہسپتال کے اس حصے میں لے کے سات آٹھ ارکان موجود تھے۔ ان میں ایک دایہ بوائے کشن کمار بھی ہے میرے خیال میں اگر کوئی واقعی اغوا ہوا ہے تو پھر اس سلسلے میں کشن کمار سے زیادہ اور کسی پر شک نہیں کیا جاسکتا۔ کشن کمار اکثر قیدی سے باتیں کرتا نظر آتا تھا۔ جس رات قیدی فرار یا اغوا ہوا اس رات کشن کمار کی ڈیوٹی اسی نام دارڈ میں تھی۔ قیدی کی گشتی کے بعد قریباً چھ گھنٹے کشن کمار موقع سے غائب رہا بعد میں اس نے بہانہ بنایا تھا کہ وہ ڈکاس کی دوا کھا کر سنور روم میں سو رہا تھا لیکن چونکہ کشن کمار ہندو ہے اور اگر ان کے اہلکاروں کی چال چلی کرتا رہتا ہے لہذا اسے اس سے شال تفتیش ہی نہیں کیا گیا۔ ”دایہ چاکلی کو بولی“ ”ہجرا جی! واہرو کو جان دینی ہے۔“ جھوٹ لگتی باتوں کی۔ مجھے تو پکا پکا دھواں ہے کہ اگر وہ قیدی چاکلی اغوا ہی ہوا ہے تو پھر اس میں کشن کمار کا ہاتھ ہوا۔ وہ ہمارے ساتھ ہی کام کرتا ہے اس کے بارے کو تو کچھ نہیں ہے ہم واقف ہیں۔ دھڑی دھڑی چاکلی چاکلی دیتا ہے۔ شراب تو اس کی جیب میں شامل ہے شراب کی صرف ایک چھوٹی بوتل کے لئے اس نے دو بندے قتل کر دیئے تھے۔ اس جرم میں

میں خون کی گردش تیز ہو گئی۔ ریاض عثمانی کا ایک اہم ترین کھونج ہاتھ اگیا تھا اور اس کے ساتھ ہی یہ اعزاز بھی درست ثابت ہو رہا تھا کہ ریاض عثمانی کو جیل سے ہسپتال پہنچانے اور ہسپتال سے غائب کرنے میں راجہ کا ہاتھ ہے۔

اب سالونی رنگت والے کفن کمار سے ملنا اتنا اہم نہیں رہا تھا۔ اصل مجرم راجہ تھا اور مناسب یہی تھا کہ راجہ سے دودھ واٹھ کئے جائیں۔ گلی کی ایک دیوار کے ساتھ بوسیدہ سا سکوتر کھڑا تھا۔ کوکدار مونچھوں والا جو بھینا راجہ تھا سکوتر پر سوار ہوا اور اسے شارٹ کر کے ایک طرف روانہ ہو گیا۔ میرے پاس سواری نہیں تھی ورنہ اسی وقت راجہ کا پیچھا کر کے اس کا ٹھکانہ معلوم کیا جاسکتا تھا۔ میں کچھ دیر اندر یہی گلی میں بے حس و حرکت کھڑا رہا پھر اپنے ٹھکانے پر واپس جانے کے لئے مڑ گیا لیکن عین اس وقت مجھے بہت تیزی سے نیچے جھلکا پڑا ورنہ جو چیز شاکیں کی آواز سے میرے سر کی طرف لپکی تھی وہ بھینا میرے چہرے کا گوشت ادھڑ دیتی۔ یہ کسی سائیکل یا موٹر سائیکل کا رنگ آلود جین تھا جین سے میرے سر کو نشانہ بنانے والا ایک موٹا تازہ کمرانی تھا۔ اپنی سیاہ رنگت کے سبب وہ اندر میرے ہی کا حصہ نظر آرہا تھا معلوم نہیں وہ کب سے اور کہاں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ پہلا وار خانی جاتے ہی وہ غریبا اور دینی چہرئی سے دوسرا وار کیا۔ میں اُسے قدم پیچھے ہٹا اس مرتبہ اپنی جین میرے سینے کو چھوتا ہوا زلزلہ یوں لگا جیسے پھانی کے گوشت میں کسی نے گرم سلائی آٹا ردی ہے میں نے ہٹا کر ایک لات مقابل کی پہلیوں میں رسید کی چونکہ میری پشت کو دیوار کا سہارا تھا لہذا یہ لات بڑی قوت کے ساتھ مقابل کے جسم پر پڑی۔ وہ کراہتا ہوا سامنے والی دیوار سے ٹکرایا۔ عین اس وقت ایک بیولا دائیں جانب سے نمودار ہوا۔

اس کے ہاتھ میں کوئی آہنی راڈ تھا۔ میں نے جبکہ کر یہ وار چلایا آہنی راڈ پختہ دیوار سے ٹکرایا اور تار کی میں چند چنگاریاں سی چمک اٹکیں۔ میں نے بندھتڑی کی نوک سے ایک نچی تلی ضرب حملہ آور کے سینے میں لگائی وہ تڑپ کر دوہرا ہو گیا۔ پھر میری ٹھوکر نے اسے بوسیدہ برج کی طرح اُلتا دیا۔

میں واپس پلٹ کر بھاگنا چاہتا تھا لیکن پہلا شخص ”بلال شاہ کے جتانی“ انداز میں مجھ سے پلٹ گیا۔ اسی اثناء میں ایک تیسرا شخص بھی پہنچ گیا۔ اس نے عقب سے میری گردن میں بازو ڈال دیا اور صرف بازو ہی نہیں ڈالا کسی وزنی چیز سے میرے سر پر ضرب بھی لگائی۔ ایسا اچکی آنکھوں میں ستارے سے ناچنے اور میری مزاحمت دم توڑ گئی۔

چند منٹ بعد حواس بحال ہوئے تو میں نے خود کو ایک کمرے میں پایا۔ یہ ایک مختصر سا بیڈ روم تھا۔ ایک جانب جھلکا جا رہی پڑھی فحش پر ناریل اور نیم چنٹ کیلے کے چھلکے بکھرے ہوئے تھے۔ تپائی پر ایک بلیک بہت بوسیدہ ریڈیو رکھا تھا اور اس میں سے عجیب و غریب آوازیں برآمد ہو رہی تھیں۔ بلب کی روشنی میں میں نے دیکھا میرے سینے سے خون بہہ رہا تھا سر پر بھی چوٹ آئی تھی میں قریب اُس منٹ تک بے ہوش یا نیم بے ہوش رہا تھا۔ اس نیم بے ہوشی کے دوران میری جامد تلاش لینے کے بعد میرے تھک چھٹی طرح پشٹ پر باندھ دیئے گئے تھے۔ اس کے بعد وہی رسی یا ڈوری کے بجائے تھی وہ اپنی مین استعمال کیا گیا تھا اور میری کلاں یاں تحت تکلیف سوس کر رہی تھیں کمرے میں مجھے تین صورتیں نظر نیں لیکن تینوں اجنبی تھیں ان میں سے صرف ایک شخص کو میں اس کے ذیل ڈول سے پہچان سکا یہ وہی ہے اندام سکرانی تھا جس نے مجھ پر پہلا وار کیا تھا۔ وہ اپنی نہایت سرخ آنکھوں سے مجھے گھور رہا

اسی دوران دروازے کی جانب سے سکوتر کے
چوڑے سائے دیا یہ شہرین دروازے کے سامنے
پر غرق تھا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا راجہ کے
دوباروں نے مجھے پکڑنے کے بعد کٹن کمار کے
گھر میں بند کیا تھا اور راجہ کو اس کے گھر سے بلا لیا
تاکہ وہ مجھ سے پوچھ سچو کچھ کر سکے۔ سکوتر پر آنے
اور راجہ پر تھا۔

[illegible]

میں نے اپنا شیانت خان کا رُوح نکال کر راجہ کے سامنے دکھوایا۔ اس کا رُوح میری صرف تصویر چسپاں تھی۔ اس کا کوفہ بھی تھے۔ ان کا کوفہ کے مطابق ہر اہم خیانت خان کا رُوح موجود ہوتا۔ ”جہاں بھی“ پر منظور ہوا۔ شیانت خان کا رُوح پر ہر اور راجہ افسران کے سامنے بھی موجود تھے۔ کارو دکھانے میں ایک خطرہ تھا۔ جہاں جہاں جہاں میری حیثیت مفرد ہو کر کسی کی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کے سامنے

سیارہ ڈائجسٹ / اپریل ۲۰۱۶ء

107

مجھے مفروضہ کی حیثیت سے پہچان جاتے۔ بہر طور
خیریت گزری۔ میرا شامی کا کارڈ دیکھنے کے بعد رونا
رو بہ کچھ نرم ہو گیا۔ اس نے مجھے صوفے پر بیٹھنے کو کہا
اور دو گھی سا سائے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ میرے ہاتھ
بدستور پشت پر بندے ہوئے تھے۔ راجہ بولا میرے
آدمی کے ہیں کہ تم کلی میں چھپ کر کھڑے تھے اور
کشن کمار کے کھڑ ہو گا دیکھ کے ہوئے تھے۔

”میں پھر کیوں گا کہ آپ کے کارندوں کو غلط فہمی ہوئی ہے میں.....“

”کیوں بند کرو؟“ مہرا نے میری بات کاٹی اور مجھے گر بیان سے پکڑ کر جھجھوڑا پھر وہ راجہ سے مخاطب ہوا آپ اس کی کسی بات کا دشواں نہیں کرو راجہ صاحب! گوئی بہت چالاک اور خطرناک شخص ہے، ہم تیریں نے بڑی مشکل سے قابو کیا ہے۔ اسے ”ادو“ راجہ نے ہونٹ کیسر سے اور دھچک سے مجھے دیکھنے لگا۔

جس شخص کے چہرے پر میں نے غمور رسید کی تھی اس کی ناک سے خون رہا تھا اور وہ مجھے مسلسل کھٹا جانے والی نظروں سے غمور رہا تھا۔ مجھڑ کر بولا "راجہ صاحب مجھے تو یہ غصہ پولیس کا بندہ لگتا ہے لڑائی بھڑائی کی خاص ٹریننگ کی ہوئی ہے اس نے۔"

ہے اس نے۔“
 راجہ کے چہرے پر دبا ہوا جوش نظر آنے لگا۔
 غالباً اپنے کاہنوں کے منہ سے میرے خطناک
 ہونے کی باتیں سن کر اس کا دل میرے ساتھ دو دو
 ہاتھ کرنے کو چاہتا تھا۔ راجہ کرنی ہم کا مالک ایک
 مضبوط شخص تھا۔ اس کے ہاتھ بہت بڑے بڑے اور
 لوہے کی مانند سخت دکھائی دیتے تھے وہ ہر پہلو سے
 ایک پھر تیز اور جنگجو نظر آتا تھا غیبی لہجے میں
 بولا ”بیٹا جی! گتے سے جوانی بڑا جوش مار رہی ہے
 تمہارے اندر“

سینارہ ڈائجسٹ / اپریل ۲۰۱۶ء

”ہاں چا چا جی! جوانی جو ہوئی۔“ میں نے بھی تلخ ترش لہجے میں جواب دیا۔

باہر ایک بار پھر بارش نے زور پکڑ لیا تھا۔ اب ساتھ تیز ہوا بھی چلنے کی جی اچھے خاصے طوفان کا سال بندھ گیا تھا۔ دروازے کھڑکیاں دھڑ دھڑ بج رہے تھے کوادڑ کی چوٹی چھت پر چھجوں پانی برس رہا تھا راجہ عجیب ٹھہری ہوئی سی آواز میں بولا ”کمرانی! ہاتھ کھول دو بیٹا جی کے“

کمرانی ایک لمحے کے لئے خشکا پھر اس نے آسمے بڑھ کر میرے ہاتھ آگئی جین سے آزاد کر دیئے۔

”تم لوگ باہر جاؤ“ راجہ نے اپنے کارندوں کو حکم دیا۔

وہ بلا چمن و چرا باہر نکل گئے۔ راجہ نے دروازہ بند کر دیا اور میرے سامنے آن کھڑا ہوا۔ اس کا چہرہ غصے اور جوش سے تھمرا ہوا تھا۔ میرا گریبان تمام کر بولا ”بڑی گوری ہے تیرے خون میں لے مار اپنے باپ کو مار“

اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ اسے اپنی قوت بازو پر حد سے زیادہ اعتماد ہے۔ غالباً وہ مجھے اپنے سامنے ایک نوعمر لڑکا سمجھ رہا تھا جو لڑائی جھگڑائی میں کتنا بھی ماہر تھا اس کے سامنے طفل کتب ہی تھا۔ اس نے گریبان سے پکڑ کر مجھے زور دار جھکا دیا اور پھر ایک تھوڑے جیسا کہ میرے منہ پر مارا۔ میں لڑکھڑا کر دیوار سے ٹکرایا۔ اپنی پہلی کاسیائی نے اسے اور زیادہ شیر کر دیا اور اس نے میری ٹانگوں میں ہاتھ دے کر مجھے اوپر اٹھاتا اور زمین پر پٹنا چاہا جوش و خروش میں وہ اپنے دفاع کو بالکل نظر انداز کر گیا تھا۔ جو جی وہ مجھے دبوچنے کے لئے قریب آیا میں نے ٹھہری سے اس کی ناف میں گھسٹا مارا وہ تکلیف سے دھرا ہوا تو میں نے اس کی گردن پھسل میں لی اور

اثر دکھائے گا صرف ...

کیئر

ہریکی ہیٹ پوڈر



گرمی گرمی ختم

کیونکہ صرف کے ہیں میں ہے
گوری اور پسینے سے بٹنے والے جراثیم کا نمبر توڑ!

Coslab Private Limited E-mail: coslab@mml.paknet.com.pk
coslabcosmetics@hotmail.com website: www.carecos.net

”جی چا چا جی۔ گردن کی ضرورت ہے یا توڑ دوس اسے“ میں نے اس کے کان میں تلخ سرگوشی کی۔

اس نے خود کو چھڑانے کے لئے یکبارگی زور مارا لیکن پھر فوراً ہمت ہار دی۔ میں نے اس کے سینے میں ہاتھ ڈال کر ایک چھوٹے ساڑ کا مشین پھسل نکال لیا پھر راجہ کے اوپر سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ راجہ کچھ دیر فرش پر چپ پڑا اپنی گردن سہلاتا رہا پھر وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ میری انگلی مشین پھسل کی بلبی پر تھی اور اس کی سیاہ نال کا رُخ راجہ کے سینے کی جانب تھا۔ وہ کپڑے جھاڑ کر کرسی پر بیٹھ گیا اور مجھے بھی صوفے پر بیٹھنے کو کہا۔

”یہ پھسل مجھے“ وہاں کر دو۔“ وہ ٹھہری ہوئی آواز میں بولا۔

”کیوں مچا جان“ میں نے اپنا نظریہ انداز برقرار رکھا۔

”اس لئے کہ یہ خالی ہے۔ لیکن اگر بھرا ہوا بھی ہوتا تو تمہیں اس سے کوئی خطرہ نہیں تھا یہ تم سے میرا وعدہ ہے کہ جب تک تم اس چادر دیواری میں ہو“ میں یا میرے کارندے تمہیں کوئی نقصان نہیں

”وہی ٹھانی جسے تم نے پہلے زہر دے کر مارنے

میں نے بتاؤں گا لیکن سہلے تم تسلیم کرو کہ عثمانی

بظاہر کرے میں رہی ہوئی ایک بڑی الماری
 اگلے کچھ سے کل کر ایک شخص میرے سامنے آ گیا۔
 اگلے روز اب اسے میں تمام عمر قریب 35 برس سے
 لے لے ڈھائی کچھی ہوئی آنکھوں پر عینک تھی۔
 کھانے دیکھتا رہ گیا میری ریاض عثمانی تھا۔ ہوشیار
 رہا اس کی بڑی پکٹوں نے مجھے اس کی کوئی
 چیز دیکھائی تھی۔ وہ بہت بدل چکا تھا کین پھر

سب سے پہلے میں نے کہا کہ میں نے یہ سب سنا ہے۔
 میں نے کہا کہ میں نے یہ سنا ہے کہ
 انسان میں پانچ حواس کے علاوہ بھی ایک حس
 ہوتی ہے اسے عام زبان میں چھٹی حس کہتے ہیں۔
 میں نے کہا کہ میں نے یہ سنا ہے کہ اسے
 ششمی حس کہتے ہیں۔

پیشانی

Marhaba Laboratories
 UAN: 111-152-152
 www.marhaba.com

چھوٹا بچہ اس کا زخمی لہو کے آسوا بہانے پر مجبور کر رہا تھا میرا مطلب کہ سن حیدرہ پر آصف خاں اس کیلئے سنگ کے ساتھ بیجا تھا۔ یہ شخص بوٹ پر فور میں تھا اور ہم سب اس کے ماتحت کام کرتے

UAN: 111-152-152 www.marhaba.com

سوچ بھار کے بعد میں نے فوراً میں کے ساتھ
جانے کا فیصلہ کر لیا۔ ہم شام قریب آٹھ بجے کھاڑی پر
پہنچے عبداللہ سے اس کے کوارٹر میں سی ملاقات ہوئی
یہاں سب اچھا تھا۔ عبداللہ خلدو چیشانی سے ملا۔
آدھ پون گھنٹے کے اندر میرے بیشتر خدشات دور
ہو گئے۔ عبداللہ کے ساتھ اکلادن میں نے کافی
مصرف گزارا۔ ہم نے ایک اعلیٰ انگریز افسر کے
باس گئے پھر مقامی پولیس کمیشن میں جوش ہوئے
کمیشن کے انچارج نے ہمیں ایک فوجی الجھار کے
ساتھ کچھ کاغذات دیئے۔ ہم نے لئے روانہ کر دیا۔
جہاں یہ ایک خوش کارروائی تھی جس کا ذکر یہاں
میں نے کیا ہے۔ ۱۹۵۱ء میں اس کے بعد ہم
اس پتہ سے تشریف لائے اور عبد اللہ نے اپنے ساتھ لے

ساتھ بائیں کر رہی تھیں۔ ساتھ والے کمرے میں دوسری ترس گہری نیند میں ہوئی تھی اس کا مطلب تھا کہ کوارٹر میں ایسا کوئی شخص موجود نہیں تھا جو مجھے دیکھ

جلد لیس نے ابھی تک ہیم کا پیچھا نہیں چھوڑا
نہن جا رہا رات کے اندھیرے میں اس کو اثر
آکا تو بھگ، اوروں کا کر اور بھی پیار محبت سے

وہ اپنا
نے کا

سیارہ ذابجست / اپریل ۲۰۱۶ء

میں یہ بات آئی تھی کہ جزیرے میں سرکاری آدمی پر حملہ نہایت سنگین جرم تصور ہوتا ہے اور سرکاری آدمی کے قتل کی سزا صرف اور صرف موت ہے۔

رابعہ نے اشارے سے ہمیں "جاگی" اور دوسری نرس کو کمرے سے باہر نکلنے کی ہدایت کی۔ وہ باہر چلی گئیں تو اس نے مجھے اپنے بالکل قریب بٹھالیا اور کراہتی ہوئی آواز میں زک زک کر بولا "انکپلا" میں تمہیں جو بتا رہا ہوں..... بہت غور سے سنو..... مجھے لگ رہا ہے کہ میرے پاس ابھی مہلت نہیں کہ کوئی بات دہرا سکوں اگر تم..... چٹائی کی مدد کرو..... تو وہ یہاں سے نکل سکتا ہے بس تمہارے معمولی سے سہارے کی ضرورت ہے..... باقی سارا کام میں انجام دے چکا ہوں....."

اس تمہید کے بعد رابعہ نے اپنی ڈویتی ابھرتی آواز میں جو تفصیل بتائی وہ اس طرح تھی۔ ٹھیک تین روز بعد جزیرہ "ہڈو" سے ایک قیدی رہا ہو کر واپس ہندوستان جا رہا تھا۔ اس کا نام اسماعیل تھا اور اسے اشارہ برس کی سزا ہوئی تھی۔ اس کا حلق مسلمانوں کی ایک مذہبی تنظیم سے تھا اور اس پر الزام تھا کہ اس نے انگریز حکمرانوں کے خلاف اشتعال انگیز تقریریں کی ہیں۔ ابھی اس کی سزا پوری ہونے میں ایک سال باقی تھا تاہم انگریز حکومت کے جرائد اعلان کے لئے کچھ نئے قوانین ترتیب دیئے تھے اور ان قوانین کی رو سے اسماعیل کی رہائی عمل میں آگئی تھی۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ وہ قیدی اب یہاں سے جانا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے یہاں ایک مقامی عورت سے شادی کر لی تھی اس کے دو بچے تھے۔ مکان تھا اور اس کے ساتھ چھوٹا سا کاروبار بھی اس نے کر رکھا تھا۔ دوسری طرف ہندوستان میں اس کی پہلی بیوی اور بچے ایک دیہہ کی لپیٹ میں آ کر راہی عدم ہو چکے ہیں اس کا کوئی قریبی عزیز بھی ہندوستان میں موجود نہیں تھا۔ اور

جاگی باہر آئی اور اس نے مجھ کی جی روشن کر دی۔ میں نے دیکھا رابعہ کے پاؤں میں ایک خون آلود سر یا پڑا تھا یہی سر یا اس کے پہلو میں ٹھونپنا گیا تھا ظاہر ہے مٹھوئے والا وہی شخص تھا جو اب فرش پر چت پڑا تھا۔ اس کی آنکھیں موت کے خوف اور اذیت کے باعث باہر نکلی ہوئی تھیں میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے آخری لپٹ کی اور بے سادہ ہو گیا۔

رابعہ گراہ رہا تھا اور ایک پہلو پر جھٹکا چلا جا رہا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر قسیم بلند آواز سے رونے لگی۔ میں نے اسے ڈانٹ کر چپ کر لیا اور جاگی سے کہا کہ وہ گھر کا دروازہ اندر سے بند کر دے۔ جاگی نے میری ہدایت پر عمل کیا۔ میں نے دونوں عورتوں کے ساتھ مل کر زنجی رابعہ کو اٹھایا اور کمرے میں لے آیا۔ کمرے کی روشنی میں "میں نے اچھی طرح اس کا زخم دیکھا اور زخم دیکھتے ہی مجھے یقین ہو گیا کہ رابعہ صرف چند گھنٹوں کا مہمان ہے۔ اس کا زخم جان لیوا تھا۔ نوکھار سر یا قریباً ریزہ کی ہڈی تک چلا گیا تھا خون اس کے زخم سے فوراً کے مانند چھوٹ رہا تھا۔ رابعہ کو بھی جیسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اسے کاری ضرب لگ چکی ہے۔ جب میں نے اسے کہا کہ میں اسے ہسپتال لے جانے کے لئے سواری لے کر آتا ہوں تو اس نے بے اختیار میرا بازو تھام لیا نحیف آواز میں بولا "رہنے دیا یا! میرا دل کہہ رہا ہے کہ میں اب بچوں کا نہیں۔"

میں نے اپنا دھماکا اس کے زخم پر رکھا اور ہمیں کا دوپٹے کس کر باندھ دیا۔ ہم اس کا خون روکنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن جتنی کوششیں کر رہے تھے خون اتنا ہی زیادہ خارج ہو رہا تھا، بے حد سنگین صورتحال تھی۔ اسی چار دیواری میں ایک شخص کی لاش پڑی تھی اور دوسرا جاں بلب تھا۔ مرے والا پولیس کا آدمی تھا اور میں اس واقعہ کا سب سے خطرناک پہلو تھا۔ میرے علم

سیارہ ذابجست / اپریل ۲۰۱۶ء

پروانہ عثمانی تک پہنچنا تھا اور پھر عثمانی کو ساتھ لے کر جیل پرینڈنٹ کے آفس جانا تھا۔ پرینڈنٹ کے آفس میں ایک شخص رابعہ کا قریبی دوست تھا۔ اس نے وعدہ کر رکھا تھا کہ وہ ضابطے کی تمام کارروائی ایک ڈیڑھ گھنٹے میں مکمل کروا دے گا اس کے بعد آخری مرحلہ رہ جانا تھا اور یہ مرحلہ عثمانی نے خود طے کرنا تھا یعنی پورٹ پر پہنچنا اور وہاں سے نکلنے جانے والے جہاز پر سوار ہونا۔

اس رات دو تین بجے تک رابعہ نے دم توڑ دیا..... اب مکان میں دو لاشیں تھیں ایک سب انسپٹر جلدیش کی دوسری رابعہ کی۔ ان دونوں لاشوں کے سبب نرس شیم اور اس کی دونوں ساتھی عورتیں سخت مصیبت میں گرفتار ہو سکتی تھیں۔ خاص طور پر سب انسپٹر کی لاش تو انہیں سیدھا سیدھا پھانسی کے پتے پر پہنچا سکتی تھی۔ ضروری تھا کہ ان دونوں لاشوں کو سوچ سے ہٹا دیا جائے۔ یہ لاشیں کسی ویران مقام پر پڑی پائی جاتی تو پولیس کی سرورسی بھی ختم ہو جاتی۔ فوری طور پر تسلیم کر لیا جاتا کہ رابعہ اور جلدیش میں چونکہ عداوت تھی لہذا دونوں میں دو بددلائلی ہوئی اور کاری زخم کٹنے کے سبب دونوں ہلاک ہو گئے..... خس کم جہاں پاک۔

اب تک میں وارداتوں کا سراغ ہی لگاتا رہا تھا لیکن جزیرہ ہڈو اس کا لونی میں مجھے ایک واردات کا سراغ ملتا پڑ رہا تھا۔ میں نے بڑی احتیاط اور عرق ریزی سے موقع کی تمام نشاندہی ختم کیں اور یکے بعد دیگرے دونوں لاشوں کو کارٹر سے کافی فاصلے پر ایک اجازت احاطے میں پیچک آیا۔ اس کام میں تاریکی میری بہت مددگار ثابت ہوئی لاشیں اٹھانے اور لے جانے کے دوران میرا لباس خون آلود ہو گیا تھا۔ میں نے یہ لباس باورچی خانے میں جا کر جلا دیا اور راگ نالی میں بہا دی جاگی بڑی

سے بات ہے کہ وہاں اس کی زبردست دشمنی ایک بھائی بھندو کرنے کے لوگ اس کی جان بچانے کے لئے بیٹھے تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ جو بہت زندگیاں رہ گئی ہے وہ جزیرے ہی میں نہ رہے۔ رابعہ کو کسی طرح اس قیدی کی عجیب و غریب فاضل کاظم ہو گیا تھا۔ اس نے اسماعیل نامی بھائی سے رابطہ کیا تھا اور عثمانی کی رہائی کا ایک ذاتی منصوبہ تیار کر لیا تھا۔ اس منصوبے کے مطابق اسماعیل کے شاختی کاغذات پر جزیرہ کے بارے میں جانا تھا۔ یہ ایک اتفاق ہی تھا کہ اسماعیل اور عثمانی کی عمر تقریباً اسی تھی اور وہ دونوں بھائیوں کی طرح بہت قریبی تھے۔ عثمانی نے اسماعیل ہی کی طرح اسماعیل اور عثمانی کے چھوٹی بیوی۔ بالوں کی سفیدی جاننا بھرنے کے لئے وہ خطاب لگا لیتا تھا۔ بے شک شاختی کاغذات پر تصویر موجود تھی لیکن جب تک تصویر بہت غور سے نہ دیکھا جاتا کسی قسم کا شک ہوتا تھا۔ شاختی نشان کا مسئلہ بھی رابعہ نے بڑی خوش آہلی سے حل کر دیا تھا۔ اسماعیل کی گردن پر تیز دھار لے کر ایک پرانا نشان تھا "شاختی کاغذات پر ان نشان کا ذکر تھا۔ رابعہ نے عثمانی کی گردن پر ایک لپٹ لٹکانے کا "انتظام" کر دیا تھا جیسا کہ میں نے نامہ عثمانی کی گردن پر ایک چند ماہ پرانا زخم تھا۔ لپٹ عثمانی سے اس بارے میں پوچھا بھی تھا۔ اس نے نامہ عثمانی کے دفتر رابعہ سے ہونے والے جھگڑے کا تذکرہ کیا۔ لپٹ کوئی اور چکر ہے اب معلوم ہوا کہ یہ لپٹ اس شاختی نشان کی کی پوری کرنے کے لئے عثمانی کی گردن پر لگا گیا تھا۔ اس زخم کا اب صرف ایک مشکل تھا کہ زخم کتنا مرانا ہے۔ مجھے صرف یہ کہنا تھا کہ اسماعیل کے شاختی کاغذات اور اس کی رہائی کا

سیارہ ذابجٹ / اپریل ۲۰۱۶ء

ہے تو اسے الوداع کہنے کے لئے کافی لوگ موجود ہوتے ہیں اور یہی ظاہر کرنے کے لئے ہم انہیں ساتھ لائے تھے۔ کانقدات کے مطابق مٹانی کا نام اسٹیل تھا اور وہ جزیرے میں موجود اپنی بیوی کو طلاق دے چکا تھا یہاں موجود اس کا مکان بیوی کے نام ہو گیا تھا اور کاروبار اس نے اپنے ایک قریبی دوست کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا۔ یہ ساری تفصیلات مٹانی بہت اچھی طرح رٹ چکا تھا اور امید تھی کہ وہ کہیں غلطی نہیں کرے گا۔ لیکن بندرگاہ پر چینگ اور پوچھ گچھ سے پہلے ہی ایک ایسا واقعہ ہو گیا جس کی ہمیں ہرگز توقع نہیں تھی۔ ہم بندرگاہ کی طرف پیدل ہی روانہ ہوئے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ اس روز چھٹی تھی اور سڑک پر کوئی سواری نظر نہیں آ رہی تھی۔ مٹانی کا سامان ایک ہتھ گاڑی پر تھا یہ ہتھ گاڑی کافی بڑی تھی اور اسے دو بنگالی مزدور کھینچ رہے تھے۔ ایک مزدور کافی بوڑھا تھا اور اس کی بیٹھانی پر مقامی رومان کے مطابق اس کا نام اردو سبر وغیرہ کتھ تھا۔ مزدور کے ساتھ ساتھ ایکسپریس سٹک چل رہا تھا۔ تاہم وہ سادہ لباس میں تھا اور مقامی رومان کے مطابق اس نے اپنا چہرہ ایک ٹوٹی نما پگڑی کے پلو میں چھپا رکھا تھا۔ ہتھ گاڑی کے سامان میں چند صندوق تھے جن میں کپڑے تھے اور کچھ تکف قسم کی چیزیں تھیں۔ اس کے علاوہ دو بڑی بڑی بوریاں تھیں ان میں بڑیرہ دو میں پایا جانے والا ایک خاص قسم کا پھل ”مارٹی“ تھا۔ خشک ماری کی جھاڑیوں کے لئے اکیر سمجھا جاتا تھا اور پھل بنگال کے ساحلی علاقوں میں اس کی کافی قیمت ملتی تھی۔ ابھی ہم بندرگاہ سے چار پانچ فرلانگ دور ہی تھے کہ ایک جیب بے حد تیز رفتار کے ساتھ ہمارے قریب سے گزری یہ فوجی جیب تھی اور اس میں ایک عورت

ہو شیا عورت تھی اس نے کسی طرح میرے لئے ایک دھوٹی گرتے کا انتظام کر دیا تھا۔ مجھ کے فرش سے سارا خون بھی صاف ہوا گیا۔ آگ لگ چکی تھی اور سر یہ یہ دونوں چیزیں میں ایک کپڑے سے پکڑ کر لاٹھوں کے قریب ہی پھینک دیا تھا۔ اپنے پیشہ وارانہ تجربے کی روشنی میں ایک آدھ گھنٹے کے اندر میں نے موقع واردات سے ہر کھوج کھانا کر رکھ دیا۔ نرس ہمیں اور دیہ جاگتی کو میں نے اچھی طرح سمجھا بجا دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ اگر خداخواستہ پولیس ان تک پہنچے تو انہیں کیا عیانت دینے ہیں۔ مجھے یقین تھا کہ اگر ان عورتوں نے میری ہدایات پر عمل کیا تو تفتیش سے بچ سکتی تھیں۔

اس کام سے فارغ ہونے کے بعد میں نے ریاض مٹانی سے ملاقات کی اور اسے بتایا کہ نرس ہمیں کے کوارٹر میں کیا سانحہ پیش آیا ہے۔ مٹانی حیرت زدہ رہ گیا۔ ایک دم ہی اس کے چہرے پر مرنی چھا گئی تھی۔ غالباً اسے اپنے منصوبے کی تباہی کا یقین ہو گیا تھا۔ بہر طور اگلے چوبیس گھنٹے میں میں نے اس کے تمام خدشات غلط ثابت کر دیئے۔ میں نے اس اسٹیل سے ملا اور اس سے شناختی کانقدات لے کر آیا بلکہ بھاگ دوڑ کر مٹانی کے دیگر دفتری کام بھی کروا دیئے اس سلسلے میں ایکسپریس سٹک نے ہماری بے حد مدد کی۔ وہ اس سارے منصوبے سے پوری طرح آگاہ ہو چکا تھا اور میری ہمدردی کر رہا تھا۔

آخر وہ مٹانی خیر صبح طلع ہوئی جب ریاض مٹانی کو اسٹیل کے کانقدات پر جزیرہ ”ہڈو“ سے ملکتے رومان ہوتا تھا۔ ٹھیک 36 گھنٹے بعد مجھے بھی ”ہڈو“ سے رومان ہو جانا تھا۔ میں مٹانی کو لے کر پورٹ کی طرف روانہ ہوا۔ تین چار اور افراد بھی ہمارے ساتھ تھے یہ رقبہ کے قریبی ساتھی تھے۔ انہیں ساتھ لانا ضروری تھا۔ ایک قیدی اٹھارہ سال بزرگ ہو کر جاتا

سیارہ ذابجٹ / اپریل ۲۰۱۶ء

اس وقت یہ سویا ہوا تھا۔” کوٹھیلانے شہادت کی انگلی سے سیدھا میری جانب اشارہ کیا۔

”تو..... پھر کون ہے.....“ کیپٹن نے انگریزی میں پوچھا۔ اس کی نگاہ مٹانی پر مرکوز تھی کوٹھیلانے کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ بیچانی انداز میں بولی ”مجھے یقین ہے..... مجھے یقین ہے ڈیوٹس! یہ وہی شخص ہے جس کے چکر میں یہ دھوکے باز یہاں آیا ہوا ہے۔“

یہ بڑے فیصلہ کن لحاظ تھے میں نے کیپٹن کے تاثرات دیکھے اور مجھے اندازہ ہوا کہ اس کا ہاتھ اپنے ریپولر کی طرف بڑھنے والا ہے۔ ایک ساعت کی تاخیر ہمیں کہیں سے کہیں پہنچا سکتی تھی میں نے ایکسپریس سٹک کو اشارہ کیا اور اس کے ساتھ ہی اپنا ریپولر نکال کر کیپٹن کے پہلو سے لگا دیا۔ یہ دھچکا کیپٹن کے لئے بے حد سخت تھا۔ وہ ٹھک کر رہ گیا اور اپنے ہوسٹریک کی طرف بڑھتا ہوا اس کا ہاتھ بھی ٹھک گیا۔ دوسری طرف سٹک نے بھی اپنا پہل کوٹھیلانے کی کمر سے لگا دیا تھا۔ وہ جہاں کی تھیں کھڑی رہ گئی۔ یہ سب کچھ اتنا اچانک ہوا کہ ارد گرد موجود راکبہروں میں سے کوئی بھی اس واقعہ کا نوٹس نہ لے سکا تھی کہ وہ دو بنگالی مزدور بھی جو مٹانی کے سامان والی تھ گڑی بھی تھے اسے ناظر رہے۔

”چلو کیپٹن اپنی جیب میں“ میں نے بے حد سرد لہجے میں کہا۔

اس نے ایک نگاہ مجھ پر ڈالی اور میرے چہرے کے تاثرات دیکھ کر چپ چاپ جیب کی طرف بڑھ گیا۔ اسے جیب کی طرف بڑھتے دیکھ کر کوٹھیلانے بھی قدم اٹھانے میں ہی خیریت تھی۔ ہم دونوں ان دونوں پریموں کو جیب میں لے آئے۔ وہ جیب میں بیٹھ چکے تو میں نے رقبہ کے ساتھیوں سے کہا کہ وہ سامان لے کر کھڑی اپنی جیب میں ہم ابھی آرہے ہیں۔

میں نے بھی جیب میں اور چیک کرنے کے بعد جیب کے ایک اچانک چرچائے اور وہ لہراتی ہوئی ہم سے پائس پچاس قدم کے فاصلے پر رک گئی۔ پھر اسے ریپولر گزیر لگا اور وہ دھیمی رفتار سے چلتی ہمارے سامنے آئی۔ جیب میں ایک انگریز کیپٹن اسٹیل کے ساتھ بیٹھا تھا جسے میں عبداللہ نصیری کی محبہ کے طور پر جانتا تھا اور جو اس جزیرے میں مجھے نقصان پہنچانے کی زبردست کوشش کر چکی تھی۔ بڑی مراد کوٹھیلانے سے وہ مگرے سرخ اسکرٹ میں فنی بال نمبرے ہوئے تھے اور آنکھوں پر دھوپ کا چشمہ تھا۔ چشمہ اتار کر اس نے بڑی نفرت سے مجھے گھورا اور بولی ”کہاں جا رہے ہو سوز باز۔“

میں نے کہا ”ابھی میں بدو میں 36 گھنٹے تک رہ سکا ہوں اور جہاں جا رہے جا سکتا ہوں۔“

اچانک انگریز کیپٹن غریبا ”میم صاحب جو پوچھتا ہے اس کا ٹھیک جواب دو ورنہ ہم مگر مگر کہہ رہا ہوں۔“

اس موقع پر میرا کسی سے الجھنا مناسب نہیں تھا اور یہ شخص تو پھر ایک با اختیار عہدیدار تھا۔ میں نے نرم بڑے ہوئے کہا ”یہ میرا دوست اسٹیل دارا ہے آج اس کی رہائی کا دن ہے ہم اسے کھڑی پر چھوڑنے جا رہے ہیں۔“ میں اس وقت جیب میں یہ الفاظ کہہ رہا تھا میں نے محسوس کیا کہ کوٹھیلانے بے حد غور سے مٹانی کی طرف دیکھ رہی ہے۔ وہ جیب سے جھانک لگا کر آتزی اور ہمارے بالکل قریب پہنچ گئی۔ اس کی نگاہیں مٹانی کے چہرے پر جمی تھیں میرے بدن میں ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ کوئی ٹھنکین گز رہوٹے والی تھی۔ دفعتاً کوٹھیلانے گرا کر بولی ”کیپٹن ڈیوٹس! یہ شخص وہ نہیں ہے جو یہ نوسر باتا رہا ہے میں..... میں اس کی تصویر دیکھ چکی ہوں۔ اسی شخص کے پاس ہے میں نے کسی میں ایک رات اس کے لباس کی تلاشی لی تھی

سیارہ ذابجٹ / اپریل ۲۰۱۶ء

کیپٹن اور کوشیلا کی آزادی کا مطلب ہماری فوری گرفتاری تھا۔ میں نے کہا ”سنت سنگھ اقم نے مجھ پر بہت احسانات کئے ہیں لیکن یہ آخری احسان مجھ پر زیادہ ہی بھاری ہے۔“

وہ بولا ”کوئی بھاری نہیں ایسے شہدوں سے غمنا میں بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ تمہیں یاد ہوگا کہ میں نے کوشیلا سے کچھ سادے کاغذوں پر دستخط کرائے تھے بس انہی کاغذوں سے میں اسے اور اس کے یار کیپٹن کو اس طرح جکڑوں گا کہ جینیں مار مار کر روئیں گے۔ تو بالکل فکر نہ کر یار..... بس اب ادھر سے کوئی سواری پکڑ اور جلدی سے پورٹ کی طرف نکل جا۔ ہو سکتا ہے وہاں عثمانی کو تیری مدد کی ضرورت ہو۔“

اس نے مجھ پر الوداعی نگاہ ڈال کر رب رکھا کہا اور زبردستی سڑک کی طرف دھکیل دیا۔ میں نے کہا ”تم جاؤ..... میں چلا جاتا ہوں۔“

وہ بولا ”تمہیں تم سہمان ہو میں تمہیں چھوڑ دوں جاسکتا تم جاؤ میں یہاں کھڑا ہوں۔“
بڑا خندی اور جذباتی قسم کا شخص تھا۔ وہ اینٹگو انڈین کہ لگتا تھا اور سکھ زیادہ۔ میں نے بحث میں وقت ضائع کرتا مناسب نہیں سمجھا اور اسے خدا حافظ کہہ کر سڑک کی طرف بڑھ گیا۔

..... قریب ایک گھنٹے بعد میں پورٹ پر پہنچ سکا راستے میں کوئی سواری نہیں ملی تھی۔ لہذا پیدل ہی جانا پڑا تھا۔ پورٹ پر ایک خوشخبری میری منتظر تھی ریاض عثمانی کاغذات کی جانچ پڑتال کے مرحلے سے بخیریت گزر کر جہاز پر سوار ہو گیا تھا۔ اگلے روز صبح دس بجے میں بھی موٹر بوٹ ”جھانسی“ پر سوار ہو رہا تھا۔ موٹر بوٹ کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے میں نے ایک نگاہ جزیرہ ”ہڈ“ پر ڈالی۔ تاریل کیلے اور پام کے بلند و بالا درختوں میں کھرا ہوا یہ جزیرہ دور سے کس قدر

ڈرامائیگ سیٹ سنت سنگھ نے سنبھال لی تھی۔ اس نے جیب کو طوفانی رفتار سے چلایا اور چٹو ہی منٹ میں اڑا کر کہیں سے کہیں لے گیا۔ ایک بار پھر اس نے جیب عین اسی پارک کے سامنے روکی جہاں چند روز پہلے اس نے اپنی کار روکی تھی اور پہلی بار مجھ سے بات چیت کی تھی۔ جو بھی جیب رکی میں نے آنکھوں آنکھوں میں اس سے پوچھا کہ اب کیا کرتا ہے۔ میرے اس سوال کا جواب اس نے ایک زور دار ضرب سے دیا۔ یہ ضرب اس نے اپنے پتھول سے کیپٹن کے سر پر لگائی تھی۔ بڑی جھجکی اور بے حد ماہر انداز ضرب تھی یوں لگتا تھا کہ سنت سنگھ نے اس کام کی خاص تربیت لی ہوئی ہے۔ انگریز کیپٹن پہلو کے بل نشست پر لڑھک گیا کوشیلا یہ منظر دیکھ کر جیتی لیکن اس کی یہ چیخ خلق میں ہی گھٹ گئی۔ میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ پانچ منٹ کے اندر اندر ہم نے کیپٹن اور کوشیلا کے ہاتھ پاؤں باندھ کر ان کے منہ میں کپڑے کھسک دیئے اور انہیں جیب کی نشستوں کے نیچے لٹکا کر دیا۔ ممکن ہے وہاں سے گزرتے ایک دو افراد نے ہمیں جیب میں کچھ کرتے دیکھا بھی ہو لیکن کسی نے بھی خاص طور سے غور نہیں کیا۔ ہم دونوں جیب سے اتر آئے انہیں سنت سنگھ نے میرے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لئے اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک تھی۔ دہلی آواز میں بولا ”جاؤ دوست! اب مگر تمہاری رکھشا کرے۔“ میں نے کہا ”اور تم؟“

وہ بولا ”بس اب تمہارا اور میرا راستہ جدا ہوتا ہے۔ میں ان دونوں حرا میوں (یعنی کیپٹن اور کوشیلا کو) کسی ایسی جگہ رکھنا چاہتا ہوں کہ جب تک تم اور عثمانی ہندوستان نہ پہنچ جاؤ یہ سورج کی روشنی بھی نہ دیکھ سکیں۔“

میں سنت سنگھ کا مطلب اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔

سیارہ ذابجٹ / اپریل ۲۰۱۶ء

میں نے عثمانی کو اٹھان سے لٹکانے میں صرف کئے ہیں اس تمام جدوجہد پر بھاری ہیں جو میں اب تک قانون کی بالادستی کے لئے کرتا رہا ہوں۔

ہوشیار پور میں میرے اور عثمانی کے بال بچوں کے سوا کسی کو خبر نہیں تھی کہ عثمانی کالا پانی سے رہا ہو کر واپس آ گیا ہے اور اب میرے ساتھ امرتسر کے نواحی علاقے میں اس مقام کی تلاش میں ہے جہاں پانچ برس پہلے ایک اندھیری رات کو انگریز افسر مسٹر اینڈرسن راک نے بے گناہ انسانوں کا خون بہایا تھا..... بلکہ ابھی تک میرے افسروں کو بھی یہ بات معلوم نہیں ہوئی تھی کہ میں اپنی جھنڈی مختصر کر کے واپس ہوشیار پور پہنچ چکا ہوں۔ اگر ہم آصف خان اور مسٹر راک سے کمر لے بغیر خاموشی سے وہ اجتماعی قبر تلاش کر لیتے تو یہ ہماری بہت بڑی کامیابی تھی.....

میں نے اپنے تعلقات استعمال کر کے تین پرائیویٹ جیپیں حاصل کیں اور اپنے چند نہایت قابل اعتماد ساتھیوں کو تلاش کے کام میں شامل کیا۔ ان میں بلال شاہ اور ایک ایسے آئی فزینڈ علی بھی شامل تھے۔ قریب دو ہفتے تک ہم نے ریاض عثمانی کے ساتھ مل کر دن رات اس دیرانے کی خاک چھانی نہ ہمیں کھانے پینے کا ہوش تھا نہ آرام کا اس دوران ایک موقع پر ہماری ایک پولیس پارتی سے بھی ٹھہرے بغیر ہوئی تاہم کسی نہ کسی طرح ان سپاہیوں اور کاشیپوں کو جیل دینے میں کامیاب ہو گئے۔ دو ہفتے بعد جب ہم تمام ہار کر گھری باہمی کا شکار ہوئے والے جے تھامک ایک آوارہ گرد شخص نے ہمیں اس قبر کا سراغ دے دیا۔ وہ خود کوشیلا کی کہتا تھا اور جڑی بوٹیوں کی تلاش میں اس علاقے میں کھوتتا رہتا تھا۔ اس نے بتایا کہ کچھ باریشوں میں نوح ندی (ایک مقامی نالہ) کے پاس ایک جگہ سے کچھ انسانی ہڈیاں

ملیں خاموش نظر آ رہا تھا لیکن اس کے گلی کو چوں گے تو ہمیں گوج بھی تھیں۔ ان گنت ہنگامے ہنگامے تھے اور اس کی فضاؤں میں ان ہزار ہا بڑا بڑا آدمی جھک رہے تھے جو ایک روز راجہ کی لاشوں کو لے کر خواہش دل میں لے کر کسی قبرستان

میں لٹکانے میں جا سوتے تھے۔
میرے گلے پہنچنے سے دو روز پہلے عثمانی گلے پہنچ گیا تھا۔ گلے سے ہم دونوں ایک ساتھ ہوشیار پور کے لئے روانہ ہوئے۔ ایک طویل اور کٹھن سفر کے باوجود ہمیں کوئی دشمنی نہیں پہنچی اور دہلی سے بس کے ذریعے ہوشیار پور روانہ ہوئے۔ وہ میری زندگی کے آخری فراموش لحاظ تھے جب اگست کی اس ٹھنڈی دھندلے دھندلے گرمیوں نے ریاض عثمانی کو اپنے گھر کے دروازے پر دستک دینے دیکھا۔ کچھ دیر بعد اس کی ہڈی گوندنے دروازہ کھولا۔ وہ اب نو سال کی تھی۔ اب اس کا باپ اسے چھوڑ کر گیا تھا تو اس کی عمر صرف چار سال تھی وہ بھلا اسے کیسے پہچانتی۔ اتنے سال کی ماں کلشوم بھی دروازے پر آ گئی اس نے ایک نگاہ مجھ پر ڈالی پھر اپنے شوہر کو گور سے دیکھا۔ ایک دم اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اس کے ہونٹ لڑنے ”ہائے اللہ! اس کے ہونٹوں سے لگا ہوا ایک ایک اسے پکڑ سا آ گیا۔ میں نے جلدی سے اسے گے بڑھ کر اسے سنبھالا وہ بے ہوش چکی تھی۔ مجھ پر اسے بعد میں اسے ہشک ہوش میں لائے۔ میاں بھلا کا لاپ قابیل دے دیا تھا۔ چند لمحے کے لئے وہ غم سے پرے کمرے میں ”تہا“ ہو کر ایک دوسرے کی ہانوں میں کھو گئے۔ وہ باتیں جو گھنٹوں اور گھنٹوں میں نہیں ہو سکتی تھیں آنسوؤں نے کھوں میں کہہ ڈالیں۔ بچے بھی باپ سے بے طرح لپٹے ہوئے تھے۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ وہ تین ہفتے جو

انسان کی حقیقت

ایک دفعہ بابا جی فرید اپنے سیلانی دور میں ایک بستی سے گزرے۔ دیکھا کہ ایک خوبصورت عورت ایک غریب عورت کو مار رہی ہے۔ بابا جی نے وجہ دریافت فرمائی اطلاع ملی کہ یہ امیر عورت ایک عشرت گاہ کی مالک ہے اور غریب اس کی ملازمہ۔ اس دن نوکرانی نے مالک کو کاہل ڈالا اور اس کے ساتھ کوئی ریت کا ڈزہ بھی تھا جو اس کی خوبصورت آنکھوں میں بڑا تکلیف دہ لگا۔ اس لیے اس نے خادمہ کو مارا۔

بابا جی اپنے سفر پر گامزن ہو گئے۔ ایک مدت کے بعد واپسی کا سفر شروع ہوا اور اسی بستی کے قبرستان میں قیام کے دوران بابا جی نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ ایک چڑیا نے ایک انسانی کھوپڑی میں اپنے بچے دیے ہوئے تھے۔ وہ چڑیا آبی اور چونچ میں خوراک لا کر بچوں کو کھلاتی، لیکن۔ بچے کھوپڑی کی آنکھوں سے باہر نہ نکالتے اور خوراک لے کر اندر چلے جاتے۔ انسانی کھوپڑی کا یہ مصرف بابا جی کو عجیب سا لگا۔ انہوں نے یہ دیکھنے کے لیے مراقبہ کیا کہ یہ کھوپڑی کس آدمی کی ہے۔ انہیں معلوم ہوا کہ یہ تو اسی خوبصورت عورت کی ہے جو آنکھ میں ریت کا ڈزہ برداشت نہ کرتی تھی۔ آج اس کی آنکھوں میں چڑیا کے بچے بیٹھے ہوئے ہیں۔

بابا جی نے کہا: ”جو آنکھیں جک کو مومنے والی تھیں آج میں نے وہ آنکھیں دیکھ لیں۔ کاہل میں ریت کا ڈزہ برداشت نہ ہوا آج پہنچی کے بچے اسی آنکھ میں بیٹھے ہیں۔“

اور مجھ وغیرہ لے تھے اب وہاں مقامی دیہاتیوں نے چھوٹی سی خانقاہ بنا دی ہے اور دیئے وغیرہ جلاتے ہیں۔

ہم اس نوجوان ”شیاسی“ کو لے کر خانقاہ کی طرف روانہ ہوئے ابھی ہم خانقاہ سے قریب ایک

میل دُور ہی تھے کہ ریاض عثمانی چلا اٹھا یہی ہے وہ جگہ..... یہی ہے۔ وہ ہم سب کو چھوڑ کر دیوانہ وار ایک سمت میں بھاگنے لگا۔ مجبوراً ہمیں بھی اس کے پیچھے بھاگنا پڑا۔ آٹھ دس منٹ اندھا دھند بھاگنے کے بعد وہ اس ویران مقام پر پہنچ گیا جہاں درختوں پر دو تین بوسیدہ جھنڈے لہرا رہے تھے اور ایک چھوٹی سی مٹی چار دیواری نظر آرہی تھی ہم مشترکہ قبر تک پہنچ چکے تھے۔

اگلے چند روز میں بہت تیزی کے ساتھ کئی اہم واقعات رونما ہوئے۔ سب سے پہلے مشترکہ قبر کی کھدائی ہوئی اور وہاں سے چند سلامت اور چند ٹوٹے پھوٹے انسانی ڈھانچے برآمد ہوئے۔ ان کی کل تعداد آٹھ تھی یہ کھدائی اعلیٰ افسروں کی موجودگی میں کی گئی تھی۔ اس کارروائی کا نتیجہ یہ نکلا کہ اگلے چوبیس گھنٹے کے اندر اندر مسز راک سمیت دس افراد کو گرفتار کر لیا گیا۔ یہ سب لوگ کسی نہ کسی طرح مسز راک کے ساتھ جرائم میں شریک رہے تھے۔ ان میں ایک نو عمر لڑکی کی زندگی خراب کرنے والا درندہ صفت آصف خان بھی شامل تھا۔

اجتماعی قبر والا کیس دوبارہ کھل گیا۔ گرد آلود فالتوں پر سے گرد جھاکر انہیں اعلیٰ افسروں کی میزوں پر بجا دیا گیا۔ مسز راک کے قریبی ساتھیوں میں سے ہی رام داس نامی ایک انسپٹر سلطانی گواہ بن گیا۔ اس نے مشترکہ قبر کی ساری کہانی کھول کر عدالت کے سامنے رکھ دی۔ اس نے جو کچھ بتایا اس کا لب لباب یہ ہے۔

”قریباً پانچ برس پہلے قتل کئے جانے والے ان دیہاتیوں کا تعلق صوبہ اتر پردیش کے ایک دُور دراز علاقے نواب پور سے تھا۔ وہاں دو برادر یوں میں دیرینہ دشمنی چلی آرہی تھی ایک برادری کا سربراہ بابو ہری بہادر انگریز ڈپٹی کمشنر کا خاص پٹو تھا۔ اس نے



مچے صندوق تکر دو

خاص اور قدرتی ایزرا سے تیار کردہ۔ جیاس تجلیاتے ہر روز اور جگہ کی گرمی دور کرنے کے لیے تازگی کا فوری احساس۔



سوانح ملو

راجل منظر

سوانح ملو کسی بھی عمر کے فرد کو لاحق ہو سکتا ہے، لیکن حاملہ عورت، دو سال سے کم عمر بچے، غریبہ اور سانس یا دل کی بیماری میں مبتلا افراد کے متاثر ہونے کا امکان زیادہ ہوتا ہے۔

راجل منظر کی تشخیص کی جان چاہیے ہے



کو نقصان پہنچانے والے وائرس کی مختلف شکلیں

ہیں۔ حمل شدہ ماہ پاکستان کے صوبے پنجاب کے مختلف شہروں سے ملو کی شکایت پر ہسپتال پہنچنے والے مریضوں کے خون کی جانچ سے ان میں سوانح ملو کی تصدیق ہوئی اور اب صوبہ سندھ میں بھی اس

بیمی میں مبتلا زکام، کھانسی کے علاوہ وائرس کی مختلف اقسام انسان کو بیمار کر سکتی ہیں۔ تحقیق کے مطابق یہ وائرس اپنی شکل تبدیل کر لیتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کی حفاظتی ٹیکہ زیادہ موثر ثابت نہیں ہوئی۔ انفلوئنزا ملو، نئی ٹی بی ملو، ایبولا وائرس جسم کے مدافعتی نظام

قریب فوج بندی کے کنارے کھنڈروں میں ہے۔ مسز راک..... اور اس کے ساتھیوں پر بے حد مضبوط اور جان لیوا کیس بن چکا تھا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ ریاض عثمانی کا کیا کیا جائے۔ وہ کالا پانی سے بھاگ کر آیا تھا اور آیا بھی ایک دوسرے قیدی کے کاغذات پر تھا۔ میرے ایس بی صاحب کے خیال میں اب وقت آ گیا تھا کہ ریاض عثمانی قانون کے سامنے پیش ہو جاتا اور ساری بات کھول کر بیان کر دیتا۔ چند دیگر افسران اور وکیلوں سے مشورے کے بعد ہم نے ریاض عثمانی کو غذائیت میں پیش کر دیا۔ ریاض عثمانی نے عدالت میں اعتراف کر لیا کہ وہ ایک نامعلوم جہاز ران کی مدد سے ”کالا پانی“ سے فرار ہوا۔ اس نے جیوری کو جو کہانی سنائی اس میں اسماعیل کا یہ میرا کوئی ذکر نہیں تھا۔ کالے پانی سے فرار ایک ایسا جرم تھا جس نے انگریز حکام کو ہلا کر رکھ دیا۔ کئی بیٹے اس واقعہ پر تیرے ہوئے رہے۔ بہت دور تک اور بہت دیر تک اس خبر کی گونج سنی گئی۔ چھپا کالے پانی سے راہ فرار اختیار کرنے کی سزا بہت سخت ہوتی لیکن انصاف کرنے والوں کو ریاض عثمانی کے خلاف نرم ترین رویہ اختیار کرنا پڑا۔ مشترکہ قبر کا کھوج دے کر اس نے اپنے فرار کا ٹھوس جواز پیش کر دیا تھا۔ اسے مختلف دفعات کے تحت صرف ایک برس قید محض کی سزا ہوئی۔ مسز راک کو قیدی کی حیثیت سے انگلستان روانہ کر دیا گیا۔ وہاں اس کے ساتھ کتنی بھی رعایت کی جانی انگریزی قانون کے تحت اسے عمر قید کی سزا ہو تو یقینی تھا۔ اس کہانی کے ایک اہم کردار اور کس حیدر بی بی کے مجرم آصف خان کو تعزیرات ہند کی دفعات 307، 325 اور 377 کے تحت عمر قید کی سزا سنائی گئی تھی۔

اپنی دشمنی برادری کے جتنے چھت اور آخرے افراد کو پولیس مقابلے میں ختم کرانے کا پروگرام بنایا۔ یہ منصوبہ کسی طرح وقت سے پہلے فاش ہو گیا اور یہ بھی پتہ چل گیا کہ کئی کن افراد کو قتل کئے جانے کی سازش تھی۔ یہ کئی بارہ افراد تھے ان میں سے آٹھ افراد نے فوری طور پر نواب سنج پھوڑنے کا پروگرام بنالیا۔ وہ بڑویدر نرین نواب سنج سے بھاگ نکلے پولیس ان کی تلاش میں تھی ہر جگہ ان کا کھوج لگایا جا رہا تھا۔ قریبی شہروں اور علاقوں کے تمام پولیس ہیڈ کوارٹرز میں اطلاع پہنچائی جا چکی تھی۔ آخر چوتھے پانچویں روز جان بچا کر بھاگنے والے دیہاتی نواب سنج سے سینکڑوں میل دور ضلع ہوشیار پور کی حدود میں پکڑے گئے اتفاق یہ ہوا کہ ہوشیار پور کا سب سے با اختیار اور دیکھ افسر مسز راک ایڈیشن اس ڈپٹی کمشنر کے ساتھ بھائی لگا جس نے دیہاتیوں کے قتل کا منصوبہ بنایا تھا اور اب موت کی طرح ان کا تعاقب کر رہا تھا۔ اس نے اپنے بھائی کو تمام صورتحال سے آگاہ کیا اور بہت خاص ذریعے سے یہ پیغام بھجوایا کہ ان آٹھوں افراد کو بیٹھ کے لئے ”گلا پتہ“ کر دیا جائے یعنی مار دیا جائے۔ چھوٹے بھائی نے بیٹے بھائی کے اکامات پر حرف بجز عمل کیا۔ سربا کی اس تاریک شب میں آٹھوں پرنسپل افراد کو گاڑی میں سوار کر کے اس ویران و سنہاں جگہ میں لایا گیا اھ شوٹ کر کے ایک ہی گز سے میں دبا دیا گیا۔ یہ ایک اتفاق تھا کہ اس وقت ساجد اخبار کا چیف رپورٹر ریاض عثمانی شراب کی بھینٹوں کے سپر میں وہاں مسجد تھا۔ اس نے اس منظر کو اپنی آنکھوں میں دھار لیتے کمرے میں محفوظ کر لیا اور وہ بے شمار دوسرے جرائم کی طرح یہ جرم بھی بیٹھ کے لئے قلم بویا جتا اور یہ بات کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ آئی کہ جو لوگ دہریہ کی ایک رات کو نواب سنج کے ایک گاؤں سے رہائش ہونے تھے ان کی قبر اتر کر کے

انداز

صداقت حسین ساجد

قرآن مجید! راز ہنگوئے کا یہ افسانہ آپ نے پہلے بھی شاید پڑھ رکھا ہوگا۔ میں نے نئے سرے سے اس کا ترجمہ ایک خاص وجہ سے کیا ہے۔۔۔۔۔ وہ وجہ آپ کو یہ افسانہ پڑھنے کے بعد پتا چلے گی۔ مختصر بتانا چلوں کہ پہلے جن صاحبان نے اسے ترجمہ کیا، انھوں نے اس افسانے کو بدل کر رکھ دیا اور بہت کچھ اپنی طرف سے شامل کر دیا۔ میں نے جب انٹرنیٹ سے اس افسانے کو اڈاں لوڈ کیا تو پڑھ کر حیران رہ گیا۔۔۔۔۔ پھر میں نے سوچا کہ آپ حضرات کو بھی اصل افسانے سے متعارف کرایا جائے۔

ایک بارے میں ایک صاحب نے کہا کہ اس افسانے سے لطف اندوز ہونا چاہیے



صرف ایک ہی شراب خانے میں کام کرتا تھا۔ وہ دو قصوں میں کام کرتا تھا اور شام کا اندھیرا تاریکی میں ڈھل جاتا تو وہ اپنے فلیٹ سے نکلتا اور بڑی سڑک کے کنارے چلنا شروع ہو جاتا۔ جب اسے اپنے پیچھے سے کسی کار کی آواز سنائی دیتی، تو وہ سڑک کے

دو پہاڑی آدمی شراب خانے میں موجود تمام شیشی کی مختلف آوازوں کو پہچانتا تھا۔ مجھے اس انداز پر تعجب تھا کہ اسے ان آوازوں کی پہچان کی حالت حاصل کرنے میں کتنا وقت لگا، لیکن اسے ان کو ضرور لگا ہوگا، کیوں کہ وہ ایک وقت میں

کے باعث لاکھوں انسان اپنی زندگی سے محروم ہو گئے تھے اور اس واقعے کے کئی سال بعد ماہرین نے انفلوئنزا وائرس کے بارے میں جانا تھا، جس پر تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ اس کی ایک قسم سوائن فلو بھی ہے۔ سوائن فلو کا شکار ہونے والے میں ابتدائی طور پر

جو علامات ظاہر ہوتی ہیں وہ عام فلو جیسی ہی ہوتی ہیں۔ ایسا فرد بخار، کھانسی، گلے میں خراش، ناک بہنے کی شکایت کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اسے جسم میں درد، تھکاوٹ محسوس ہوتی ہے۔ مسئلہ بڑھنے پر سردی لگنے کے ساتھ تھوڑے اور چھینکے آنا شروع ہو جاتی ہیں جب کہ بیماری کی شدت کی صورت میں مریض کا سانس تیز چلنے لگتا ہے، جلد کا رنگ نیلا یا سرخی ہو جاتا ہے۔ سوائن فلو کی وجہ سے نمونیا اور ڈی ہائیڈریشن ہونے کے علاوہ پیچھے پڑنے بھی ناگوار ہو سکتے ہیں، جس کا نتیجہ

موت کی صورت میں نکلتا ہے۔ ماہرین انفلوئنزا وائرس کی جانچ کے بعد جسم میں سوائن فلو کے وائرس کی جانچ کے لیے مزید ٹیسٹ کرتے ہیں۔ اس فلو کی بروقت تشخیص سے نہ صرف مریض کی زندگی بچائی جاسکتی ہے بلکہ اس وائرس کا پھیلاؤ روکنے میں بھی مدد دیتی ہے۔ طبی ماہرین کے مطابق ایسے مریض زیادہ سے زیادہ

نیندیں کیوں کہ یہ عمل دماغ میں ایسا مادہ پیدا کرتا ہے جس سے قوت مدافعت بڑھ سکتی ہے۔ طبی ماہرین کا کہنا ہے کہ اس بیماری کو پھیلنے سے روکنے کے لیے ضروری ہے کہ متاثرہ شخص کو صحت مند انسانوں سے علیحدہ رکھا جائے۔ اس کے معالج اور دیکھ بھال پر مامور عملہ مریض کے کمرے میں جاسے۔ پہلے خصوصی دستانے اور ماسک پہنے۔ مریض کو تختی سے عداوت کی جائے کہ وہ کھانے پینے سے قبل صابن یا مخصوص محلول سے اچھی دھوئے ہاتھ دے۔ صحت مند افراد ایسے مریض کا بکلیہ چاروں طرف سے گھیر کر استعمال نہ کریں۔

کے متعدد کمزور سامنے آ رہے ہیں۔ یہ وائرس اب تک کئی افراد کی زندگی کا خاتمہ کر چکا ہے۔ سرکاری و نجی ہسپتالوں میں ایسے مریضوں کو آئیکویشن وارڈ میں رکھا جا رہا ہے۔ طبی ماہرین کے مطابق سوائن فلو کا وائرس اپنی شکل تبدیل کرتا رہتا ہے، جس سے محفوظ رہنے کے لیے معالج کی بدلیات پر عمل کرنا چاہیے۔ سوائن فلو کا وائرس خنزیر کے ذریعے پھیلتا ہے۔ یہ انفلوئنزا وائرس کی ایک قسم H1N1 کہلاتا ہے۔ یہ وائرس انسانی جسم میں داخل ہو کر اس کے مدافعتی نظام کو کمزور کر دیتا ہے۔ طبی ماہرین کا کہنا ہے کہ سوائن فلو کی بھی عمر کے فرد کو لاحق ہو سکتا ہے، لیکن حاملہ عورت، دو سال سے کم عمر بچے، فربہ اور سانس یا دل کی بیماری میں مبتلا افراد کے متاثر ہونے کا امکان زیادہ ہوتا ہے۔ سوائن فلو متاثرہ افراد کے کھانسنے یا چھینکے سے دوسرے انسان کو منتقل ہوتا ہے۔

ماہرین طب کے مطابق اس وائرس سے مختلف اعتیادی تدابیر اپنا کر محفوظ رہا جاسکتا ہے۔ یہ ہوا کے ذریعے پھیلتا ہے اور سانس لینے کے عمل کے دوران انسانی جسم میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس مرض کے شکار افراد کو چاہیے کہ وہ کھانسنے یا چھینکے کے دوران منہ پر کپڑا رکھ لیں جب کہ صحت مند افراد کو اس دوران ان سے دور ہو جانا چاہیے۔ اگر ایسا مریض چھینکے اور کھانسنے کے دوران اپنے ہاتھ منہ یا ناک پر رکھے تو اس سے ہاتھ ملانے سے بھی گریز کیا جائے، کیوں کہ سوائن فلو کا ہڑوا اس کے ہاتھوں پر لگ سکتا ہے اور مصافحہ کرنے پر کسی دوسرے شخص میں اس کے منتقل ہو جانے کا خطرہ رہتا ہے۔ ایسے مریض کو کسی بھی فرد کو چھونے نہ کھانے پینے کے برتن نہ دے۔ ہاتھ کھانے سے پہلے اپنے ہاتھ اور منہ دھوئے۔ دیکھ لیتے ہیں۔

طبی تحقیق کے مطابق 1918 میں سوائن فلو

”شکر یہ!“ اندھو نے کہا۔ ”تم بہت زبردست جا رہے ہو۔“

”آج کی رات میری رات ہے۔“

نوجوان لڑکے نے کہا، جو کھیل رہا تھا۔

”تمہاری رات میری بھی رات ہے۔“

اندھو نے بھی جوش سے کہا اور نوجوان لڑکا

کھیلنے لگا، لیکن پھر وہ اچھی طرح سے نہ کھیل سکا

اور ہارتا چلا گیا۔ اندھو اس کے پیچھے اس امید پر

کھڑا رہا کہ شاید اسے بھی کچھ مل جائے۔ نوجوان

بہت غصے میں دکھائی دے رہا تھا اور آخر اس نے

کھیلنا بند کر دیا اور بار کی طرف بڑھ گیا۔ اندھو اس

کے پیچھے دوڑا، لیکن اس نے اس بات کا کوئی اثر

نہ لیا۔ جب نوجوان نے کوئی توجہ نہ دی، تو اندھو

واپس پلٹا اور اس نے ہاتھ سے مشینوں کا دوبارہ

جانزہ لیا اور وہیں اس انتظار میں کھڑا ہو گیا کہ

کوئی آکر کھیلے۔

پہلے اور میز پر کوئی کھیلنے والا نہیں تھا۔ تاش والی

میزوں پر چند جواری بیٹھے ایک دوسرے کو ہرانے کی

کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ قصبے میں اس شام مکمل

خاموشی تھی اور کوئی جوش و جذبہ نہیں تھا۔ بار کے

علاوہ کہیں اور رونق نہیں تھی، لیکن بار کے پاس اس

وقت تک خوب رونق اور زبردست ماحول تھا جب

تک اندھو وہاں نہیں آیا۔ اب ہر شخص اس کوشش میں

تھا کہ وہ انڈیکس میں چلا جائے یا پھر اپنے گھر میں

لوٹ جائے۔

”نام! تم کیا لو گے؟“ فریک ساتی نے مجھ

سے پوچھا۔ وہ اس شراب خانے کا مالک بھی تھا۔

”میں تو سردی سے کپکپا رہا ہوں۔“

”پہلے خود کو تھوڑا گرم کر لو۔“

”میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔

فریک اس اچھی نوجوان کی طرف متوجہ ہوا،

میں دلی تھاکہ کی طرف بڑھا اور ان پر

بارش کی کوشش کرنے لگا کہ غلطی سے

پہلو سے نہ گر گیا۔ وہاں کچھ بھی نہیں تھا،

بارش کی بجائے کھال کراس کے فرائض کا حصہ

تھا۔ اندھو نے اس سے شراب کے

پہلو پر ہاتھ رکھا۔

”اندھو نے کہا۔“ مجھے سڑکوں پر محتاط

رہنا پڑا۔“

”کسی تمہارا کیا مطلب ہے؟“ کسی

نے پوچھا۔ ”تم صرف ایک سڑک پر جاتے

ہو۔ اگلے جگہ اور تمہارے فلیٹ کے درمیان

کچھ نہیں ہے۔“

”اندھو نے کہا۔“ اندھو نے

پہلے اس کی بات سن لی۔

”اندھو نے کہا۔“ اندھو نے

پہلے اس کی بات سن لی۔

”اندھو نے کہا۔“ اندھو نے

پہلے اس کی بات سن لی۔

”اندھو نے کہا۔“ اندھو نے

پہلے اس کی بات سن لی۔

”اندھو نے کہا۔“ اندھو نے

پہلے اس کی بات سن لی۔

”اندھو نے کہا۔“ اندھو نے

پہلے اس کی بات سن لی۔

”اندھو نے کہا۔“ اندھو نے

پہلے اس کی بات سن لی۔

”اندھو نے کہا۔“ اندھو نے

کہ اسے انڈیکس میں مشکل پیش آتی تھی، کیوں کہ

وہاں کمرے بھی زیادہ تھے اور مشینیں مختلف جگہ پر

بجھلی ہوئی تھیں۔

اس رات باہر غصب کی سردی پڑ رہی تھی۔

جب وہ اندر آیا، تو اس کے سر کے بالوں بخونوں اور

موجھوں پر برف جمی ہوئی تھی اور اس کی حالت بہتر

نہیں لگ رہی تھی۔ اس کی بدبو تک ٹھنڈی تھی، لیکن یہ

زیادہ وقت تک نہ رہی اور جون ہی اس نے دروازہ

بند کیا، بدبو نے پھیلنا شروع کر دیا۔ اسے دیکھنا

میرے لیے ہمیشہ سے بہت مشکل رہا تھا، لیکن اس

روز میں اسے احتیاط سے دیکھ رہا تھا۔ مجھے پتا تھا کہ

وہ ہمیشہ سے ایسا ہی گندا ہے اور میں اسے اس طرح

ٹھہرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ آخر میں اس

سے پوچھا۔

”اندھو! کہاں سے پیدل چل کر آرہے ہو؟“

”ولی سویٹر نے مجھے ریلوے پلی پر کار سے

باہر اتار دیا تھا۔ کوئی اور کار نہیں آئی جس پر میں

سوار ہو سکتا۔“

”اس نے تمہیں کیوں اتار دیا تھا؟“ کسی نے

پوچھا۔

”اس نے کہا کہ تم سے بدبو آرہی ہے۔“

کسی نے مشین کا دستہ کھینچا اور اندھو

کھڑکھڑاہٹ سننے لگا۔ کچھ نہیں آ رہا تھا۔

”کوئی بے وقوف کھیل رہا ہے؟“ اس نے مجھ

سے پوچھا۔

”تم نے سنا نہیں؟“

”ابھی نہیں سنا۔“

”اندھو! بے وقوف نہیں ہے اور آج بدھ

ہے۔“

”میں جانتا ہوں کہ آج کیا رات ہے۔ مجھے

اس رات کے بارے میں بتانا شروع نہ کرو۔“

کنارے رک جاتا۔ کار کی روشنیاں اندھے پر

پڑتیں، تو گاڑی سوار کہ جاتے اور اسے اپنے

ساتھ بٹھا لیتے۔ اگر وہ نہ نکلتے، تو وہ برف سے

ڈھکی سڑک پر دوبارہ چلنا شروع کر دیتا۔ انکو اسے

سواری ملنے کا انشوراس بات رہتا کہ کار والا کتنے

نلے میں ہے یا کار میں خاتون بیٹھی ہوئی ہے، کیوں

کہ تاجیلا آدمی کے پاس سے خاص طور پر سردیوں

میں بہت گندی بو آتی تھی، لیکن ہمیشہ اس کے لیے

کوئی نہ کوئی رک ہی جاتا تھا، کیوں کہ وہ بہر حال

ایک تاجیلا انسان تھا۔

ہر ایک اسے جانتا تھا اور اسے اندھو کہتے تھے

، جو کہ ملک کے اس حصے میں تاجیلا انسان کے لیے

ایک اچھا نام تھا۔ جس شراب خانے میں وہ کام

کرتا تھا، اس کا نام پائلٹ تھا۔ اس کے پائلٹ

آگے ایک اور شراب خانہ بھی تھا جس میں جوا

کھیلنے کی مشینیں اور کھانے والا کرتا تھا، اسے

انڈیکس کہا جاتا تھا۔ دونوں شراب خانے معیاری

تھے، دونوں میں پرانے دنوں کے بار تھے اور

دونوں میں تقریباً ایک ہی طرح کی جوا کھیلنے والی

مشینیں تھیں۔ یہ ایک اگ بات ہے کہ آپ کو

پائلٹ میں بہتر کھانا کھانے کو ملتا، تو انڈیکس میں

بہترین تھا ہوا گوشت مل سکتا تھا۔ انڈیکس پوری

رات کھانا رہتا تھا اور صبح بھی جلد ہی مکمل جاتا تھا۔

دن کے دس بجے تک وہاں شراب بھرا کر دی جاتی

تھی۔ وہاں یہ صرف دو شراب خانے تھے اور اس

کے لیے انھوں نے کوئی کوشش نہیں کی تھی، کیوں

کہ یہ سڑک پر تھے۔

اندھو پائلٹ کو ترجیح دیتا تھا، کیوں کہ اس میں

جوں ہی آپ داخل ہوں اور بار کا خرچ کریں،

مطہینیں بالکل نلے ہاتھ پر دیوار کے ساتھ تھیں۔

اس سے وہ ان پر بہتر طریقے سے قابو پا سکتا تھا جب

جو بھاری بھر کم کپڑے پہنے ہوئے تھا اور سر پر کالا ہیٹ دھرا تھا۔ اس نے تازہ تازہ شیو کر رکھی تھی اور اس کے چہرے کی حالت سے لگ رہا تھا کہ اس نے کافی برف بار بار ہل سہہ رکھی ہیں۔
”تم کیا لپٹا ہند کرو گے؟“

نوجوان نے دہسکی کا انتخاب کیا۔ دہسکی کافی پرانی تھی۔

میں نے اسے اشارہ کیا اور اپنا پیگ بلند کیا اور ہم دونوں شراب کی چکیاں لینے لگے۔ اندھو مشینوں کی رفتار کے آخر میں تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ سردی سے کانپ رہا تھا اور اسے دروازے میں سے دیکھ کر اندر کوئی داخل نہ ہوا۔ اسے اس بارے میں کوئی پروا نہیں تھی۔

”اس آدمی کی بیٹائی کیسے ضائع ہوئی؟“
نوجوان نے مجھ سے پوچھا۔

”میں نہیں جانتا۔“ میں نے اسے بتایا۔
”ایک لڑائی میں۔“ فریک نے اسے بتایا۔
”لڑائی میں؟“ اجنبی نے کہا۔ وہ اپنا سر ہلارہا تھا۔

”جی ہاں!“ فریک نے کہا۔ ”اس نے اسی لڑائی میں لوہی آواز بھی نکالی تھی۔“ نام! اسے بتاؤ۔“

”میں نے اس کے بارے میں کبھی نہیں سنا۔“
”نہیں، بریقین نہیں کرو گے۔“ فریک نے کہا۔ ”بھٹیا نہیں۔“ تم وہاں نہیں تھے، میں جانتا ہوں۔ جناب! وہ رات آج کی رات بعض شخص کی تھی۔ جو سکا ہے کہ اس سے زیادہ خفنی ہو۔ وہ بہت تیز لڑائی تھی۔ میں نے اس کا آغاز نہیں دیکھا تھا۔ تب وہ ایک دوسرے سے لڑتے ہوئے انڈیکس کے دروازے سے باہر نکلے۔ بلکی، جواب اندھو ہے اور دوسرا لڑاکا ولی سوئیر۔ دونوں ایک

دوسرے کو کہنیاں مار رہے تھے۔ گھٹنوں سے ضربیں لگا رہے تھے۔ کاٹ رہے تھے۔ نوح رہے تھے اور میں نے دیکھا کہ بلکی کی ایک آنکھ کا ڈبلا رخسار پر لٹک رہا تھا۔ وہ دونوں لڑتے لڑتے سڑک پر پڑی ہوئی برف کے ڈھیر پر چلے گئے۔ ان پر اس دروازے اور انڈیکس کے دروازے کی روشنی پڑ رہی تھی۔ ہوٹل سائنڈز، ولی سوئیر کے بالکل پیچھے تھا۔ وہ آنکھ نوچنے کے بارے میں کہہ رہا تھا۔ ہوٹل چلا رہا تھا۔

”اسے باہر نوح ڈالو۔ اسے انکور کی طرح نوح ڈالو۔“

بلکی اس وقت ولی سوئیر کے چہرے کو نوح رہا تھا۔ اس نے اس کے چہرے کو بگاڑ کر رکھ دیا تھا اور اس وقت اس نے ایک اور زبردست وار کیا تھا۔ اب وہ دونوں برف پر گر گئے تھے اور ولی سوئیر اس کی آنکھ نوچنے میں کامیاب ہو گیا۔ تب بلکی نے ایسی چیخ ماری کہ تم نے کبھی نہیں سنی ہوگی۔ جنگی جانور جب قتل ہوتے چیخ مارتا ہے، تو اس سے بھی زیادہ بلند تھی۔

اندھو ہمارے پیچھے آیا اور اس کی بو محسوس کر کے ہم نے پلٹ کر دیکھا۔

”انکور کی طرح نوح ڈالو۔“ اس نے بلند آواز میں کہا اور اس نے اپنا سر اوپر نیچے ہلاتے ہوئے ہماری طرف دیکھا۔ ”وہ بائیں آنکھ تھی۔ اس نے دوسری آنکھ کی نصیحت کے بغیر نکال دی تھی۔ اس نے مجھے اس حالت میں چھوڑ دیا جب میں اسے دیکھ نہیں سکتا تھا۔ یہ بہت برا ہوا تھا۔“

اس نے خود کو کوسا۔

”میں اس سے اچھا لڑنے والا تھا۔“ اس نے کہا۔ ”میرے سٹیلے سے پہلے ہی اس نے میری آنکھ نوح ڈالی۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی۔ خبر!“

کیا آپ چاہتے کہ

آپ آپ کی اولاد آپ کے بہن بھائی عزیز واقارب

جھوٹ بولنے سے باز آجائیں۔

تجارت اور ملازمت میں بدعنوانی اور بددیانتی سے باز آجائیں۔

اے گھر والوں سے حسن سلوک سے پیش آئیں۔

زندگی کا ہر لمحہ نیکی اور پارسائی میں گزرے۔

تعلیم و تعلم کے شاندار درس ذہن نشین ہو جائیں۔

والدین سے وہ سلوک کریں جو خدا پسند کرتا ہے۔

تو

سیارہ ذابجسٹ کی شاندار روایات

کے پیش منظر میں پیش کیا جانے والا

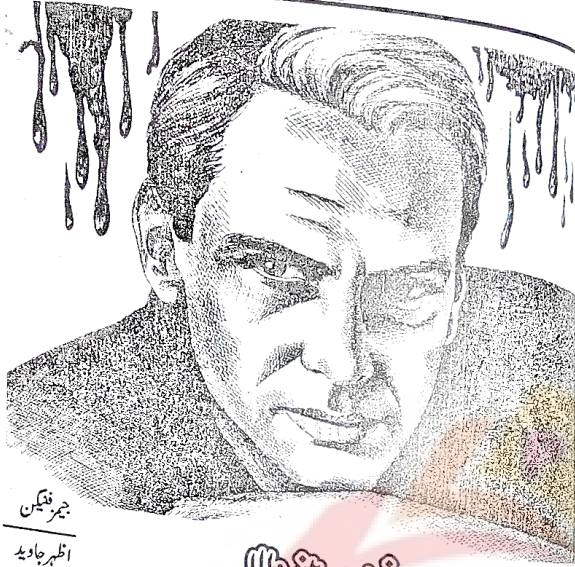
دلکش دلکش اور زریں

شائع ہر مہینے

اخلاق رسول صمبر

مطالعہ کیجئے

احادیث رسول کی روشنی میں



جبرئیل
الطبرجاوی

خون پیئے ملا

ایمانے یوں محسوس کیا جیسے اس کے گلے میں کوئی سخت چیز چھری رہی ہو۔ اس نے اپنا سر جھکا۔ اجنبی سیدھا کھڑا ہو گیا۔ ایسا کانپ اٹھی اجنبی کے ہونٹ خون سے سرخ تھے، اس کے اپنے خون سے۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنے بچاؤ کے لئے چینی اجنبی کے ہاتھوں نے اس کا گلا گھونٹ دیا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”میرا دل میں سے نکلتا ہے“

نمبر 1929ء کی صبح اور خشک رات کو ادھیڑ عمر کا ایک جوان ذہل ڈورف کے ہوف گارڈن میں بڑی جرات اور دھڑکی چال کے ساتھ چلتا جا رہا تھا۔ وہ کبھی کبھی پلٹے پلٹے ایک آدھ لمبے کے لئے اندھیرے لمحہ ڈوبے ہوئے باغ کے دربان گوشوں پر نظر ڈالتا اور آگے بڑھ جاتا۔ وہ نرم آنکھوں اور دبیلے پتلے جسم والا آدمی تھا۔ اس نے اپنے ذیلے جسم کو اور کوٹ میں چھپا رکھا تھا۔ اور کوٹ کے بن سکلے تھے مگر یہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس کے کوٹ کی اندرونی جیب میں ایک آبدار شکاری چاقو تھا۔ اپنی چال ڈھال سے وہ آدمی نرم خوار مدبر نظر آتا تھا۔ آدھی رات گزر گئی۔ باغ دربان ہو گیا۔ وہ آدمی

”اردو سے محبت“

اردو زبان سے محبت کرنے والی دو سہیلیوں کی آپس میں گفتگو کچھ یوں تھی۔
”یونو مجھے اردو بہت پسند ہے۔“ ”آئی لو اردو۔“ ”میں تانیہ آئی نو مجھے بھی اردو بہت پسند ہے، ابھی آخر کو ہماری نیشنل لیکچر ہے۔“ ”میں تو ہمیشہ شراکی کرتی ہوں کہ اپنے گھر میں، بچوں اور ہسپتال کے ساتھ اردو میں ہی بات کروں۔“ ”سم ہیر میرے بچے لائیک کرتے ہیں اردو میں بات کرنا۔“ ”ایا اس فنکار لیکچر ہے۔“
(مرسلہ: خالد عمران۔ ٹوبہ یک سنگھ)

اس نے کسی تانسف کے بغیر کہا۔ ”یوں نیرے لڑائی کے دن ختم ہو گئے۔“
”ہلکی کو شراب دو۔“ میں نے فریک سے کہا۔

”نام! اندھویرا نام۔“ میں نے بھی نام کا کیا ہے۔ تم نے سب کو مجھے اسی نام سے پکارتے دیکھا ہے۔ یہ نام میں نے اس رات حاصل کیا تھا جب میں سڑک پر گر گیا تھا۔ میری آنکھیں نوچ دی گئی تھیں۔ میں نے اُسے معاف کر دیا تھا، پھر بھی ہم دوست کبھی نہیں بن سکے۔“
”تم نے اس کے ساتھ کیا کیا تھا؟“ اجنبی نے پوچھا۔

”اوہ! تم اسے نہیں دیکھ سکتے ہو۔“ اندھو نے کہا۔ ”تم اسے دیکھتے ہی پیمان لو گے۔“ میں نے اس کا طیلہ ہکا ڈیا تھا۔
”تم اسے دیکھ نہیں پاؤ گے، اُس کا طیلہ بگڑ چکا

ہے۔“ میں نے اجنبی کو بتایا۔
”تمہیں پتا ہے کہ یہ ایک وجہ ہے کہ میں کچھ دیر کے لیے دیکھنا چاہتا ہوں۔“ اندھو نے کہا۔
”میں اسے کچھ دیر کے لیے دیکھنا چاہتا ہوں۔“
”تمہیں پتا ہے کہ وہ کیا دکھائی دیتا ہے۔“
فریک نے اس سے پوچھا۔ ”تم اس کے قریب گئے تھے اور اس کا چہرہ ہاتھوں سے چھو تھا۔“
”ہاں۔۔۔۔۔ آج پھر میں نے یہی کر ڈالا۔“
اندھو نے خوشی سے کہا۔ ”میں وجہ ہے کہ اس نے مجھے کار سے اتار دیا تھا۔۔۔۔۔ اس میں اب بھی مزاح کی کوئی حس موجود نہیں ہے۔۔۔۔۔ میں نے اسے ایسی ہی ایک سردرات میں بتا دیا تھا جب وہ اپنے چہرے کو سردی میں کھالے کر پھر رہا تھا۔۔۔۔۔ اس نے اسے مذاق نہیں سمجھا تھا۔۔۔۔۔ تم جانتے ہو کہ ولی سویر کبھی اس دنیا کا آدمی نہیں بن سکے گا۔“

”ہلکی! یہ میری طرف سے پیو۔“ فریک نے کہا۔ ”میں تمہیں گھر نہیں جانے دوں گا، کیوں کہ میں یہاں قریب ہی رہتا ہوں اور تمہیں پیچھے سونے کے لیے جگہ مل جائے گی۔“
”فریک! تمہارا بے حد شکریہ!۔۔۔۔۔ تم مجھے ہلکی نہ کہا کرو۔۔۔۔۔ اب میں ہلکی نہیں ہوں۔ میرا نام اندھو ہے۔“

”اندھو! شراب لو۔“
”نہیک ہے جناب!۔“ اندھو نے کہا۔
اس نے ہاتھ آگے بڑھایا اور گلاس پکڑ لیا۔ پھر اس نے ہم تینوں کی طرف گلاس بلند کیا۔
”ولی سویر کے نام!۔“ اس نے کہا۔ ”جو جیتنا اس وقت اپنے گھر میں تھا بیٹھا ہوگا۔۔۔۔۔ ولی سویر، جو زندگی سے لطف اندوز ہوتا جاتا ہی نہیں ہے۔“

بڑا لک بھی گاڑی سے اتر کر پلیٹ فارم پر کھڑی ہوئی۔ بیچاری بہت گھبرائی ہوئی تھی وہ اتنے بڑے شہر میں پہلی بار نوکری کی تلاش میں آئی تھی اور جس آدمی نے اسے نوکری دلوانے کا وعدہ کیا تھا وہ پلیٹ فارم پر کہیں بھی نظر نہ آ رہا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ رات کہاں بسر کرے گی اور اتنے بڑے شہر میں اس انسان کو کس طرح تلاش کرے گی جو اس کے مستقبل کا ضامن تھا۔ وہ انہی خیالات میں پریشان اور کھوئی ہوئی تھی کہ ایک نرم خوش مہذب ادیب عمر کا آدمی متانت کے ساتھ چلا ہوا اس کے قریب آیا اور بولا ”میں آپ کے کسی کام آ سکتا ہوں؟“۔ بیچاری بوکھلائی ہوئی لڑکی نے ایک ہی سانس میں اپنی پٹا سنا دی ادیب عمر کے آدمی نے اسے تسلی دی اور کہنے لگا۔ ”آپ میرے ساتھ چلے میں آپ کو اپنے گھر لے چلا ہوں وہاں گرم کھانا کھائیں اس کے بعد میں آپ کو کسی سستے اور معقول ہاسٹل میں لے چلوں گا اور سچ ہونے پر کچھ سوچا جائے گا۔ رات آپ وہاں اطمینان سے کاٹیں۔“

انہی اسے کسی ہاسٹل میں لے جانے کے بجائے گریجنس برگ کے جنگل میں لے گیا اور لڑکی کو اپنے بازوؤں میں بکڑ کر اس کی گردن میں دانت پیوست کر دیئے۔ نو جوان اور صحت مند لڑکی نے اس کی باتوں کا کھینچ توڑ دیا اور اندھا دھند بھاگتی ہوئی اس کی رسائی سے باہر چلی گئی۔

جب یہ لڑکی ڈسٹ ڈھف میں کام تلاش کرنے میں کامیاب ہوئی تو اس نے رہائش کا بھی معقول انتظام کر لیا تو اس نے اپنی ایک کنبی کو ایک خط میں یہ سارا واقعہ لکھ بھجلا جو ہمہ حال افشا ہو کر رہتا ہے۔ اب یہاں بھی ایک عجیب انداز سے جرم افشا ہو گیا۔ غلطی سے میرا نے اپنی کنبی کے نام کے لیے سچ نہ لکھے اور وہ اس کی کنبی کے بجائے ایک دوسری محنت کو ڈاک میں تقسیم کر دیا

”ای میں راجیل سے کبھی بھی شادی نہیں کر سکتی۔ وہ انتہائی بد ذوق ہے اسے ادب سے ذرا بھی دلچسپی نہیں۔ ہر وقت ریاضی کی زبان میں بولتا ہے یا کھیل کے میدان میں گھسا رہتا ہے۔ بس ای آپ یہ منہ ہی ختم کر دیں..... نہیں تو میری شکل بھی آپ کو نظر نہیں آئے گی۔“ ماہ پارہ نے روتے ہوئے کہا۔

ایک اور شخص کا نام مانی کے پیشانی پر درج تھا



”ای آپ سن لیں میں ہرگز ہرگز راجیل سے شادی نہیں کروں گی۔“ ماہ پارہ نے سیر حیاں چڑھتے ہوئے کہا۔

”کیوں بھڑک رہی بات ہو گئی ہے؟“ ای نے پوچھا۔

”اب موصوف کھلاڑی بنے

”ای آپ سن لیں میں ہرگز ہرگز راجیل سے شادی نہیں کروں گی۔“ ماہ پارہ نے سیر حیاں چڑھتے ہوئے کہا۔

”کیوں بھڑک رہی بات ہو گئی ہے؟“ ای نے پوچھا۔

”اب موصوف کھلاڑی بنے

سیارہ ذابجٹ / اپریل ۲۰۱۶ء

”ای پارو تو ہمارا دل رکھنے کو کھا رہی ہے ورنہ اسے بھوک کہاں۔“ جنید نے امی کی معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”ویسے ہی میں نے تو ایک بات کہہ دی تھی آپ تو پیچھے ہی پڑھ گئے بھائی جان۔“ ماہ پارہ رو باگی ہو گئی۔

”اچھا بابا معاف کر دو لیکن روتا مت۔“ جنید نے ملتھیانہ انداز میں کہا۔

شام کے کھانے کے بعد امی ماہ پارہ کے کمرے میں آئیں تو وہ بستر پر پڑی رو رہی تھی۔ انہوں نے جو اسے اس طرح روتے دیکھا تو یکجہ ہی کٹ کے رہ گیا۔ فوراً جا کر اپنی پھول سی پچی کو سینے سے لگالیا۔

”کیا ہوا پارو! تمہیں کیا غم ہے میری جان مجھے بتاؤ۔“ میں تمہاری امی ہی نہیں تمہاری بیٹی بھی ہوں۔“ امی نے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

”امی میں راجیل سے کبھی بھی شادی نہیں کر سکتی۔ وہ انتہائی بدذوق ہے اسے ادب سے ذرا بھی دلچسپی نہیں۔ ہر وقت ریاضی کی زبان میں بولتا ہے یا تھیل کے میدان میں کھسا رہتا ہے۔ بس امی آپ یہ مکتبی ختم کر دیں۔۔۔۔۔ نہیں تو میری شکل بھی آپ کو نظر نہیں آئے گی۔“ ماہ پارہ نے روتے ہوئے کہا۔

”وہی ہوگا جو تم چاہو گی مجھے تم سے زیادہ کوئی عزیز نہیں۔ کیا ہوا؟ جو راجیل میری بہن کا بیٹا ہے پسند بھی کوئی چیز ہے۔ میں کل ہی جیلہ بیگ کو مکتبی ختم کرنے کا کہہ دوں گی۔ بس اب خوش۔۔۔۔۔“ امی نے تسلی دیتے ہوئے کہا تو ماہ پارہ کے چہرے پر کچھ رونق آئی۔

”جیلہ نے ماہ پارہ اور راجیل کی مکتبی ختم کرنے کا اعلان کیا ہے۔“ جیلہ بیگم نے ماتھے پر ہاتھ رکھتے

سیارہ ذابجٹ / اپریل ۲۰۱۶ء

اُس روز ماہ پارہ کی شادی تھی۔ اُس کی شادی دانیال سے ہو رہی تھی جو کسی کالج میں اردو ادب کا پروفیسر تھا، خاصا باذوق انسان تھا۔ شاعری بھی کرتا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کھانے پینے گھرانے کا چشم و چراغ تھا۔ ماہ پارہ کی خاندانی حیثیت بھی کچھ کم نہ تھی۔ شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی دونوں کی پسند بھی اس میں شامل تھی۔ راجیل بھی اپنے والدین کے ساتھ اس میں شریک تھا۔ وہ پارو کو دین بنے دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کی خوشی چاہتا تھا سو آج اس نے پارو کے چہرے پر خوشی کے رنگ دیکھ لئے تھے لیکن نگانے کیا ہوا وہ رگھتے تک وہاں ٹھہر نہیں سکا۔

شادی کے بعد ماہ پارہ اور دانیال کے روز و شب ایک دوسرے کو سمجھنے میں گزر رہے تھے۔ ایک روز دانیال نے سونے کے لیے بیڈ پر لیٹتے ہوئے ماہ پارہ سے کہا:

”پارو ساڑھے تین بجے کا الارم لگا دو میں نے سچ دیکھنا ہے۔“

”اچھا لگا دیجی ہوں۔ کیا کوئی خاص سچ ہو رہا ہے؟“ ماہ پارہ نے پوچھا۔

”ہاں پاکستان اور آسٹریلیا کا فائنل ہو رہا ہے۔“ دانیال نے بتایا۔

”ضرور کرکٹ سچ ہوگا۔“ ماہ پارہ نے الارم سیٹ کرتے ہوئے کہا۔

”نہیں ہاں کا سچ ہے۔ ہماری ٹیم فائنل میں پہنچ چکی ہے۔“ دانیال نے کہا تو ماہ پارہ ہانسی کے جائیں۔“ دانیال نے کہا تو ماہ پارہ ہانسی کے دھندلوں میں ٹھہر گئی۔

”ٹھیک ساڑھے تین بجے الارم کی آواز سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ دانیال کا کندھا ہلاتے ہوئے سچ کا بتایا تو دانیال ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ ”کہیں شروع تو نہیں ہو گیا۔ ذرا ٹی وی آن کرنا۔“ دانیال نے

”کیا مضائقہ ہے؟ ہم کسی اور جگہ مکتبی کے لیے فرق پڑے گا۔“ ملک صاحب

”مکتبی تو کوئی نہیں پڑے گا اور میں بھی اس مکتبی میں خیال واضح ہوئی ہوں مگر راجیل ماہ پارہ کو

”جیلہ بیگم نے ان کے منہ کی بات چھیٹتے ہوئے

”اسی بات کا تو رونا ہے۔“ جیلہ بیگم نے

”ابن علیؓ کی بات کو یاد رکھو۔“ امی نے کہا۔

”ابن علیؓ کی بات کو یاد رکھو۔“ امی نے کہا۔

”ابن علیؓ کی بات کو یاد رکھو۔“ امی نے کہا۔

”ابن علیؓ کی بات کو یاد رکھو۔“ امی نے کہا۔

”ابن علیؓ کی بات کو یاد رکھو۔“ امی نے کہا۔

”ابن علیؓ کی بات کو یاد رکھو۔“ امی نے کہا۔

”ابن علیؓ کی بات کو یاد رکھو۔“ امی نے کہا۔

”ابن علیؓ کی بات کو یاد رکھو۔“ امی نے کہا۔

شام کو نوروز خان نے زور دار قہقہہ لگاتے ہوئے اس کے کندھے پر زور سے ہاتھ مار کر کہا ”مفرور بابو میں نے تمہارے لئے کام تلاش کر لیا ہے تم بازو کو پڑھایا کرو“ اس نے خوش ہو کر نوروز خان کی طرف دیکھا۔ یہ کام تو وہ بڑی آسانی سے کر سکتا تھا۔ اگلے دن اس نے نہ صرف بازو کو بلکہ گلوں کے دوسرے بچوں کو بھی اکٹھا کر کے پڑھانا شروع کر دیا جس سے وہ قابل احترام شخصیت بن گیا۔ رات کو بچے بوڑھے اور جوان حجرے میں جمع ہو جاتے وہ ان کو رحمان بابا اور دیوان خوشحال خاں خٹک کے گراما دیئے والے اشعار سن کر وہ لوگ پھڑک پھڑک جاتے۔ آدمی آدمی رات تک یہ سلسلہ جاری رہتا۔ حجرے سے واپسی پر جب وہ حویلی کا دروازہ کھٹکھٹاتا تو اکثر مرجانہ ہی دروازہ کھولا کرتی تھی کیونکہ ملک نوروز خان رات کو اوپر کے مورچے میں سوتا تھا۔

شرمگل کو آئے ہوئے دو تین ماہ ہو چلے تھے۔ لیکن کبھی بھی مرجانہ سے کھل کر بات نہ ہوئی تھی شاید وہ اس سے مرعوب تھا دروازہ کھول کر وہ اس سے پوچھتی۔

”آگئے.....؟“

وہ اثبات میں جواب دیتا لیکن ایک لمحے کے لئے بھی اس کے پاس غصہ نہیں کی جرأت نہ کرتا۔ اپنے کمرے میں جا کر لیٹ جاتا لیکن سو جانے کے بجائے مرجانہ کے متعلق سوچنے لگتا۔ مرجانہ کا رویہ ہمیشہ سے مخلصانہ رہا۔ لیکن چند دنوں سے اس کے سلوک میں اپنائیت کا کچھ زیادہ ہی احساس اسے ہونے لگا جس سے اس کا حوصلہ بڑھ گیا۔ ایک رات جب مرجانہ نے دروازہ کھولا اور پوچھا۔

”آگئے.....؟“ تو شرمگل نے کوئی جواب نہ دیا

بازو کو پڑھانے کے لئے ہونے والے رشتہ دار دیکھ کر شرمگل کو برا لگا اور پیارا لگا۔ جب بیٹی کی زبانی یہ سنا تو شرمگل کو سارا واقعہ معلوم ہوا تو اسے ہنسنا پڑا اور نوروز خان کو تازہ سال کا قاتل کیسے کہہ سکتا ہے اس نے شرمگل کی آمد پر دنبہ ذبح کیا اور کھانا کھا لیا۔

شرمگل نے خیال آیا کہ مہمان بن کر رہنا تو بوجھ بنارہے گا۔ اسے کچھ دنوں پر نوروز خان سے کچھ کہتے ہوئے سنا۔ اس نے سوچا مرجانہ ہی سے کہہ کر اس لڑکی کا نام مرجانہ تھا اور اگلے روز باوراندہ روئے جانے کی تیاری کر رہی تھی تو

”اگرچہ ایک لمحے کے لئے حیرت سے اسے سنا تھا مگر وہ بڑی شرمگل جینا اور کہنے لگا کہ اس کا نام ہے کہ کھل جاتا مجھے نہیں آتا کہ اس کا نام کیا ہے اور کھاس کا نام بھی کیا ہے۔“

”مرجانہ کی تم سے نہیں ہوگا“ مرجانہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”تم ان کاموں کے لئے پیدا نہیں ہوئے۔“

”میں بابا سے بات کر لوں گی وہ بھی یہی کہیں گے۔“

”اگرچہ روئے کر چلی گئی۔ وہ دیر تک وہیں بیٹھا رہا۔“

سیارہ ذابجٹ / اپریل ۲۰۱۶ء

غفلت کی وجہ سے ڈوبنے آپ کو کاٹ کھایا۔“ شرمگل نے غصیلی نظروں سے لڑکی کی طرف دیکھا لیکن دوسرے لمحے اسے محسوس ہوا کہ جیسے جون جولا کی جتنی دوپہر کو وہ ٹھنڈے پانی کے چشمے میں کود پڑا ہو۔ وہ ایک حسین لڑکی تھی۔ شرمگل نے پتلیوں میں سرخاں شایب کا شمار کیا۔ لڑکی نے پتلیوں سے رستا ہوا خون دیکھا تو پریشان ہو گئی۔ بھاگ کر مکتیہ اٹھلائی۔ زخم کو دھویا پھر اور صحتی سے ایک ٹکڑا کھانڈ کر اسے چلا دیا۔ ہونے پڑے کی راکھ کو اس نے زخم میں بھر دیا۔ اس دوران شرمگل بڑے انتہاک سے اس خوبصورت قبائلی لڑکی کے کرب دے جتنی کوشش کر سکتا تھا خون بند ہو گیا تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”کوئی بات نہیں۔“ شرمگل نے مسکرا کر کہا۔ ”تو نے اپنا فرض ادا کیا ہے انسان نے اپنا فرض پورا کر دیا۔“

”آپ اپنی معلوم ہوتے ہیں؟“ لڑکی نے موضوع بدلنا چاہا۔ شرمگل نے ساری تفصیل سنا دی۔ لڑکی کے چہرے پر شوق اور تجسس کا تاثر ابھر آیا۔

”چھا..... تو آپ مفرور ہیں بابا آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔ برسوں کے بعد کسی مفرور کی آمد سے ہمارے گھر کا چرچا ہوگا!“

شرمگل کو چوٹ سی گئی۔ اس نے سوچا کاش..... اسے گھر لے جانے کی وجہ روایات کے بجائے اس کے دل کی ادنیٰ ترین خواہش ہوئی!

ملک نوروز خان ایک زندہ دل انسان تھا۔ ساتھ بیٹھنے کے لگ بھگ ہونے کے باوجود جوانوں کی طرح تندرت تو آتا اور قوی بیکل شخص تھا۔ بڑا پیٹا شاہ داد خان انجینی میں ملازم تھا۔ چھوٹا بیٹا شاہ باز خان جسے بیار سے سب بازو کہتے تھے بڑا ہی کھنڈرا اور شریر تھا۔ بہن ہی کی طرح شفاف آنکھیں اور

کچھ ایسا سکون محسوس ہوا جیسے یہ دیوبکر پہاڑ اس کی حفاظت پر مامور ہوں۔

سرحدیں کتنی اچھی ہوتی ہیں انسان کو نیا جنم دیتی ہیں..... پھر بھی یہ علاقہ اس کے لئے انہی تھا۔ اسے بہر حال کہیں پناہ لینا تھی۔ کسی بڑے خان کی بڑے ملک کی پناہ ورنہ ممکن تھا کہ مقتول کے درجہ رو بہ پیر خرچ کر کے کسی قبائلی سے اس کو کوئی مردا دیتے..... پناہ میں آنے کے بعد کوئی ایسی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ پناہ دینے والا اپنے مہمان کا انتقام ہر قیمت پر لیتا جو وہاں کی روایت تھی۔

وہ ایک پہاڑی پر کھڑا تھا۔ اسے کسی گاؤں کی تلاش تھی اور پہاڑ کے دامن میں اسے بھیڑ بکریاں چرتی نظر آئیں۔ اس نے سوچا قریب کہیں آبادی ہوگی۔ ریوڑ کے قریب پہنچ کر وہ ایک جگہ کھڑا ہو گیا۔ ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ گھڑیا اسے نظر نہ آیا ایک ایک سیاہ لہے لہے بالوں والا کتا بھونک رہا اس کی طرف لگا اس نے پتھر اٹھا کر مارا لیکن کتا نہ ڈکا۔ اس نے صحت سے رویا اور نکالا کہ پرشت باندھی تو ایک نسوانی آواز نے اسے چونکا دیا۔ ”خبردار کتے پر گولی چلائی تو.....“

اس نے ادھر دیکھا اسے تین کتا اس سے اٹھ گیا۔ اس کی شلوار پھٹ سی گئی تھی دانت اس کی پتلی میں گاڑے تھے۔ آواز نوروز خان کی تھی وہ تیزی سے بھاگی۔ اس نے کتے کو چکر چکا کر کتے سے اسے چھوڑ دیا تو لڑکی نے کتے کو دوچار کے سیدھے اور پھر اسے کھینچ کر ایک درخت سے باندھ دیا۔

شرمگل ایک چٹان پر بیٹھ کر اپنی پتلی کو دیکھنے لگا جس سے خون بہہ رہا تھا۔ لڑکی اس کے پاس آ کر محنت کے نتیجے میں بنی۔ ”یہی افسوس ہے میری

سیارہ و اجسٹ کی ایک اور عظیم پیشکش

شرعی احکام

قیمت 175 روپے

ادات سے معاملات تک اور معاشرت سے لیکر سیاسیات تک
تبیین نصاب، قرآنی آیات اور صحیح احادیث کی روشنی میں

اسلامی ضابطہ حیات جس کی روشنی میں آپ اپنے شب و روز گزار
سکتے ہیں۔

آخرت کا توشہ، دلوں کی بیماریوں کے لیے شفاء۔

نیکوں کی طرف رہنمائی اور گناہوں سے بچنے کے طریقے۔

ایسے سنہری حروف جنہیں پڑھ کر آپ اپنے اخلاق و کردار کی
کوتاہیوں کو دور کر سکتے ہیں۔

سیارہ و اجسٹ 240 ریواز گارڈن لاہور فون: 37245412

کر کے کنڈی لگا دی تھی تو بھی شرمگاہوں کھڑا رہا تھا وہ چپ چاپ کھڑا رہا تھا لیکن اس خاموشی نے مجھے روح کی گہرائیوں تک ہلا ڈالا تھا۔ کیا اسی کو محبت کہتے ہیں۔ کیا یہی تھا وہ سحر آگیاں جذبہ جس کے تحت درخونی آدم خان کے لئے مرگئی تھی؟ آدم خان درخونی کے لئے مر گیا تھا؟ موسیٰ خان، گل مئی کے لئے اور گل مئی موسیٰ خان کے لئے مر گئی تھی؟..... ہاں، یہ سب محبت کی راہ میں شہید ہوئے تھے مگر لوگ محبت کرنے والوں کے دشمن کیوں ہو جاتے ہیں؟ ایسی مقدس شے ایسی بے کراں مسرت ایسی بے پناہ سعادت سے وہ انسانوں کو محروم کیوں کر دیتے ہیں؟ نہیں نہیں! مرجانہ تڑپ اٹھی۔ ایسا نہیں ہوگا۔ میں اپنے آپ کو اس مقدس سرور سے محروم نہیں ہونے دوں گی میرا ضمیر پاک ہے میں نے گناہ نہیں کیا۔ صبح طلوع ہوئی تو مرجانہ نے اس کے اجالے میں وہ حسن دیکھا جو اسے پہلے کبھی نظر نہیں آیا تھا۔ شرمگل جاگ رہا تھا اور مسکرا رہا تھا۔ وہ اٹھا، استون بھرے دل کے ساتھ، بے حد سبک سبک پرندے کی طرح ہلکا پھلکا باہر نکلا صحن میں چاروں طرف نگاہ دوڑائی مرجانہ ریوڑ چرائے جا چکی تھی۔ اس کی نگاہیں حویلی کے بڑے دروازے پر جم گئیں۔ وہ مسکرایا اس گھر کا گوشہ گوشہ اسے کچھ ایسا مانوس لگا جیسے اس کا بچپن یہیں گزرا ہو۔ زندگی کا پہلا قدم یہیں اٹھا ہو اسی گھر کی دیوہ سے لڑھکتے سنبھلے اسی صحن کے شیب و فرا میں گر گر کر اٹھا ہو۔ جیسے یہ گھر اس کا ہو یہ سب کچھ اسی کا ہو۔

اچانک بازو اندر آگیا اور بولا ”مکل لالہ۔ سب لڑکے آپ کا انتظار کر رہے ہیں آپ ابھی تک بڑھانے نہیں آئے۔“ شرمگل نے آگے بڑھ کر اسے گود میں اٹھالیا اور بے اختیار ہو کر چوسنے لگا۔ بازو نے حیرت سے کہا ”لالہ..... اتنا پیار تو آپ

اور وہیں کھڑا رہا۔ چند لمحے مرجانہ بھی خاموش کھڑی رہی دونوں کے دل دھڑک رہے تھے اور ایک نامعلوم سا خوف اور نامعلوم سی مسرت کی ملی جلی کیفیت دونوں نے پہلی بار محسوس کی۔

”اندر آ جاؤ.....!“ مرجانہ دھیرے سے بولی۔ وہ اندر چلا گیا۔ مرجانہ نے دروازہ بند کر کے کنڈی لگا دی وہ وہیں کھڑا تھا۔ مرجانہ بھی رُک گئی۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے آخر مرجانہ نرم اور کوئل لہجے میں بولی۔ ”جاؤ..... سو جاؤ!“ وہ پھر بھی کھڑا رہا۔ مگر کچھ کہے بغیر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ مرجانہ دیر تک وہیں کھڑی رہی اس پر نشہ طاری تھا۔ اس کا انگ انگ ایک عجیب سی سرسستی میں بہک بہک رہا تھا اور اس کا دل ایک انجانی خوشی سے معمور ہو گیا تھا۔

شرمگل تو دُور جذبات اور مسرت سے رو پڑا۔ ”جاؤ سو جاؤ.....!“ مرجانہ کا پیار بھرا لہجہ اس کی روح کو چھوڑ گیا تھا۔ ماں کی مٹا، بچپن کا پیار اور محبوبہ کی لگن اس ایک جملے میں سمٹ آئی تھی محبت نے کیا کچھ اپنے دامن میں سمیٹ لیا تھا۔ دُور جذبات سے بے بس ہو کر وہ سسکیاں بھرنے لگا۔ یہ مسرت کی انتہا تھی اس کی حالت معصوم سے بچنے کی سی ہو گئی۔ اسے یہ احساس ڈنک مارنے لگا کہ اس نے ایک انسان کو قتل کیا ہے۔ اس نے پہلی بار دل کی گہرائیوں سے اپنے کئے پر عذارت محسوس کی۔ اس کے ضمیر پر گناہ کا بوجھ اتار گیا۔ اس بوجھ کو اس نے پہلے تو محسوس ہی نہیں کیا تھا۔ لیکن محبت کی آج نے اسے کندن کر دیا تھا۔ آج وہ کسی کا دشمن نہیں رہا تھا۔

مرجانہ اپنے بستر میں لیٹ گئی تو اس نے بھی اپنے سینے میں مسرت کا ایک بے پایاں طوفان اٹھاتا محسوس کیا۔ ایسی خوشی سے وہ پہلی بار دوچار ہوئی تھی اور وہ سوچ رہی تھی کہ جب میں نے دروازہ بند

شرمگل ہنس پڑا۔ اس نے بازو کے سرخ سرخ گالوں کی چٹکی لی۔ ”ہاں بازو.....! اتنا پیار میں نے تم سے پہلے کبھی نہیں کیا مگر دل میں تو کرتا تھا۔ اس سے بھی زیادہ بہت زیادہ بازو..... ظاہر نہیں کر سکتا تھا دل میں چھپا رکھا تھا پیار تمہارا۔“

”ہوں.....!“ بازو بے معنی سی ہنسی ہنسا۔ وہ کچھ سمجھا نہیں تھا۔ مگر اس کی بھوری دیکھ آنکھوں میں معصومانہ خوشی کی جھلک تھی۔

”بازو.....“ شرمگل نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ چھرا۔ ”جاؤ آج تم لوگ چھٹی کرو۔ آج میں بھی چھٹی کروں گا کبھی بھی چھٹی کرنی چاہئے کیوں بازو.....؟“

بازو نے انہماک میں سر ہلایا اور چلا گیا۔ شرمگل تھوڑی دیر کھڑا رہا پھر راستے الٹا کر باہر نکل گیا۔ چاروں طرف بھیڑیں اور بکریاں چر رہی تھیں۔ مرجانہ ایک چٹان پر بیٹھی چکر بن رہی تھی اور دھیسے دھیسے کھتا رہی تھی شرمگل دے قدم اس کی پشت کی طرف کھڑا ہو گیا مرجانہ کھٹکتی رہی۔

”تم نہیں آئے تھے تو میں میں کوئی پہل نہیں تھی کوئی دلدل نہ تھا زندگی خاموشی سے ایک ڈگر پر چل رہی تھی۔ تم نہ آتے تو یہی ایسی طرح کٹ جاتی۔ خزاں اور بہار کا احساس ہی نہ ہوتا تھا تم کس بات کا ہوتا۔ لیکن تم آئے تو اپنی نیلایش آنکھوں سے میرے سینے کو منور کر گئے۔ یہ تم نے کیا کیا کیا؟“

رکھا ہی کیا ہے! شرمگل چپ چاپ کھڑا سمجھتا رہا۔ گیت کی لے اور بول اس کی روح میں اترتے چلے گئے۔ اچانک مرجانہ خاموش ہو گئی۔ اس کی نگاہیں دور افق پر جمی ہوئی تھیں ہونٹوں پر تبسم۔ شرمگل کی نظریں اس کی مرمزین گردن پر پڑ گئی تھیں۔

”مرجانہ.....!“ وہ دھیرے سے بولا۔

مرجانہ چونکی اور دوسرے لمحے اس نے گردن پر سانس کی مہک محسوس کی۔ اس نے مڑ کر دیکھا اور دیکھتی رہ گئی۔ شرمگل جیسے روز ازل سے یہیں کھڑا تھا.....! مدتیں بیت گئیں۔ زمانے بیت گئے۔ مرجانہ کے ہونٹ تھر تھرائے۔ اس کی بھوری آنکھیں خوشی سے ڈبڈبا آئیں۔ اظہار عقیدت کا یہ اُلکھا روپ تھا۔

شرمگل نے بڑے پیار سے اس کے آنسو پونچھ ڈالے۔ وہ مسکرائی۔ شرمگل نے کہا ”تم مجھے افق کے اس پار ڈھونڈ رہی تھیں میں تو تمہارے قدموں میں کھڑا تھا۔“

”خدا کرے میں تمہیں ہر لمحے ڈھونڈتی رہوں اور ہر لمحے پاتی رہوں۔“

”مرجانہ.....“ وہ اس کے پاس چٹان پر بیٹھ گیا۔ ”میں قتل کرنے پر شرمندہ بھی ہوں اور پشیمان بھی لیکن ایسا لگتا ہے جیسے تم سے ملوانے کے لئے تقدیر نے مجھ سے یہ کام کروایا تھا مگر حیرت بھی ہے کہ گناہ کے بدلے اتنی عظیم خوشی ملی ڈرتا ہوں کہ یہ سب کچھ ممکن ہی نہ جانتے.....؟“

”میں درخور ہوں۔“ میں درخور ہوں۔ درخور ہوں۔ ”دیکھو ایک دن اس نے تھا آج یہ میرے پاؤں چاہے۔“ ”تمہاری نیت کو پا گیا۔“

”بہت دیر تک وہ باتیں کرتے گیا۔ گھر پہنچا تو اس کی حیرت اور خوشی اس کا باپ بڑا بھائی اور ماموں ملک نو پاس بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ سب نے لگالیا۔ اس کے چہرے کی رونق اور صحت دیکھ حیران رہ گئے۔ تھوڑی دیر بعد یہ بھی معلوم ہو ان کی آمد کا مقصد کیا تھا۔ مقتول کے در ثاء سے ہو گئی تھی فریقین کے باہمی سمجھوتے کے تحت حکومت نے شرمگل کی گرفتاری کے احکام واپس لے لئے تھے۔ لیکن شرمگل کو واپسی کی خبر بالکل اچھی نہ گئی۔

رات اس نے بھائی کو بتا دیا کہ وہ علاقہ غیر سے واپس نہیں جائے گا اس کا بھائی پریشان ہو گیا۔ شرمگل نے اس سے کہا مجھے واپس لے جانا ہے تو مرجانہ بھی ساتھ جائے گی!“

آخر طے پایا کہ ملک نوروز خان سے لڑکی کا رشتہ مانگ لیا جائے۔ بے حد جھجک اور احترام کے ساتھ نوروز خان کے سامنے رشتے کی تجویز رکھی گئی لیکن اسے بہت تعجب اور افسوس ہوا اس نے شرمگل کے باپ سے کہا ”بے شک ہم ایک بہادر آدمی کی

”دیکھو ایک دن اس نے تھا آج یہ میرے پاؤں چاہے۔“ ”تمہاری نیت کو پا گیا۔“

”بہت دیر تک وہ باتیں کرتے گیا۔ گھر پہنچا تو اس کی حیرت اور خوشی اس کا باپ بڑا بھائی اور ماموں ملک نو پاس بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ سب نے لگالیا۔ اس کے چہرے کی رونق اور صحت دیکھ حیران رہ گئے۔ تھوڑی دیر بعد یہ بھی معلوم ہو ان کی آمد کا مقصد کیا تھا۔ مقتول کے در ثاء سے ہو گئی تھی فریقین کے باہمی سمجھوتے کے تحت حکومت نے شرمگل کی گرفتاری کے احکام واپس لے لئے تھے۔ لیکن شرمگل کو واپسی کی خبر بالکل اچھی نہ گئی۔

رات اس نے بھائی کو بتا دیا کہ وہ علاقہ غیر سے واپس نہیں جائے گا اس کا بھائی پریشان ہو گیا۔ شرمگل نے اس سے کہا مجھے واپس لے جانا ہے تو مرجانہ بھی ساتھ جائے گی!“

سیارہ ذابجٹ / اپریل ۲۰۱۶ء

مقناطیسی سرحد کے ساتھ چپک گیا تھا۔ اس نے مزک وادی پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی۔ ایک پیچھی علاقہ غیر کی طرف سے اڑا جا رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ سرحد پار کر کے نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ شرکھل نے سوچا۔ اس پرندے کی پرواز پر کوئی پابندی نہیں ہے دنیا کا کوئی قانون اس سے باز پرس نہیں کر سکتا جہاں اس کی مرضی ہوگی جتنے آکھن کر کے اپنا شیش بنالے گا۔ اس کے آنسو پھٹ آئے۔ باپ، بھائی اور ماموں اس کے دکھ کو سمجھتے تھے بھائی نے آگے بڑھ کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ شرکھل نے بھائی کی طرف دیکھا اور اس سے پلٹ گیا۔ اچانک کتے کے بھونکنے کی آواز نے سب کو چونکا دیا۔ انہوں نے مز کر دیکھا اور حیران رہ گئے مرجانہ کا ڈیوان کی طرف بھاگا چلا آ رہا تھا۔ مرجانہ اس کے پیچھے پیچھے دوڑی چلی آ رہی تھی۔

”مرجانہ.....!“ شرکھل حیرت سے چنچا۔
مرجانہ ہانپتے ہانپتے ان کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔
”میں نے کہا تھا.....“ وہ ہانپتے ہوئے لہجے میں بولی۔
”میرا نام مرجانہ ہے اور مجھے مرجانا آتا ہے.....!“

”یہ میرے ابا ہیں مرجانہ۔“ شرکھل نے باپ کی طرف اشارہ کیا۔ ”انہیں سلام کرو۔“
مرجانہ نے ایک نظر دیکھا اور چپک کر اس کے پاؤں چھو لئے۔ اور بولی۔ ”مجھے بھی اپنی بیٹی بنا لو بابا میں اب واپس نہیں جاسکتی۔ واپس نہیں جاؤں گی!“
شرکھل کا باپ بھونچکا رہ گیا تھا۔ لیکن چند لمحوں کے بعد سنبھل گیا۔ اس نے مرجانہ کو اٹھایا اور غور سے دیکھا۔ یہ بے مثال لڑکی اس کے بچنے کی خاطر گھریلو دہلیز اور ہر رشتہ توڑ کر آ گئی تھی۔ لیکن یہ اس آدمی کی بیٹی بھی تھی جو اس کا صحن تھا جس نے اس

ساجت کی۔ ہزاروں روپوں کا لالچ دیا لیکن نوروز خان نہ مانا۔ روپوں کے ذکر پر اس نے کہا۔ ”ٹھیک ہے ہم لوگ لڑکیوں کے بدلے روپیہ لیتے ہیں لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہوتا کہ ہم لڑکیاں بیچتے ہیں۔ لڑکی بیچ کر نہیں جانی بلکہ لڑکیوں کے عوض روپیہ لینے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس کی اہمیت بڑھ جائے۔ یہ سودا بازی نہیں ہوتی“ اس میں لڑکی کے تحفظ کا جذبہ ہوتا ہے یہ معاشرتی مسئلہ ہے جس لڑکی پر جتنی زیادہ رقم لی جائے اتنا ہی اسے زیادہ احترام اور تحفظ ملتا ہے لیکن اس کا مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ہم سرحد کے پار بھی اپنی لڑکیاں دے دیں گے!“

سب خاموش ہو گئے۔ ہر معاشرے کا ایک مزاج ہوتا ہے۔ یہ بات ان کی سمجھ میں آ گئی تھی لیکن شرکھل کا اُردا حال تھا گزشتہ رات اس نے محبت کا جو حسین خواب دیکھا چوہیں گھنٹے بھی نہ گزرے تھے کہ وہ ریزہ ریزہ ہو کر دن کی روشنی میں تحلیل ہو گیا۔ صبح اسے یہ گھر چھوڑ دینا تھا۔ ہر حال میں ہر قیمت پر۔ مرجانہ میں اس کی دلچسپی کا اظہار رشتہ ہانکنے کے بعد واضح ہو چکا تھا۔ اس لئے آئندہ وہ اس گھر میں کبھی قدم نہیں رکھ سکتا تھا۔

وہ ساری رات جاگتا اور روتا رہا۔
صبح ملک نوروز خان نے سب کو نہایت وقار اور عزت سے رخصت کیا۔ مرجانہ نظر نہیں آئی۔ وہ حسب معمول ریوڑ بھانے چلی گئی تھی۔

جب وہ سرزمین بے آئین کی آخری سرحد پر پہنچے تو شرکھل کو وہ دن یاد آیا جب وہ مضرور بکر اس سرحد پر پہنچا تھا۔ ان دیوبکر بھاڑوں کو دیکھ کر وہ کتنا خوش ہوا تھا۔ اور اس نے سوچا تھا سرحدیں کتنی اچھی ہوتی ہیں انسان کو نیا جہنم دیتی ہیں۔ آج وہ پھر یہ سرحد پار کر رہا تھا۔ شاید یہ بھی ایک نیا جہنم تھا کیونکہ اس کی آرزوئیں اس کی تمنائیں اس کا سب کچھ اس

لیجئے کچھ Fresh Fruits اپنی جلد کیلئے بھی

لیجئے کیو فریس وینٹنگ کریم

اب اس fruit extract formula کے ساتھ
oil free moisturising, uv protection
اور تک لوگ نہایت کبھی ایک ایک کریم
ایک مکمل all day کیئر



کب زندہ رہوں گا۔“

باپ خاموش ہو گیا۔ شرکھل کے بھائی بھی چپ تھا اور ماموں بھی۔ غالباً محبت جیت گئی تھی۔

ڈوب برابر باری باری سب کو سوگھ رہا تھا جیسے پہچان رہا ہو کہ یہ اپنے لوگ ہیں۔ شرکھل کے باپ نے بھرائی ہوئی آنکھوں سے مرجانہ کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ مرجانہ نے آنکھیں بند کر کے اس کے سینے پر سر رکھ دیا اور عجیب سا سکون محسوس کیا۔ شرکھل ڈوبو چکا رہا تھا۔

شام کو ادا کا دکھ بھیز کبریاں گھر پہنچیں لیکن مرجانہ نہ لوٹی۔ ڈوب بھی غائب تھا۔ ملک نوروز خان کا دل بیٹھا چار رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں یہ خبر سارے گاؤں میں پھیل گئی کہ ملک نوروز خان کی بیٹی بھاگ گئی ہے۔ دوسرے دن آس پاس کے سارے قبائل میں یہ خبر پھیل گئی۔ دوست دشمن سب کے لئے یہ خبر تازیانہ ثابت ہوئی۔ یہ صرف نوروز خان کی عزت کا سوال نہیں پورے آزاد قبائل کی آن کا مسئلہ تھا۔

شام تک ہر گاؤں سے سچے لوگ نوروز خان کے گھر پہنچ گئے جو کہ متفقہ ہوا فیصلہ ہوا کہ ہر گاؤں سے ایک ایک نوجوان چنا جائے لڑکی حاصل کے بغیر کوئی نوجوان واپس آئے تو اسے سرحد پار کرتے گوئی مار دی جائے۔ چنانچہ پچیس نوجوانوں کا دستہ ملک نوروز خان کی سرکردگی میں روانہ کر دیا گیا۔ شرکھل کے باپ نے آتے ہی مرجانہ کا نکاح پڑھا دیا تھا لیکن ابھی شادی کو ایک ہفتہ ہی نہ ہوا تھا کہ ایک رات گاؤں کو چاروں طرف سے گھیر لیا گیا اور اٹھادھند فائرنگ شروع ہو گئی تھی۔ گاؤں کے لوگ بھی غافل نہ تھے کیونکہ ایک قبائلی سردار کی بیٹی ان کی بہو بنی تھی انہوں نے بھی گوئی کا جواب گولی سے دیا۔ دو دن مسلسل فائر ہوتا رہا طرفین کے دو چار آدمی زخمی بھی ہو گئے لیکن فائر بند نہ ہوا۔

کے بیٹے کو چاہ دی تھی اور جس نے اس کے بیٹے کو گھر کے فرد کی طرح رکھا تھا۔ اس نے لڑکی کے سر پر ہاتھ رکھا اور پیار سے کہا ”جی تو تم میرے بیٹے کو چاہا ہے تم مجھے دل و جان سے عزیز ہو تم جیسی بہو چاہا لیکن میری دلچسپی تو شاید ہی ملے لیکن اس طرح تمہیں سمجھتا ہوں تو دنیا کو کیا نہ دکھاؤں گا لوگ کیا کہیں گے کہ سرحد کے اس پار کے پھان کا کردار ہوتا ہے کہ جس برتن میں کھائے اسی میں چھید کرے۔“

مرجانہ گڑ گڑائی۔ ”بابا یہ دنیا داری کی باتیں ہیں میرا ارادہ نہیں بدل سکتا آپ مجھے ساتھ نہیں لے چکیں گے تو جی میں واپس نہیں جاؤں گی آپ جس راستے چاہیں گے وہی میری بھی راہ ہے۔“

”لیکن اس راہ کی کوئی منزل نہیں ہے بیٹی۔ وہ محض جذبات کی راہ ہے یہ موت کی راہ ہے بیٹی موت کی راہ۔“

”مجھے کیا راہ پسند ہے بابا میں اسی راہ پر چلوں گی۔“

”ذرا سوچ بیٹی۔“ شرکھل کے باپ نے اسے گلے لگ لیا۔ ”تم اپنے باپ کی عزت ہو اپنے بھائیوں کی آن ہو جب دنیا سے کی کہ نوروز خان کی بیٹی گھر سے بھاگ گئی ہے تو اس کے لئے یہ قیامت بڑی رسوائی دہری نہیں ہو سکتی۔“

”بابا۔“ مرجانہ نے عزم لیٹھے میں کہا۔ ”خدا کو وہ ہے میں نے رات قسم کھائی کہ جو راستہ منتخب کر لیجی ہوں اس سے ہٹوں گی نہیں۔“

”ابا۔“ شرکھل اچھا آواز اٹھاؤں میں آگے بڑھا۔ ”ان چاہئے ابا مرجانہ کی بات مان چاہئے لڑکی زندگی کی قدروں سے بہت آگے نکل چکی ہے اس کی بات مان چاہئے یہ سرنی تو میں

خدا گواہ ہے کہ میں یا میرا بیٹا اسے اغوا کر کے نہیں ہلائے ہم ایسا کر رہی نہیں سکتے تھے مگر حالات کا تقاضا تھا وہ میری بہو بن چکی ہے۔ میں جرہ کی ہر شرط ماننے کے لئے تیار ہوں لیکن بہو واپس نہیں کر سکتا عزت دینے والی چیز نہیں ہوتی!

نوروز خان نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا چند لمحے خاموش رہا اور پھر جرہ سے مخاطب ہوا۔ ”مجھے بہرام کا خون نہیں چاہئے اس سے میری پاس نہیں بچھ سکتی مجھے اس کی لڑکی کا رشتہ بھی نہیں چاہئے اس سے میری تسلی نہیں ہو سکتی۔ مجھے زور و جواہر بھی نہیں چاہئیں اس سے میرے ذمہ نہیں بھر سکتے۔ بھاگی ہوئی بیٹی باپ کی روح میں جو گھوٹا لگا دیتی ہے دنیا کی کوئی مرہم اسے خشک نہیں پہنچا سکتی۔ تھپڑ کے بدلے تھپڑ اور قتل کے بدلے قتل کیا جاسکتا ہے لیکن میں دل والوں سے پوچھتا ہوں کہ بھاگی ہوئی بیٹی کا

انتقام کوئی کس طرح لے؟ مجھے سمجھاؤ کہ میں یہاں کیا لینے آیا ہوں؟ بہرام کو گوئی مار۔“ یا اس کے بیٹے کو یا اپنی بیٹی کو؟ کوئی بتلائے کہ بھاگی ہوئی بیٹی کے روگ کا علاج کیا ہے؟ کس طرح یہ داغ دھلے گا۔“ کس طرح یہ گردن اٹھے گی۔؟ میں پوچھتا ہوں بھاگی ہوئی بیٹی کے درد کا علاج ہے بھی کہ نہیں۔؟؟ ہے بھی کہ نہیں۔؟؟ ملک نوروز خان زار و قطار رو پڑا۔ جرہ کے میں سناٹا طاری ہو گیا تھا آج چٹان کے آنسو نکل آئے تھے۔

مرجانہ نے یہ سب کچھ سن لیا تھا اس نے محسوس کیا کہ جو خوشی حاصل کرنے کے لئے اس نے جو قدم اٹھایا تھا وہ باپ کے دکھ کے سامنے کتنی حقیر ہے۔ یہ زندگی بجائے خود کتنی عجیب ہے اپنی مرضی کچھ نہیں ہوتی دوسروں کے تعلق سے جینا دوسروں کے احساس کے لئے مرنا۔ تقاضوں کا نام زندگی ہے شاید!

رومانہ کے ہاتھوں میں سہاگ کی مہندی کا لہریں طرح تازہ تھا اور اس سے مہک اٹھ رہی تھی اس کی ناگ میں سندور اسی طرح چمک رہا تھا وہاں کے جذبات کا سندور شوق اسی طرح ہوا میں لہا رہا۔ یہ پارٹی چھ دن کی سہاگن ہی تو تھی۔

تیسرے دن سے پہرہ کو پولیس کی بھاری جھیت لگائی۔ فائرنگ پر قابو پایا گیا لیکن نوروز خان کسی دن بھی گھبراؤ نے برآمد نہ ہوا۔ پولیس افسر نے بارگاہہ جانا تھا کہ کتنی برتی گئی تو سارا قبیلہ اٹھ کر اوروں پر ان لوگوں پر قابو پانا ممکن نہیں ہوگا۔ ان نے لہات ہوشیاری اور ضبط سے کام لیا۔ دشمن سے پار جار آدمیوں کا انتخاب کیا سب کو ایک جگہ میں اکٹھا کیا۔ دونوں پارٹیوں کے طاقتور تھے۔

شرکھل کے باپ نے کہا ”جو کچھ ہوا ہمیں اس پر غور ہے ہم اس پر شرمسار ہیں ہم نوروز خان کے سامنے آنکھ اٹھا کر بات کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ ذاتی طور پر میں ان سے معافی مانگنے سے بھی دریغ نہیں کروں گا۔۔۔۔۔۔ یہ بات میں کسی خوف یا ڈر سے نہیں کہہ رہا بلکہ یہ میرے دل کی آواز ہے میرے ضمیر کی نکار ہے۔ نوروز خان ہمارا دشمن ہے ہم ان سے دغا کرنے والے لوگ نہیں ہیں۔ میں حتی المقدور ہر قسم کی حلائی کرنے کے لئے تیار ہوں ماری جانیدار پوچ کر ان کی خدمت میں پیش کر سکتا ہوں۔ ان کی بیٹی کے بدلے اپنی بیٹی کی شادی ان کے بیٹے سے کرنے کو تیار ہوں خون بہانا ہو تو بیٹے کی جگہ اپنی جان پیش کر سکتا ہوں۔ بلا دریغ میں ان کے ساتھ سرحد پار جانے کے لئے تیار ہوں یہ مجھے لگ کر ہیں دل کی بھڑاس نکال لیں۔ میری اولاد ان سے باز پرس نہیں کرے گی لیکن جہاں تک مرجانہ کا سوال ہے میں جرہ کو یقین دلاتا ہوں

طبی مشورے



حکیم راحت نسیم سوہدروی



حکیم راحت نسیم سوہدروی پاکستان کے معروف طبیب اور اہل قلم ہیں۔ عرصہ میں سال سے مطب کر رہے ہیں اور تعلیم صحت کے حوالے سے اخبارات و رسائل میں لکھتے ہیں۔ پیش کش کونسل فار ایب حکومت پاکستان کے پنجاب سے ممبر اور پاکستان ایسوسی ایشن فار ایمرٹن میڈیسن کے سینئر نائب صدر ہیں۔ بے شمار قومی و بین الاقوامی سپورٹسز میں شرکت کر چکے ہیں اور تحقیقی مقالے لکھ چکے ہیں۔ ان کی طب و صحت پر نہیں سے زیادہ کتب شائع ہو چکی ہیں۔ میدان طب میں مہارت کے درجے پر فائز ہیں۔

نہید پاکستان حکیم محمد سعید کے ساتھ بیس سال تک طبیب کی طبیعت سے خدمات سر انجام دیں۔ وہ سیرہ ڈائجسٹ میں بھی لکھتے ہیں۔ اب انہوں نے قارئین کے سوالوں کا جواب دینے کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ ہر ماہ یہ کالم باقاعدگی سے شائع ہوگا آپ بھی طب و صحت کے حوالے سے اپنا سوال بھیج سکتے ہیں۔

ڈاکٹر حکیم صاحب سے رابطے کے لیے جوابی لغافہ ضرور ہمراہ بھیجیں!

مشروں اور کمر کی درد

سوال: میری عمر 38 سال ہے۔ مجھے گزشتہ سال کمر میں درد شروع ہوا تو درد دور کرنے والی دوا لیا لیکن درد توبی آرام آ جاتا اس طرح کام چلتا رہا مگر پھر یہ گولیاں بھی بے اثر ہونے لگیں اور درد بڑھ گیا تو روایت ہونے لگا۔ ایک ڈاکٹر صاحب کو بل کر لیا تو انہوں نے ایم آئی آر کا مشورہ دیا۔ جس سے پتہ چلا کہ مہروں کی رگ دب چکی ہے اور گردن میں خلاء بڑھ گیا ہے۔ انہوں نے آپریشن کا مشورہ دیا۔ میں طب یونانی کا بغیر آپریشن علاج چاہتا ہوں۔ مجھے اس مرض بارے بتائیے نیز علاج آواز کریں۔

(ذوالفقار علی۔ جہلم)

جواب: اگر کمر درد ٹانگوں کی طرف بڑھ رہا ہو تو LUMBER میں اعصاب دب رہے ہیں اپنا گھٹنا سینے کی طرف اٹھائیں یا جھکنے کی کوشش کریں اگر ٹانگہ میں درد بڑھے تو ڈسک متاثر ہو سکتی ہے۔ آرام کی حالت میں خاص کر جب آپ رات کو بیدار ہوں تو درد بڑھ جائے اور بخار بھی ہو تو ریزہ کی ہڈی میں انفیکشن ہوتی ہے۔ پیدل چلتے ہوئے ٹانگوں میں کمزوری محسوس ہو یا سن ہو جائے تو اس کی وجہ ریزہ کی ہڈی سے جڑے مسل کا کوئی مسئلہ ہو سکتا ہے۔ کمر کے چوتھے مہرے میں رگ دب رہی ہو تو درد دریاں میں، اگر پانچویں مہرے میں رگ دب رہی ہو تو درد پنڈلی میں ہوتا ہے۔ دونوں یا ایک بازو میں درد یا سن ہو تو گردن کے مہروں میں خلاء یا تنگی واقع

لیا۔ تھوڑی دیر کے بعد مرجانہ نے سر اٹھایا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا ”یہ میرا آخری فیصلہ ہے شرم گل!“

”میرے بابا کو اطلاع کرادو کہ مرجانہ ان کے ساتھ واپس جائے گی۔“

جرگہ کو اطلاع ہوئی شرم گل کے باپ نے یہ خبر بے حد حیرت سے سنی لیکن ملک نوروز خان کے چہرے پر کسی قسم کا رد عمل نہیں تھا۔ الیت بیٹی کے فیصلے پر اس نے راضی کی میگزین خالی کر دی۔ شاید اس کی جگہ ختم ہو چکی تھی۔ اسی دن وہ لوگ مرجانہ کو ساتھ لے کر پلے گئے۔ پورا گاؤں اُداس تھا لڑکی کے فیصلے پر سب حیران تھے۔ آئی تھی تو گئی کیوں؟ شرم گل کے سوا اس کی وجہ کوئی نہیں جانتا تھا اور شرم گل اپنے آپ میں نہیں تھا۔

اگلے دن وہ سرحد پر پہنچ گئے ان کا اگلا قدم اس سرزمین پر پڑ رہا تھا جہاں کوئی قانون نہیں تھا۔ نوروز خان رُک گیا۔ اس کے ساتھی بھی رُک گئے لیکن مرجانہ نہ رُکی تادم و محبوب، سر جھائے ہوئے سب کے پاس سے ہو کر آگے بڑھ گئی۔

یہ سرزمین ہے آئین شرم گل..... گولیوں کی ایک بو چھاؤں فار ہوئی۔ وادی لرز گئی۔ مرجانہ توب کر پلٹی اور پلٹ کر گر پڑی۔ سارا مجمع خاموش کھڑا تھا۔ وہ چند لمحوں پر تری..... ایک دو پچکیاں لیں اور ایک آدھ بار زخمی پچکی کی طرح منہ کھولا اور بندھ گیا۔

اس کی گمش آنکھیں آسمان کی طرف تیک رہی تھیں اس کا خوبصورت جسم چھلنی ہو چکا تھا..... اور محبت و جذبات کا سرخ سرخ جیتا جیتا لدا بہہ رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔

”میرا نام مرجانہ ہے مجھے مرجانہ آتا ہے!“

جھوٹ

نچر (شاگرد کی ماں سے): آپ کے بیٹے کو پڑھنے کا ہائل شوق نہیں۔

ماں: یہ بات تو غلط ہے۔ اگر میرے بیٹے کو پڑھنے کا شوق نہ ہوتا تو ہر کلاس میں دو تین سال کیوں لگتا!!

اس نے شرم گل سے کہا ”میرے محبوب! میں تجھ سے دور چلی جاؤں گی!“

شرم گل ہکا بکا رہ گیا۔ اس نے حیرت و استعجاب سے مرجانہ کی طرف دیکھا مگر زبان نے اس کا ساتھ نہ دیا جس آنکھیں تھیں کہ واکھیں اور فکر کر کر مرجانہ کو دیکھ رہی تھیں۔

”شرم گل!“ مرجانہ نے رندھی ہوئی آواز میں کہا..... مجھے جانا ہی ہوگا۔ مجھے لیاٹ چاہئے کہ میں باپ کی عزت سے کھلی ہوں زندگی دوسروں کے لئے ہو..... مجھے اس کا آج احساس ہوا ہے۔ ”مگر جو ہوتا تھا وہ تو ہو چکا۔“ شرم گل خرب اٹھا..... ”میری عزت تو گرے ہوئے آنسو کی طرح ہوتی ہے وہ واپس کیسے آ سکتی ہے؟“

”وہ واپس نہیں آ سکتی میرے جانان وہ واپس نہیں آ سکتی۔ مگر میں تھوڑی بہت تلافی کرنا چاہتی ہوں بہت کم ہی مگر میں اعتراف کروں گی مجھے عمامت کی سزا ملنی چاہئے۔“

”کیا تم رتا پاتی ہو.....؟“

”ہاں..... شاید باپ کا بوجھ لگا ہو جائے کچھ دکھ تو کم ہوگا ان کی آن کو ذرا سا سہارا تو مل جائے گا۔“

مرجانہ نے ایک لمحے کے لئے اسے بھرپور دکھ ہونے سے دیکھا۔ پھر اس کے سینے پر رکھ دیا۔ شرم گل نے جذباتی انداز میں اسے انہوں میں لے

کرو درد و حرم کا ہوتا ہے ایک مار ACUTE
دور اور مزمن CHRONIC اگر درد دو تین ماہ تک
رہے تو مزمن کہلاتا ہے اگر مہروں میں فاصلہ بڑھ
جائے یعنی غلاء آجائے تو بھی درد شدید ہوتا ہے
ریڑھ کی ہڈی کل 33 مہروں پر مشتمل ہے 26
مہرے حرکت کر سکتے ہیں جب کہ سات مہرے
حرکت نہیں کر سکتے۔ ریڑھ کی ہڈی میں خاص وقفہ
ہوتا ہے جہاں سے ریدیں اور شریانیں جسم کے
ساتھ شلک ہوتی ہیں۔ ریڑھ کی ہڈی دماغ اور جسم
کا رابطہ برقرار رکھتی ہے۔ اگر ان مہروں کی ترتیب
میں نظم یا ربط قائم نہ رہے تو درد شروع ہو جاتا ہے
مہرے ایک خاص ترتیب سے ایک دوسرے کے
ساتھ جڑے ہوتے ہیں اور اپنے درمیان خون کی
نایلوں اور حرام مغز کی حفاظت کرتے ہیں۔ ڈسک
حفاظتی خول کی ایک بیانی کی مانند تھوڑا اور لاتوں
والی ہوتی ہے ہر دو مہروں کے درمیان حفاظتی خول
(ڈسک) ہوتا ہے جو کہ مہروں کی حرکت میں آسانی
پیدا کرتا ہے اگر انسان گر جائے یا چوٹ لگ جائے تو
اس کا فوری اثر سائے نہیں آتا بلکہ آہستہ آہستہ درد
کا احساس ہوتا ہے۔ حرام مغز تین تہوں کے اندر لپٹا
ہوتا ہے۔ ان تہوں کے اندر مخصوص تہوں کے اندر لپٹا
حرام مغز آسانی سے ریڑھ کی ہڈی میں نقل و حرکت
کر سکتا ہے۔ اگر کسی حادثے کے سبب حرام مغز میں
خون چلا جائے تو حرام مغز کے غلطے متاثر ہو جاتے
ہیں لیکن ریڑھ کی ہڈی کے اندر موجود رگیں اس قسم
کے نقصان کی تلافی کر لیتی ہیں آپ نے ایک کی آڑ
کا سمیت کر لیا ہے جس سے یہ بات واضح ہو گئی ہے
کہ مہروں کی رگ دینے اور غلاء پیدا ہونے سے درد
ہوتا ہے۔ تاہم کہ درد کی اور وجوہات میں مسلسل
دینی دباؤ جبکہ کہ زیادہ وزنی سامان اٹھانا شدت

گلاس پانی میں جوش دے کر چھان کر صبح نہار منہ پی
لیا کریں غذا میں پھل سبزیاں زیادہ استعمال کریں
ناشتہ میں دودھ لیں دوپہر کھانے کے ساتھ سلاط
ضرور لیں کئی ترش اور تیل والی اشیاء سے پرہیز
کریں اللہ شفا دینے والا ہے۔

بلغم والی کھانسی

سوال: میری عمر 34 سال ہے بہت اچھی
صحت ہے۔ گزشتہ کچھ عرصے سے مجھے سانس لیتے
ہوئے مشکل پیش آتی ہے۔ پہلے شدید کھانسی ہوتی
ہے جس کے ہمراہ زور لگانے پر بلغم نکلتا ہے جو
بہت گاڑھا ہوتا ہے۔ سینے پر بوجھ محسوس کرتا ہوں
کبھی تو سانس لیتے ہوئے سینے کی آواز آتی ہے
مجھے ایک عادت سگریٹ نوشی کی بھی ہے اس
تعلیف سے نجات کے لئے طب کی روشنی میں
مشورہ دیں۔

(انجم وحید - سکھر)

جواب: بلغم کی زیادتی کے باعث یہ بھیجیروں
میں جمع ہو کر جم جاتا ہے اس طرح جب کھانسی ہوتی
ہے تو اس بلغم کو نکالنے کے لئے بھیجیروں کو زور لگانا
پڑتا ہے اس بلغم کے سبب ہی سینی کی آواز آتی ہے
میرا خیال ہے کہ اس کی بڑی وجہ سگریٹ نوشی ہے
میرا مشورہ ہوگا کہ آپ تمباکو نوشی ترک کر دیں اب تو
دنیا بھر کے ماہرین طب و صحت تمباکو نوشی کو متعدد
امراض کا سبب قرار دیکر اس کی تکلفا ہم چلا رہے
ہیں تمباکو کے ہر بیکٹ پر لکھا ہوتا ہے کہ یہ وجہ سرطان
کیسے ہے۔ یہی آپ کو کونجیوز کر رہا ہوں اس سے
شفا ہوگی مگر آپ نے تمباکو نوشی ترک نہ کی تو کچھ
عرصہ میں یہ مسئلہ دوبارہ ہو جائے گا۔

لعوق پستان آدمی بچی جائے والی ہمراہ شربت
انجاز 2+2 چھ صبح و شام کل از غذا چندہ روز
استعمال کریں کھٹی تیل والی اشیاء سے پرہیز کریں

پانی ایک چمچ ملا کر پی لیا کریں۔ اس کے
ساتھ کر درد اور مہروں کے لئے طب یونانی کا
دوا استعمال ملان ایس سی بی (سپائریڈ لاس
پیکس) جو کہ کونجیروں کے نام سے عام
ہوتا ہے 45 یوم استعمال بغیر آپریشن مفید و
فایده ہے اس نسخہ کا استعمال اس باکس میں
دیا ہے۔ مہروں کے درمیان رگ دب جانے
اور رگ کے لئے عرصہ 25 سال سے آزمودہ
دوا ہے اور تمام مہروں میں آسانی سے مل جاتا
ہوگا ان کے فون نمبر 051-5532085 پر
دیکھا جائے امید ہے کہ آپ کو اس نسخہ اور
دوا سے پریشانی کی ضرورت محسوس نہ ہوگی۔

بھوک کم لگنا

سوال: میری عمر 29 سال ہے۔ جسمانی صحت
مضبوط مگر کچھ عرصے سے مجھے بھوک بہت کم لگتی
ہے کھانے کو بھی جی نہیں چلتا۔ رنگت زرد پڑ چکی
ہے کب کبے ہیں کہ خون کی کمی ہے۔ اگر یہی
دلیل رہی تو پھر میرا چہرہ مرجھا جائے گا۔ اس وجہ
سبب سے پریشان ہوں مجھے دسکی طب سے لگاؤ ہے
لیکن روشنی میں مجھے مشورہ دیں تاکہ میرا چہرہ سرخ
اور خوب ہو جائے۔

(فتح رحیم - فیصل آباد)

جواب: آپ کا خط پڑھا۔ اس سے اندازہ ہوتا
ہے کہ آپ کو کمر کا نعل ست ہونے کا عارضہ ہے اسی
وجہ سے بھوک نہیں لگتی۔ جب جسم کو اس کی ضرورت
مطابق غذا نہیں ملے گی تو پھر رنگت زرد ہوگی اور
فنان کی کمی ہو جائے گی پھر اس طرح اور کئی قسم کے
اضطرابات ہو جائیں گے۔ آپ ذیل کی تدبیر چندہ
روز تک کریں امید ہے کہ شفا ہوگی۔ ہوا لٹانی
اور صبح 9 دانہ، آلو بخارا 10 دانہ، 5 دانے آدھے

سردی، موٹاپا، ورزش میں عدم توازن، ڈرائیونگ یا
عام نشست پر زیادہ دیر تک 90 کے زاویے پر بیٹھنا
حادثہ، کیمیا کی کمی ہڈیوں کی ٹی ٹی ڈسٹری پار پانی کا
استعمال، ریڑھ کی ہڈی میں زخم کرسی پر بیٹھ کر طرف
آگے جھک کر تادیر کام کرتا، پیٹ کے بل سونا یا
ہڈیوں میں اندرونی تبدیلی بھی ہو سکتی ہے۔

آپ درج ذیل ہدایات پر عمل کریں پسند کی
حالت میں ایئر کنڈیشنر ماحول میں نہ جائیں وزن
اٹھانے میں احتیاط کریں سانس کی جانب جھک کر یا
ٹانگیں سیدھی اٹھا کر کوئی شے نہ اٹھائیں، کوئی وزن
والی شے اٹھاتے ہوئے کمر کے بجائے ٹانگوں پر
وزن لائیں پیٹ کے بل نہ سویں اور سخت گدے پر
سوئیں۔ فٹ پاتھ پر قدم رکھتے اور اترنے سے قبل
اس کی اونچائی کا بخور اندازہ کر لیں چلتے مڑتے
وقت مہروں کو پہلے حرکت دیں اور جسم کو بعد میں
موڑیں۔ گاڑی چلاتے ہوئے اپنی نشست کو آگے
کی جانب کھسکا لیں تاکہ آپ کے کھٹے کپڑوں سے
اوپر ہو سکیں۔ کرسی کی پشت سخت اور سیدھی ہونی
چاہئے۔ گھومنے والی کرسی پر نہ بیٹھیں۔ روزانہ ہلکی
ورزش یا چھل قدمی مفید ہے۔ وزن نہ بڑھنے دیں
غذا میں بکرے کی پشت کے گوشت کی بچنی اور کھجور
مفید ہے۔ ترش اشیاء سے احتیاط کریں درد کمر کیلئے
ورزش مفید ہے مگر تکلیف سے غیر متعلقہ ورزش نہ کی
جائے۔ زمین پر کمر کے بل لیٹ کر کھٹے اٹھے ہوں
اس کے بعد کندھے اٹھائیے اور ہاتھ کی انگلیوں کے
اگلے حصے ٹانگوں کو چھوئیں روزانہ دس بار یہ عمل
کریں۔ درد دور کرنے والی ادویہ اور کارٹی زن
سٹیرائڈ کے استعمال سے احتیاط کریں یہ وقتی افادہ
ہے بعد میں اور مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ دوائی تدبیر
کے طور پر مغز پیہ دانہ (عنوانے کی گری) ایک چمچ
جائے والا رات گرم پانی میں بھگو دیں صبح چھان کر

سیارہ ڈائجسٹ / اپریل ۲۰۱۶ء

میں رہنمائی کریں کہ میں کیا کروں۔

(مجم الحسن - اسلام آباد)

جواب: سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ باقاعدگی سے علی اسح نماز فجر کے بعد سر ضرور کیا کریں دوسری بات یہ ہے کہ آپ اپنی غذا پر توجہ دیں غذا ایسی ہونی چاہئے جو متوازن ہو متوازن غذا سے مراد ایسی غذا ہے جس میں جسم کی ضرورت کے تمام اجزاء ہوں اس کے ساتھ ساتھ یہ نسخہ آپ ایک ماہ تک استعمال کریں۔

اور تباہ کنوشی ترک کر دیں امید ہے کہ آپ کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔

دماغی طاقت

سوال: میری عمر 41 سال ہے۔ صحت بہت اچھی ہے میں مطالعہ بہت زیادہ کرتا ہوں پھر لکھنے لکھانے کا بہت کام ہے جس کی وجہ سے دماغی محسوس کرتا ہوں کبھی کبھی چیزیں بھول جاتا ہوں جب چند کھنے مسلسل پڑھوں تو اٹھتے ہوئے سر جھکاتا ہے جو کچھ دیر بعد ٹھیک ہو جاتا ہے مجھے طب کی روشنی

عوامی لیڈر

یونٹیا کے مرحوم صدر ڈاکٹر عزت بیگودچ کا واقعہ ہے۔ جینوا میں یونٹیا کے مستقبل کے بارے میں وقتاً فوقتاً امریکی اور یورپی نمائندوں کی میٹنگ ہوا کرتی تھی۔ ایک ایسی ہی میٹنگ میں عزت بیگودچ کو شرکت کرنا تھی وہ اپنے دفتر سے ایئر پورٹ کے لئے روانہ ہوئے مگر راستے میں ڈرائیور کو ہدایت کی کہ مراجیو شہر کا دورہ کریں، پہاڑوں پر سے سرب شریلینڈ گولیاں برسا رہے تھے لیکن یہ بالکل بھی نہیں ڈرے جب ساتھ میں بیٹھے وزیر خارجہ نے پوچھا کہ آپ یہ خطرہ کیوں لے رہے ہیں تو صدر نے کہا کہ میں میٹنگ میں جانے سے چشمہ خند یہ محسوس کرتا چاہتا ہوں کہ میرے عوام کن حالات کا شکار ہیں اور ان پر کیا گزر رہی ہے تاکہ میں میٹنگ میں اپنے اور ان کے احساس، احوال کی صحیح عکاسی کر سکوں۔

پھر تھانے ہاں ماشاء اللہ لیڈر تو چھوڑیں کل تک مرکزوں پر مارے مارے پھرنے والے قائد ملت ہدف کیوں نہ ہو یہ مالیت کی کار اور دس بارہ کاروں کے حفاظتی دائرے میں گھر سے نکلے تھے لیکن قلعوں میں جتنے عوامی لیڈر بن کر عوام کو خطاب کرتے ہیں اور نظام بننے کی بات کہتے ہیں۔

(ڈاکٹر عبدالقادر خان کے کالم سے اقتباس۔ مرسلہ: انعام الحق)

عملی امور



سیارہ ڈائجسٹ
کا عظیم الشان

قرآن مجید

قارئین کے اصرار
اور مانگ کے تحت دس
سال کے بعد نیا ایڈیشن
شائع ہو رہا ہے۔

- ☆..... دماغی اہمیت اور افادیت کا حامل
- ☆..... ایک متاع بے بہا
- ☆..... ایک دستاویز
- ☆..... اعلیٰ رنگین طباعت
- ☆..... ضخامت 1500 صفحات
- ☆..... تین جلدوں میں

525/- عملی قیمت

قارئین کرام براہ راست بذریعہ آڈیو یا ویڈیو قرآن مجید کو سیکھ سکتے ہیں

سیارہ ڈائجسٹ 240 میں مارکیٹ پر ہر روز کا روزانہ لاہور
3724512

دارت

”اور تم یہ بھی جانتی ہو کہ اب تمہارے بچے بڑے ہو گئے ہیں اگر اب تک سمجھ نہیں تمہاری حسرتیں تو اب سمجھنا شروع ہو جائیں گے۔“ ملک ریاست نے چڑ کے جواب دیا۔ ”بچے کچھ سمجھیں یا نہ سمجھیں مگر تم انہیں ضرور سمجھا دو گے۔“ ناخبرہ مری طرح چلائی۔

ماں بڑی مکی مانی، وہ ایک دوسرے کی کنزوریان سے فائدہ اٹھا رہے تھے

ان تراشوں کو مٹی میں دیوچ رکھا تھا۔ تراشے چڑ مڑ ہو چکے تھے۔ اس نے بند مٹی کھولی اور نفرت سے ان تراشوں کو دیکھنے لگی۔ وہ کچھ دیران کو گھورتی رہی پھر اس کے قدم باورچی خانے کی طرف چاہے تھے۔ باورچی خانے میں ایک طرف ماسی برتن دھو رہی تھی۔ تو دوسری طرف ایک نو عمر لڑکی آٹا گوندھ رہی تھی۔

امید فاطمہ نے مٹی میں بند ان تراشوں کو دیکھا
مال نے مختلف رسائل اور جرنا سے اکٹھے کئے
نہ وہ جہاں سے بھی ماں کی عظمت اور تعریف
ملتا تھا اس کے لئے یا اشعار پڑھتی وہ تراشہ کاٹ
کر اپنے پاس سنبھال کے رکھ لیتی تھی۔ اب اس کے
بال کاٹ تراشے جمع ہو چکے تھے۔ امید فاطمہ نے



اس کے بعد بیرسیال دودو چھچھے لی لیا کرین بلڈ پریشر کے مریض احتیاط کریں کیونکہ نمک سے بلڈ پریشر بڑھ جاتا ہے بلڈ پریشر کے مریض سوئف چھ گرام ایک کپ میں جوش دے کر چھان کر کھانے کے بعد لی لیا کریں یا عرق سوئف آدھا آدھا کپ لے لیا کریں امید ہے کہ آپ کا مسئلہ سوئے ہمیں حل ہو جائے گا۔

قبض

سوال: مجھے قبض کی شکایت رہتی ہے کبھی دودو روز اجابت نہیں ہوتی مجھے طب کی روشنی میں کوئی آسان تدبیر تحریر کریں جس سے میرا مسئلہ حل ہو جائے۔

جواب: سوئف چھ گرام سناٹلی چھ گرام دلوں کو ملا کر آدھے گلاس پانی میں جوش دیں پھر حسب ضرورت پختی ملا کر لیا کریں دودو پھر کے کھانے کے ساتھ سلا د بنا کر ایک پلیٹ استعمال کر لیا کریں۔

بادام 150 گرام چلغوزہ 100 گرام پستہ 100 گرام خشکاش 100 گرام سب کو خوب باریک پیس کر مٹی میں ڈال کر بھون لیں پھر دودو درجن انڈوں کی زردی ابال کر شکر ڈال کر قورم بنالیں زعفران تین گرام باریک پیس کر ملا دیں غنڈا ہونے پر ورق نقرہ ملا دیں روزانہ صبح ایک چمچہ دوا کے ساتھ استعمال کریں دماغ کی طاقت یادداشت کی بہتری کے علاوہ مقوی جسم بھی ہے موسم سرما میں تو ایک ماہ تک اس کا استعمال بہت مفید ثابت ہوتا ہے۔

پیٹ درد

سوال: میں بیک میں کام کرتا ہوں میری عمر 29 سال ہے۔ میرا مسئلہ ہے کہ کھانے کے بعد پیٹ میں گیس بھر جاتا ہے جس سے پیٹ پھول جاتا ہے پھر پیٹ میں درد ہوتا ہے کافی چورن اور ہاتھ والی ادویہ استعمال کر چکا ہوں مگر مسئلہ حل نہیں ہوا۔ میں اس تکلیف کے ہاتھوں بہت پریشان ہوں مجھے بتائیے کہ میں کیا علاج کروں تاکہ اس مرض سے نجات پاسکوں۔

(عبداللطیف - کراچی)

جواب: لطیف صاحب! آپ کا مسئلہ سوئے ہضم ہے۔ آپ اپنی زندگی میں تبدیلیاں لائیں علی الاعن بیدار ہوں نماز فجر کے بعد سیر کیا کریں کھانے میں زرد ہضم استعمال کریں بادی نفس اشیاء سے پرہیز رکھیں رات کاٹنے کے بعد ہلکی چال قدم ضرور کریں شرب چپاتی آپ کے لئے بہت مناسب غذا ہے سالن میں ادورک کا استعمال بڑھادیں اور ذیل کی تدبیر بطور دوا کریں۔

سوئف دس گرام اجوائن 10 گرام کالا نمک 5 گرام تمام اجزاء صاف کر کے پیس لیں اور کھانے کے بعد تین تین گرام تازہ پانی سے چمک لیا کریں

قارئین کرام! آپ خط لکھتے وقت اپنی عمر کام کی نوعیت اور عام جسمانی صحت کے ساتھ ساتھ ذیابیطس اور ہائی بلڈ پریشر ہونے کی صورت ضرور لکھا کریں۔ جواب کے لئے اپنی باری کا انتظار کریں۔ جواب طلب امور کیلئے جوابی لقافہ ارسال کریں۔

خطوط حکیم راحت نسیم سوہدروی معرفت ماہنامہ سیارہ ڈائجسٹ 244 ریوڈ گارڈن لاہور یا حکیم راحت نسیم سوہدروی مطلب احمد ریسیم موڈ علامہ اقبال ٹاؤن لاہور کے علاوہ ای میل HKNASEM@gmail.com پر بھیج سکتے ہیں۔

قہر کو تہہ پہنچا تو وہ کہتا تھا کہ نہ پام تھا۔
عباس کو اپنی ہی سوجھ بوجھ میں گم رہنے والی
کمرے میں چھپ چھپ کے آنسو بہانے والی
خاموش صبح اپنی یہ بین دل و جان سے عزیز تھی۔ اور
امید فاطمہ بھی عباس کی تکلیف پر تڑپ اٹھتی تھی۔
عباس یہ سب بتا کر امید فاطمہ کو حیرت دہی نہیں کرنا
چاہتا تھا۔ دونوں کا درد مشترک تھا۔ وہ جانتے تھے مگر
ایک دوسرے کو کچھ کہہ نہ سکتے تھے مگر نہ کہتے ہوئے
بھی بہت کچھ کہہ دیتے تھے۔

☆ ☆ ☆

خوبصورت بچروں سے بنی حویلی کے مالک
ملک امداد حسین کے تین بیٹے تھے۔ تینوں شادی شدہ
تھے یہ ایک خوشحال گھرانہ تھا۔ اس کے دو بیٹے تو اپنی
اپنی بیویوں اور اولاد کے ساتھ خوش و خرم زندگی گزار
کر رہے تھے مگر تیسرے بیٹے ملک ریاست اور
کی بیوی فاطمہ میں ہمیشہ غمی رہتی۔ ملک امداد حسین
فوت ہو چکے تھے، جائیداد تقسیم ہو چکی تھی۔ بچروں
والی خوبصورت حویلی ملک ریاست کے پاس آئی
تھی۔ دونوں بھائی الگ الگ رہنے لگے۔
کی فراوانی اور نوکروں کی فوج تھی۔
بہسی کبھار علی باورچی خانے میں ہاتھ
باورچی خانے کا مکمل انتظام ملازموں کے ہاتھ
تھا۔ مگر کے ماحول کو کشیدہ کرنے میں ملک ریاست
اور اس کی بیوی فاطمہ کا کردار بہت اہم تھا۔ ان کے
دو بیٹے تھے عباس اور امید فاطمہ دونوں بچپن ہی سے
مال باپ کی لڑائیوں کے عادی تھے۔ دونوں میاں
بیوی میں لڑائی ہوتی دونوں جیتنے چلتے جیت جیت
فاطمہ کی بیوی ملک ریاست آخر ہار مان لینے اور مگر
سے نکل جاتے۔ بیٹے اپنی جوانی میں قدم رکھ چکے
تھے۔ دونوں کانچ جاتے تھے۔
وہ بھی ایک ایسا ہی دن تھا جب ملک ریاست

سینارہ ڈائجسٹ / اپریل ۲۰۱۶ء

سے باہر نکل گئی۔ اب وہ عباس کے کمرے کے
سامنے کھڑی تھی۔ بلکے سے دھکے سے دروازہ کھل
گیا۔ عباس نے لال سرخ ہوتی نگاہوں سے امید
فاطمہ کی طرف دیکھا وہ اپنے آنسو چھپانے کی کوشش
کر رہا تھا۔ امید فاطمہ عباس کے قریب آ کر بیٹھ گئی۔
عباس کے گھٹنوں پر کتاب کھلی پڑی تھی۔

”کیسی تیار ہے پیپر کی عباس؟“ عباس نے
امید فاطمہ کی جانب دیکھا مگر کوئی جواب نہ دیا۔
”عباس تم نے کھانا کھایا؟“ وہ دوبارہ بولی۔
”تم جاؤ یہاں سے مجھے معلوم ہے میں نے کیا
کرتا ہے اور کیا کھاتا ہے۔“ عباس دھاڑا۔ امید
فاطمہ بجائے باہر جانے کے اس کے قریب آ کر بیٹھ
گئی۔ وہ جانتی تھی وہ اس وقت بھوکا ہے۔ بھائی کی
اس حالت پہ اس کا دل کٹا جا رہا تھا۔ ”دیکھو عباس
اگر تم بھی مجھ سے ناراض ہو گئے تو شاید میں مجرّم
نہ رہ پاؤں۔“ امید فاطمہ نے بھرائی آواز میں عباس
کو مخاطب کیا۔ عباس نے بہن کی طرف بے چارگی
سے دیکھا اور کہا۔ ”ابھی بھوک نہیں جب بھوک
لگے گی کھالوں گا۔“ کبھی کھانا چھوٹا ہے ہم سے؟ اور
ہاں وہ ملا تھا آج۔“ عباس نے نگاہیں چٹکی کرتے
ہوئے آہستہ سے امید فاطمہ کو کہا۔

”کون؟ امید فاطمہ نے بے چینی سے پوچھا۔
”وہ جو۔۔۔۔۔۔ وہ جو۔۔۔۔۔۔“ عباس کہتے کہتے رُک گیا۔
”فیاض؟“ امید فاطمہ نے غور سے عباس کی
طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ عباس نے سر ہلایا۔
”جانتی ہو وہ کیا کہہ رہا تھا آج۔۔۔۔۔۔؟ مگر شاید میں
جھپٹیں بتا نہیں پاؤں گا۔“ عباس نے آہستہ سے
امید فاطمہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ عباس گہری
سوچ میں تھا اور صبح کا واقعہ اسے رہ رہ کر بے سکون
کے جا رہا تھا۔ آج صبح جب وہ کانچ جانے کے لئے
نکلا تو اس نے دیکھا کہ فیاض اس کے پیچھے چلا آ رہا

تیسری ملازمہ دوپہر کے کھانے کی تیاری کر رہی تھی۔
ماسی نے اندر آتی امید فاطمہ کو دیکھا اور بولی۔ ماں
صدقہ پڑ کوئی کام تھا تو مجھے کہا ہوتا۔
امید فاطمہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ بغیر بولے وہ
چولہے کی جانب بڑھی اب اس نے کھٹی میں دبے
کاغذوں کو ایک ایک کر کے جلانا شروع کر دیا۔ جوں
جوں کاغذ جل کے ختم ہوتے گئے امید فاطمہ قدرے
برسکون ہوتی گئی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے دل
کی گھٹن کم ہو گئی ہے اور دل سے کچھ یو جھکم ہو گیا
ہے۔ ”جھوٹ جھوٹ اور صرف جھوٹ۔۔۔۔۔۔“ اس
نے نفرت سے چولہے میں جلنے کاغذوں کے ٹکڑوں
کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا۔ اس کا بی چاہ رہا تھا کہ
کاش یہ تمام گھماری اور شہرہ اس کو مل جائیں تو وہ
ان سے کہے کہ کیوں لکھتے ہو اتنا جھوٹ۔ آؤ ذرا
میرے گھر میں آ کر چھانکھیں ماں کی عظمت کے
نظارے کراؤں۔ اس کا بی چاہ رہا تھا کہ ان تمام لکھنے
والوں کے قلم توڑ دے جو ماں کی عظمت میں رطب
السان تھے۔ ایک بار آؤ تو سبھی تمہیں معلوم ہو کہ
عظمت حاصل کرنا کتنا مشکل ہے۔ اب وہ اپنے
کمرے میں پہنچ چکی تھی بیڈ پر لیٹی وہ مسلسل چھت کو کھٹو
رہی تھی۔ وہ سوچنے لگی میں آج کیوں اتنی جذباتی
ہو رہی ہوں یہ کوئی نیا کام تو نہیں ہوا۔ آج اس کے
دماغ میں بار بار اخباری تراشوں کے شعر آرہے تھے۔
ہے میرے لئے سایہ دیوار میری ماں

ہو نہ سایہ دیوار تم نے سایہ دیوار کیا بننا ہے ماں
تم نے تو ہمیں کڑی دھوپ میں کھڑا کر رکھا ہے۔
اس کڑی دھوپ کی جلن میرے پورے وجود میں
سراست کر رہی ہے اور تیری دعاؤں نے آفتوں کو کیا
روکنا ہے تو نے خود ہی آفتوں کے پہاڑ توڑ رکھے
ہیں۔ امید فاطمہ کو کسی ہل سکون نہیں آ رہا تھا۔ وہ
آہستہ سے بستر سے اٹھی اور آہستہ آہستہ چٹکی کرے

سیارہ ڈائجسٹ

ب روایت ایک نئی اچھوتی اور یادگار پیشکش

شائع ہو گیا ہے



توبہ اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کے دروازے کھولتی ہے

قرآن مجید اور احادیث مبارکہ میں توبہ کی برکات، آداب اور فضائل پر کیا کچھ کہا گیا ہے؟

انبیائے کرامؑ، صحابہ کرامؓ، اولیائے کرامؑ اور صالحین کی توبہ نے قدرت خداوندی کے کیسے کیسے مظاہر دکھائے۔

ایمان افروز اور نور ایمان کے حیرت انگیز واقعات سے بھرپور یہ دستاویز آپ کے ذاتی ذخیرہ کتب میں ایک انمول اضافہ ہوگا اور آپ کے دوستوں کیلئے شاندار اور یادگار تحفہ بھی

کیوں نہ کھولا اپنا۔ تم تو تب سے منہ بند کے بیٹھے تھے جب تمہاری شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ تم نے کب میرا ساتھ دیا؟ جب مجھے دھکے دے کر گھر سے لگانے کے منصوبے بنے، تم بولے؟ تمہارے گھر والے تمہاری دوسری شادی کی تیاری کر رہے تھے تم نے منع کیا انہیں؟ تم تو ایک اور زندگی کو برباد کرنے پر تے ہوئے تھے۔ دوسری بیوی اولاد نہ دیتی تو تمہارے گھر والے تیسری لے آتے کیونکہ وہ تمہیں لاوارث مرتا دیکھ نہیں سکتے تھے۔ ہر موقع پر تم نے زبان بند رکھی حقیقت چھپائے رکھی۔ واہ ملک صاحب قصور تمہارا اور جھپٹتی میں رہی۔ طلاق دے کے دھکے مار کر گھر سے نکالنا عورت کا مقدر چلایا پھٹ کے مرتا بیوی قسمت، کبھی کوئی سانس نہ کیوں نہ مری ان چلوں کے بیٹھے سے۔ تیزاب گردی کا شکار ہو تو عورت کیا یہ معاشرہ صرف مردوں کے لئے بنا ہے؟ نہیں ملک صاحب نہیں میں نے اپنا حق چھینا ہے چاہے غلط طریقے سے کبھی میں نے سب اٹھ کر دیا۔ میں کیوں طلاق لیتی میں کیوں دھکے کھاتی بنا قصور کے؟ میں نے اپنا راستہ چن لیا چاہے غلط راستہ تھا تب تم نے میرا منہ کیوں نہ توڑا؟ بے غیرت انسان۔“ فائزہ چیخ رہی تھی چلا رہی تھی اور ملک ریاست حسب عادت دروازے کو تھوکر مارتا باہر نکل گیا۔

آج کیسا خوفناک اور گندا انکشاف دونوں بہن بھائیوں پر ہوا تھا۔ یہ لمحے ان پر قیامت بن کے ٹوٹ رہے تھے فائزہ میک اپ میں تھڑے چہرے کے ساتھ گھر سے باہر جا چکی تھی۔ دونوں بچوں کو اپنی ماں آج چیل لگ رہی تھی۔ وہ دونوں سکتے کی کیفیت میں بیٹھے تھے۔ دونوں ایک دوسرے سے نظریں چما رہے تھے۔ یہ الفاظ وہ پہلے بھی کئی بار سن چکے تھے مگر کبھی آج پہلی بار آئے تھے۔ ان لفظوں کے منہ میں نے انہیں شرمسار کر دیا تھا۔ آج انہیں اور بھی بہت کچھ یاد اور کچھ آ رہا تھا۔ ملک ریاست کا

اور فائزہ بغیر کسی لحاظ اور شرم و حیا کے ایک دوسرے پر گرج برس رہے تھے۔ کبھی ملک ریاست کی آواز بچوں کے کانوں میں پڑی وہ فائزہ سے مخاطب تھا۔ ”اب پھر تم کہیں جانے کی تیاری کر رہی ہو؟“ ”جب تمہیں سب معلوم ہے تو پھر کیوں ہر بار سوال اٹھانے بیٹھے جاتے ہو۔“ فائزہ نے میک اپ کرتے ہوئے بے نیازی سے ملک ریاست کو جواب دیا۔ ”اور تم یہ بھی جانتی ہو کہ اب تمہارے بچے بڑے ہو گئے ہیں اگر اب تک سمجھ نہیں تمہاری حرکتیں تو اب سمجھنا شروع ہو جائیں گے۔“ ملک ریاست نے چڑکے جواب دیا۔ ”بچے کچھ سمجھیں یا نہ سمجھیں مگر تم انہیں ضرور سمجھا دو گے۔“ فائزہ بڑی طرح چلائی۔ ”تیز کے دائرے میں رو تم فائزہ“ ملک ریاست اس سے زیادہ بلند آواز سے چلا رہے تھے۔ ”تیز اور وہ بھی تم سکھا رہے ہو مجھے۔ واہ صاحب واہ، کس تیز کی بات کر رہے ہو آپ ملک صاحب اور تمہیں آج یہ اخلاقیات کا درس کہاں سے یاد آ رہا ہے۔“ فائزہ نے تھملا کے جواب دیا۔ ”میں اس کے کہ ملک ریاست کوئی جواب دیتا فائزہ نے اونچی آواز سے بولنا شروع کر دیا۔“ اور ہاں ملک صاحب کیا فرما رہے تھے آپ کہ میرے بچے بڑے ہو گئے ہیں۔ میں جانتی ہوں کہ وہ صرف میرے بچے ہیں مگر اتنا چلا کر کہتا پردہ تو فاش نہ کرو۔ ملک صاحب آہستہ بولا کہ جانتے ہو میں دیکھوں گے کبھی کان ہوتے ہیں اور پھر اس سانس ڈالنے میں بیٹھے بے قصور ہیں۔ اس میں بچوں کا کیا قصور کہ تم میرے نام کے شوہر ہو۔ اور اس میں میرا بھی کوئی قصور نہیں کہ میں ایک ایسے مرد سے عیاں کی تمہارے گھر والے تو میرا قصور نہ ہوتے ہوئے بھی مجھے طلاق دے رہے تھے جس میں وجہ سے کہ میں ان کے وارث پیدا نہیں کر رہی تھی۔ تم نے تب منہ

سیارہ ڈائجسٹ / اپریل ۲۰۱۶ء

اندرونی حصے سے لڑنے کی آوازیں آتا شروع ہو گئیں لڑائی تو کب سے جاری تھی مگر آواز کمرے تک ہی محدود تھی مگر اب میان بیوی کا جھگڑا شدت اختیار کرتا جا رہا تھا اور آوازیں بلند ہونا شروع ہو گئیں تھیں۔ عباس ریان کی طرف دیکھ رہا تھا آخر اس کی آواز نکلی وہ ریان سے پوچھ رہا تھا ”کیا تمہارے گھر میں بھی اسی طرح ہوتا ہے یہاں؟“ ”گو یا تم اس وجہ سے پریشان ہو۔ یا ریان تو ہر گھر میں ہوتا ہے۔ میرے اماں بابا میں بھی کبھی کبھی یہ شروع ہوتا ہے مگر پھر دونوں ایک دوسرے کے بغیر وہ بھی نہیں پاتے۔ تھوڑی دیر بعد دونوں اکٹھے بیٹھے ہنس رہے ہوتے ہیں۔“ ریان ہنس ہنس کے عباس کو بتا رہا تھا۔ عباس کی نگاہوں میں ریان کی اماں کا سرایا دوڑ گیا۔ خوبصورت چہرہ انکڑ ان کے سر پر بڑی شامکی سے دوپٹہ اوڑھا ہوا۔ بنا سیک اپ کے بھی وہ سادگی میں اچھی لگ رہی ہوتی تھیں۔ عباس کو دیکھتے ہی وہ دعاؤں کے ڈھیر لگا دیتیں اور پھر دونوں کے کھانے پینے کے لئے باورچی خانے میں جا کھتیں اور بہت کچھ کھانے کو تیار کرتیں۔ عباس سوچ رہا تھا کہ ریان کتنا خوش قسمت ہے۔ ایک میرا گھر ہے..... مگر وہ میرا گھر ہے کہاں۔ ”آؤ باہر چلیں.....“ ریان نے عباس کو کہا اور دونوں باہر نکل آئے۔ باہر آ کر اور ریان کا ساتھ پا کر عباس کے اندر کی محنت کچھ کم ہوئی۔ آئیں پارک میں بیٹھے کچھ دیر بیٹھیں۔ عباس کو دور سے فیاض آتا دکھائی دیا۔ فیاض کو پتھر مارنے کے بعد ان دونوں کی پہلی ملاقات تھی۔ فیاض شاید عباس کی تاک میں رہتا تھا۔ یوں یوں فیاض دونوں لڑکوں کے قریب آ جاتا رہا تھا عباس کی حالت خراب ہوتی جا رہی تھی۔ اس نے زور سے ریان کا بازو پکڑ لیا۔ اس کا سر پکڑ کر لے لگا رنگ زرد ہو گیا۔ ”آؤ ہمیں بچو

رو یہ ان دونوں سے سرد مہری کا سا ہوتا۔ وہ سوچتے ان کے کزنز کے باپ اور دوستوں کے باپ اپنی اپنی اولاد کے کتنے لاڈ اٹھاتے ہیں مگر ان کے گھر کا ماحول عجیب سا ہوتا۔ باپ کے ساتھ ان کی دوستی نہ ہونے کے برابر تھی۔ کئی دن وہ ایک دوسرے سے لے اور بولے بغیر گزار دیتے۔ ضرورت پڑنے پر خیرات کی طرح ان کی ضرورت پوری ہوتی۔ ملک کے ماتھے پر سو سونے ہوتے جب وہ بچوں کو کچھ خرچ کے لئے دیتے۔ آج دونوں بہن بھائیوں کو ملک ریاست کا سرور دیہ یاد آ رہا تھا۔ ملک ریاست نے کبھی انہیں جتنی اولاد کا پیار نہیں دیا تھا۔ وہ کبھی بچوں کی کسی کامیابی خوشی میں شریک نہیں ہوتے تھے۔ بلکہ اکثر انکے سے میں ڈانٹ ڈپٹ ہی آتی۔ اس انکشاف کے بعد امید فاطمہ اور عباس کی زندگی نے تیزی سے پلٹا کھلایا۔ وہ ماں سے کترنے لگے۔ ماں پاس آ کر بیٹھتی تو دونوں دہاں سے اٹھ جاتے۔ ان کی پڑھائی ڈسٹرب ہو چکی تھی۔ دوستوں سے نظر کھلانا چھوڑ دیا تھا۔ عباس نے باہر جا بہت کم کر دیا تھا باہر بھی جاتا بھی تو اسے محسوس ہوتا کہ ہر فرد اسے دیکھ کر مذاق اڑا رہا ہے وہ فوراً گھر کی طرف دوڑتا۔ امید فاطمہ نے خود کو اپنے کمرے تک محدود کر لیا تھا۔

اس روز بھی وہ اپنی سوچوں میں مگ اپنے کمرے میں اکیلا بیٹھا تھا کہ نوکرنے اس کے عزیز دوست ریان کے آنے کی اطلاع دی۔ تھوڑی دیر بعد ریان عباس کے کمرے میں آ گیا۔

”اوسے میرا کمرہ غائب رہتے ہو؟ ملنا ہی چھوڑ دیا ہے تم نے تو اور تم نے اپنی ہی حالت کیا بنا رکھی ہے؟“ عباس جھپکی سے ہنسی میں دیا اور ریان کی کسی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ ریان اس کی حالت دیکھ کر پریشان ہو رہا تھا اور اسے ہنسانے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔ مگر عباس چپ تھا اسی دوران گھر کے

سیارہ ڈائجسٹ / اپریل ۲۰۱۶ء

والی عورت پکڑی گئی۔ تین بچوں کی ماں نے محبوب کی خاطر اپنے بچوں کو نہر میں دھکا دے دیا۔ اسی طرح کی تمام خبروں کو عباس نے نشان لگا رکھے تھے۔ امید نے تاکتے ہوئے عباس کی طرف دیکھا۔ وہ اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے امید فاطمہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ”امید یہ بچے بھی ہماری طرح دنیا کی نگاہوں میں تماشائے بننے کے لئے جنیں گے۔“ پھر وہ خود ہی طرہ یہ مکرانٹ چہرے پر سجائے بولا ”جنیں گے کیا اندر سے تو کب سے مر چکے ہوتے ہیں وہ۔ کسی کے سامنے سر اٹھا کے جننے کے قابل نہیں ہوتے۔ لوگوں سے اپنی ماں کی آواز گویں کے فسانے سننے کے لئے روز جنیں گے اور روز مریں گے۔ اور تم بھی امید فاطمہ اسی طرح جل جل کے اور کڑھ کڑھ کے اسی گھر میں بیٹھی رہ جاؤ گی۔ یہاں اس گھر میں کوئی بھی تمہارا ہاتھ تھامنے نہیں آئے گا۔“ وہ امید فاطمہ کا ہاتھ پکڑے زور زور سے رو رہا تھا۔ امید فاطمہ نے اس کے ہتھے آنسوؤں کو اپنے ہاتھوں سے صاف کیا مگر اس کے پاس تسلی اور دلا سے کے لئے کوئی الفاظ نہ تھے۔ یہی عباس امید سے مخاطب ہوا۔

”آؤ امید اس گھر سے نکلیں دور چلیں جہاں ہمیں کوئی کچھ کہنے والا نہ ہو۔ ہم خالی ہاتھ دنیا کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔“

عباس یہ اونچی اونچی دیواریں والی حویلی ہماری ماں کی عزت کو بچانے کی تم خالی ہاتھ اور بغیر ہمارے کے میری کیا رکھوالی کرو گے۔ یولو جواب دو عباس؟“

امید نے تم آنکھوں سے عباس سے سوال کیا۔

دو سال دونوں بہن بھائی اسی اذیت میں جھلا نجات کے راستے تلاش کرتے رہے۔ پھر انہیں ایک راستہ مل گیا۔

☆.....☆.....☆

عباس اپنے کمرے کی میز پر کھڑے کانغذد کو

”کر رہے ہو؟“ عباس نے خباثت سے ہنستے اپنے دونوں سے پوچھا۔ عباس ایک دم کھڑا ہو گیا۔ ریان کا بازو پکڑ کے کھینچنے لگا۔ ”گھر؟“ فیاض نے مکاری سے غور سے اپنی کھینچتے ہوئے پوچھا۔

ریان عباس کی بدلتی حالت دیکھ رہا تھا۔

”کب تک تمہاری ناراضگی رہے گی مجھ سے اپنی بار غصہ خٹوک دے نا۔ ہم دونوں ایک جہے کے بغیر کبھی تو نہیں۔“ مگر عباس کہاں سن مانا۔ ریان کے بازوؤں میں جھول گیا تھا۔

اب اکثر ایسا ہونے لگا۔ عباس بیٹھے بیٹھے ہانک بے ہوش ہو جاتا۔ اس کے دل و دماغ میں بگ بگ خوف بیٹھ چکا تھا۔ امید فاطمہ سے اس کی یہ بات دیکھی نہ جانی اور وہ خود بھی رونے بیٹھ جاتی۔

آج بھی عباس کے کمرے میں اس نیت سے آئی گئی کہ دونوں اکٹھے بیٹھ کر دل کا بوجھ کم کر لیں گے۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی امید فاطمہ کی چیخ نکلی کہ ڈیروں ڈھیر اخباروں کے درمیان میں ہاں اندھے منہ بے ہوش پڑا تھا۔ وہ جلدی سے ہاں میں لانے کی تدبیر کرنے لگی۔ جب عباس کو لڑھ پڑا تو وہ اکیلے ہی اسے سنبھالنے کی کوشش کرتی تھی۔ اسے زور ہوتا کہ بے ہوش کی حالت میں کہیں ”کچھ غلط نہ بول دے۔ کافی دیر بعد عباس آہستہ آہستہ آنکھیں کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر کچھ دیر بعد آہستہ آہستہ بولنے کے قابل ہو گیا۔

”تم نے دیکھا امید ان اخباروں کو، پڑھو ذرا کیا لکھا ہے۔ آؤ تمہیں دکھاؤں کیا لکھا ہے۔“ اب وہ ایک ایک اخبار امید کو دکھا رہا تھا۔ اس نے ان خبروں کے گرد دائرہ لگا رکھا تھا جہاں اس قسم کی خبریں تھیں..... چار بچوں کی ماں آشناسیت گھر سے نرہ۔ محبوب کے ساتھ ملکر شوہر اور بچوں کو قتل کرنے

سیارہ بکین کارنر

جو یہ کامران



انسانی تارکین کی دلچسپی اور پسند کو مد نظر رکھتے ہوئے ہم نے انسانی تارکین کی تریک پر مبنی خصوصی سلسلہ شروع کیا ہے جس میں انسان مگر معیاری اور نئی تریک پیش کی جائیں گی۔ ان تریک پر عمل کر کے نہ صرف آپ اپنے گھر والوں کو نت نئے لذت دار کھانے فراہم کر سکتی ہیں بلکہ روایتی ڈشز پکانے کی یوریت سے بھی نجات حاصل کر سکتی ہیں۔ ہماری کوشش ہوگی کہ آپ کو بہترین تریک فراہم کر سکیں۔ اس سلسلے میں آپ ہمیں اپنی تجاویز اور آراء سے آگاہ کرتے رہیے۔ نیز آپ ہمیں خود بھی نئی اور معیاری تریک لکھ کر بھیج سکتی ہیں جنہیں آپ کے نام کے ساتھ شائع کیا جائے گا اور بہترین ترکیب پر اعزازی شمارہ بھی آپ کو ارسال کیا جائے گا!

email:sayyaradigest@gmail.com
www.facebook.com/sayyaradigest

گرلز ریڈ اسنیپر



پانی
نمک
کھن
لیوں، ٹماٹر ہری پیاز، کھیرے فرنج فراز، اہلی ہوئی
سبزیاں سجانے اور ہمراہ پیش کرنے کے لئے
لیمن بر ساس کے اجزاء
لہسن (چوب کے ہوئے) 2 چائے کے چمچے
لیوں کارن 1/2-2 چائے کے چمچے
پسی ہوئی سفید مرچ 1 چائے کا چمچ
حب ذائقہ
نمک 2 کھانے کے چمچے
کھن
ڈیک: سوس بنانے کے لئے سوس بن میں کھن گرم
کر کے لہسن ہلکا نہری کریں، پھر باقی سوس کے اجزاء
ڈالیں اور چند منٹ پکا کر پیالے میں نکال لیں۔ ایک

گلی (ریڈ اسنیپر، ظ) 2 کلوے
ایک چائے کا چمچ
ایک چائے کا چمچ
ایک چائے کا چمچ
1/4 چائے کا چمچ
1/2 چائے کا چمچ



ریاضی کی ذہانت کا ایک ٹیسٹ لیا گیا اور ان سے پوچھا گیا کہ کیا وہ نیچے ہال میں بیٹھی ایسی خاتون سے ملاقات کی خواہش رکھتے ہیں جس نے ٹیسٹ میں ان سے زیادہ اسکور حاصل کیا ہے۔ دونوں جائزوں کے نتائج سے ظاہر ہوا کہ جب انھوں نے ایک فرضی ذہین خاتون کا تصور کیا تھا یا پھر ایک ایسی عورت کے ساتھ رومانوی ملاقات کے لیے سوچا تھا جو وہاں غیر حاضر تھی تو انھوں نے اس عورت کے ساتھ ملاقات کی خواہش ظاہر کی تھی۔ مطالعے کے اگلے دو ورژن میں شرکاء کی ملاقات ان خواتین سے کرائی گئی جنھوں نے ذہانت کے ٹیسٹ میں ان سے زیادہ یا کم نمبر لیے تھے۔ جس کے بعد شرکاء سے ایک سروے میں پوچھا گیا کہ انھوں نے پہلی ملاقات میں ایک دوسرے کے بارے میں کیا رائے قائم کی تھی۔ اس مشاہدے میں حقیقتیں نے شرکاء کی کرسیوں کے فاصلے سے انداز لگایا کہ مرد کی جانب سے ذہین عورت کو جیون ساتھی کے روپ میں کتنا پسند کیا گیا تھا۔ جو مرد زیادہ نمبر لینے والی خواتین کے ساتھ بیٹھے تھے انھوں نے اس خاتون کے ساتھ اپنی کرسی کا فاصلہ زیادہ کر لیا تھا اور خود کو ان سے دور کرنے کی کوشش کی تھی۔ علاوہ ازیں خاتون کو کم پرکشش اور جیون ساتھی کی حیثیت سے نامناسب خیال کیا تھا ان خواتین کے مقابلے میں جنھوں نے ٹیسٹ میں کم نمبر حاصل کئے تھے۔ مطالعے کے آخری دو مراحل سے پتا چلا کہ مرد ایک ذہین خاتون کے ساتھ بات چیت کرنے اور ان کے ساتھ رابطے رکھنے میں کم دلچسپی دکھا رہے تھے بلکہ حقیقت یہ تھی کہ مردوں میں ایک ایسی فرضی ذہین عورت کے ساتھ ملاقات کا معمولی رجحان تھا جو قیاساً ہوشیار تھی۔ حقیقتیں نے کہا کہ ان نتائج کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اکثر مرد ذہین عورت کو اپنے لیے خطرہ سمجھتے ہیں لیکن نتائج سے یہ وضاحت ہوتی ہے کہ بہت سے مرد ذہین عورت کے ساتھ اپنی پوری زندگی گزارنے کے حوالے سے پر جوش نہیں ہوتے ہیں اور ایسا ان کے چہروں پر لکھا ہوتا ہے۔

کومے کی حالت میں خاتون نے صحت مند بچے کو جنم دیا

ایک حاملہ خاتون جو کار حادثے کے بعد کومے میں چلی گئی تھی، انھوں نے کومے کی حالت میں ایک صحت مند بچے کو جنم دیا ہے جبکہ ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ بچے کی پیدائش کے بعد خاتون کی طبیعت بہتر ہوئی ہے۔ چیک ری پبلک سے تعلق رکھنے والی 33 سالہ ویرینیکا توستا کے محل کا پانچواں مہینہ تھا جب اکتوبر 2015ء میں ان کی کار ایک ہمسایک حادثے کا شکار ہو گئی۔ حادثے کے نتیجے میں ان کے دماغ اور گردن پر شدید چوٹیں آئی تھیں اور وہ حادثے کے بعد سے کومے میں چلی گئی تھیں۔ خاتون چیک ری پبلک کے شہر بونو کے یونیورسٹی اسپتال میں زیر علاج ہیں جہاں تین ماہ تک ان کا نوزائیدہ بچہ ان کے پیٹ میں پرورش پا رہا ہے۔ ڈاکٹروں نے آپریشن سے پہلے بچے کے مناسب وزن کا ہونے کا اہتمام کیا تھا اور جب زچگی کے آٹھ ماہ مکمل ہو گئے تو، ڈاکٹروں نے فیصلہ کیا کہ اب بچے کی ولادت کرائی جا سکتی ہے۔ بچے کا نام ڈینیئل رکھا گیا ہے جس کا پیدائشی وزن چار پاؤنڈ ہے۔ ڈینیئل کو اسپتال سے گھر بھیج دیا گیا ہے، جہاں اس کی آٹمی بچے کی نگہداشت کی ذمہ داری سنبھال رہی ہیں۔



بزم شاعری

لیکن ہمیں خواہاں کوئی واں جس گراں کا
(مرزا محمد رفیع سودا)

غزل

دھوم اتنی ترے دیوانے چا سکتے ہیں
کہ ابھی عرش کو چاہیں تو ہلا سکتے ہیں
مجھ سے اختیار کوئی آنکھ ملا سکتے ہیں؟
منہ تو دیکھو وہ مرے سامنے آ سکتے ہیں؟
یاں و آنکھیں انساں ہیں کہ بھریں آہ تو جھٹ
آگ دامن شوق کو بھی لگا سکتے ہیں
سوچو تو کسی ہٹ دھری نہ کیجئے صاحب
چکیوں میں مجھے کب آپ اڑا سکتے ہیں
حضرت دل تو لگا کر آئے ہیں اس سے لیکن
اب بھی ہم چاہیں تو پھر بات بنا سکتے ہیں
شبی اتنی نہ کر اے شیخ کہ رندان جہاں
انگلیوں پر تجھے چاہیں تو نچا سکتے ہیں
(لوب انشا اللہ خان انشا)

غزل

تیرا تصور شب ہمہ شب
خلوت غم بھی بزم طرب
دھوی شوق اور شکوہ بلب
شرم دل آرام طلب
باتیں ہیں دو مقصود ہے ایک
تیری طلب یا اپنی طلب
آہی گیا اک مست شباب

نعت رسول ﷺ

آقا سے عقیدت کا اظہار ضروری ہے
رہلے سے محبت کا اقرار ضروری ہے
ہاں کتنے عظیم آقا یہ کسی نے ہے کب تاپا
ایسا ہی شفیق اپنا سردار ضروری ہے
ہر جن ملک انسان کو حکم کیا رب نے
ملوات محمدؐ پر سو بار ضروری ہے
امت نہ ہر اسماں ہوسرکار چھڑا لیں گے
دانا کی محبت سے انکار ضروری ہے
جنت کی بشارت مل جائے گی ہم کو بھی
اصحاب بدر جیسا اہل ضروری ہے
پیشانی مومن پر آویزاں ہو نغمہ بھی
اے شوق غلامی کا شاہکار ضروری ہے
(شوق خانوہنی۔ خانوہن)

غزل

غزل نہیں اس کی جتنی کے عیاں کا
مناشع سراپا ہو کہ اگر صرف زبان کا
لہے کو کہیں کے در دل سے اٹھا دے
لگا ہے ابھی بل میں طلسمات جہاں کا
لگا دیکھ مسم خانہ عشق آن کے اے شیخ
مناشع حرم رنگ جھلکا ہے تپاں کا
الکھن ہستی میں عجب دیدہ ہے، لیکن
جب چشم کٹے گل کی تو موسم ہو خزاں کا
انکھائے لے جا کے تجھے مصر کے بازار



فش فله

۱/۲ کلو
۱ چائے کا چمچ
۱/۲ چائے کا چمچ
۲ کھانے کے چمچ
نارڑسوں کے اجزاء:

۱/۲ کپ
ایک کھانے کا چمچ
ایک چمچی
ایک چائے کا چمچ
ایک چائے کا چمچ
ایک چائے کا چمچ
ایک چائے کا چمچ
ایک چائے کا چمچ
ترکیب: نارڑسوں بنانے کے لئے آدھا کپ مایونیز،
ایک کھانے کا چمچ لیوں کا رس، ایک چمچی نمک، ایک
چائے کا چمچ باریک کٹا ہوا دھنیا، ایک چائے کا چمچ
باریک کٹا کرکٹ اور ایک چائے کا چمچ باریک کٹا سویا
ڈال کر اچھی طرح مکس کر لیں۔ نارڑسوں تیار ہے۔
فش فله کو نمک، کالی مرچ، مرچوں سے میری نیٹ
کر لیں۔ سب ایک دو مہانے پیالے میں سیلف رازنگ
فلور، ایک عدد اٹھا، ایک کپ سوڈا ڈال کر بیٹر بنالیں یہاں
تک کہ وہ اٹھوٹھ ہو جائے۔ پھر بیٹر کو ڈھک کر ایک گھنٹے
کے لئے فریج میں رکھ دیں۔ ایک چین میں تیل گرم کر کے
فش فله کو بیٹر میں ڈپ کریں اور گرم تیل میں اتنا ڈپ
کریں کہ وہ گولڈن اور خش ہو جائیں۔ آخر میں انہیں پیس
نارڑسوں اور لیوں کے سلاخ کے ساتھ سرو کریں۔

پیالے میں اورک، لہسن، لیوں کا رس، کالی مرچ،
سفید مرچ، پانی اور نمک ملا لیں۔ اس آمیزے کو پچھلی
پر لگا کر 20 منٹ کے لئے رکھ دیں۔ گرل بین کو گرم
کر کے پچھا کریں اور پچھلی پر پھینک دیں اور تھوڑا سی سون لگاتے
ہوئے دونوں جانب سے سبیک کر ڈش میں اتار لیں۔
لیوں، فٹاڑ ہری پیاز اور کھیرے سے سجائیں۔ اسے
بزیوں فریج فرارز اور باقی سوں کے ہمراہ پیش کر دیں۔

فش ٹوسٹ

اجزاء:
فش
میدہ
اٹھا
ہری پیاز
نمک
بہن کالی مرچ
براؤن شوگر
بریف سلاخیں
تیل
ہری پیاز
ترکیب: پچھلی فش، میدہ، اٹھا ہری پیاز، بہن کالی مرچ،
نمک اور براؤن شوگر ڈال کر چمپ کر لیں۔ اب بریف
سلاخ کے کنارے کاٹ کر بنائے ہوئے بیٹ کی تہہ
لگائیں۔ پھر تیل کو پلٹ میں ڈال کر سلاخیں گواں پر رکھیں
اور تیل کی تہہ لگائیں۔ اس کے بعد انہیں کاٹ کر پچھ دیں
کے لئے فریج میں رکھ کر نکال لیں۔ اب ٹوسٹ کو اوون
میں سبیک کریں۔ اور پچھ کر فریج میں سبیک کر لیں۔

بش فرانیف فش اینڈ چیپس

اجزاء:
سلیٹ رازنگ فلور
اٹھا
سوڈا وائر
۱-۱/۴ کپ
ایک عدد
ایک کپ

اب چاہے پارسائی کا جنازہ اٹھے
آج خط میں سجانے محبت کے
انہوں نے بھیجا ہے پیغام نفرت کا
ہمیں کیونکر ہیں اڑانے محبت کے
اب دل کو تسلی دینی ہے بدر
اب خواب ہیں سلائے محبت کے
(سید بدر سعید - لاہور)

جہر نہ سہنا

جہر نہ سہنا
منہ سے بھی کچھ کہنا
دل کو روگ نہ لگانا
شور بھی مچانا
آنکھوں میں آنکھ بھر کے
تم خاموش نہ رہ جانا
ایسے میں کوئی پوچھے
تو خوب بول لینا
دکھ نہ سہنا
خاموش نہ رہنا
اس کو نہ توڑ لینا
ایسے میں تم بھی
لڑنا اور نہ ہارنا
کچھ کر جانا
کچھ کر دکھانا
اور ہم کو نہ
بول جانا
(مہر شہم - لاہور)

غزل

دل کے لئے یہ قرار کا موسم
اچھا موسم بہار کا موسم
زندگی سے نظر ملاؤ ذرا
یہ نہیں ہے فرار کا موسم

ہم تو وہاں کھڑے منتظر تھے
پچھے تو سایہ بھی نہ رہا ہے
دل میں سوال اٹھ رہے ہیں
جواب دینے والا نہ کوئی رہا ہے
راہیں اپنی جدا ہو گئی ہیں
ملنا اب نصیب میں نہ رہا ہے
اُداس نظروں سے سب دیکھتے ہیں
یالہی یہ ماجرا کیا ہے
(سز کبریٰ رشید - لاہور)

کرپشن

رگ و جاں میں سالی ہے کرپشن
کہاں سے ہم میں آئی کرپشن
ہے رشوت کا گرم بازار ہر سو
یہ کیسا رنگ لائی ہے کرپشن
ہمارے باپ دادا تھے نہ ایسے
ہمیں کس نے سکھائی ہے کرپشن
ہمارے ہاں کرپشن عروج پر ہے
کرپشن نے بھلائی ہے کرپشن
غریبوں کے لئے ہے زہر قاتل
امیروں کی مٹھائی ہے کرپشن
لگے ہے ہم نے پوری قوم کو ہی
کتابوں میں پڑھائی ہے کرپشن
قر یہ بات ہم بھولے ہوئے ہیں
برائی ہے برائی ہے کرپشن
(ریاض حسین قر)

غزل

جو دلائیں عجیب ہوتی ہیں
وہ توانیں عجیب ہوتی ہیں
بھول جاتی ہیں اپنی ہستی کو
ساری مائیں عجیب ہوتی ہیں
دینے امید کے بھاتی ہیں

شیشہ بدت و نغمہ بلب
بیت مکتی جو دل پہ نہ پوچھ
ہجر کی شب اور آخر شب
حسن مکمل جذب و گریز
عشق مسلسل ترک و طلب
ترک طلب اور اطمینان
دیکھ تو میرا حسن طلب
(جگر مراد آبادی)

غزل

ادائے پردہ کتنی دل نہیں معلوم ہوتی ہے
میں پردہ کوئی ناز آفریں معلوم ہوتی ہے
یہ کس کو دیکھ کر دیکھا ہے میں نے بزم ہستی کو
کہ جوئے ہے نگاہوں کو حسین معلوم ہوتی ہے
کسی کا عشق آ پہنچا ہے رسوائی کی منزل تک
نگاہ شوخ اب کچھ شریکیں معلوم ہوتی ہے
مجھے میقانہ قمرانا ہوا محسوس ہوتا ہے
وہ میرے سامنے اٹھلا کے جب چاند رکھتے ہیں
جوانی بھی تو اک موج شراب تندہ رنگیں ہے
برا کیا ہے اگر ہم مشربِ مدعا نہ رکھتے ہیں
چمن کی ہر کلی سے نور کی سستی جھلکتی ہے
درو دیوار سے مہتاب کی شوخی جھلکتی ہے
(اختر شیرانی)

ڈھواں ڈھواں

یہ ڈھواں ڈھواں سا اٹھ رہا ہے
کونئی سگ رہا ہے
گشتی آرزوؤں کی بہکشاں تھی
اب اک ستارہ بھی باقی نہ رہا ہے
سب مطمئن سے ہو گئے ہیں
کہنے کو جیسے کچھ نہ رہا ہے
درد ایسے دل میں اٹھ رہا ہے
جیسے کوئی مجھ پر سا مکیا ہے

غزل

نکمرے پڑے ہیں فسانے محبت کے
کہاں چلے گئے دیوانے محبت کے
پہ ملاقاتیں یوں ہی ممکن نہ تھیں
انہیں بھی آتے تھے بھانے محبت کے

تاریخ اسلام نمبر

قیمت - 175/-

☆..... اسلام کی روشن تاریخ سے ایمان افروز اور روح پرور واقعات کا مجموعہ
☆..... اس نمبر کے تاریخی واقعات کو نہایت غور و فکر اور تحقیق کے بعد مرتب کیا گیا ہے۔

☆..... ان واقعات کو پڑھ کر ہم اسلام کو اچھے طریقے سے سمجھ سکتے ہیں
☆..... ایمان کا نور اور اطمینان قلب حاصل کر سکتے ہیں۔
☆..... درجنوں جلدوں پر مشتمل تاریخی کتب کا نچوڑ ایک ہی خاص نمبر میں
ملاحظہ فرمائیں۔

☆..... خود پڑھیں اور اپنے بچوں کو ضرور پڑھائیں۔

سیارہ ڈائجسٹ 240 روزگار کا رڈن لاہور۔
0423-7245412

اس ماہ کا شاعر

میر انام محمد عبداللہ قریشی ہے۔ شخص عاظم ہے اور قلمی نام عبداللہ عاظم۔ میں ایک سرکاری ادارے میں انجینئر ہوں اور عرصہ سے اسی حیثیت میں اپنے پیشہ ورانہ فرائض سرانجام دے رہا ہوں۔ ادب سے لگاؤ بچپن سے ہے جماعت چہارم سے بچوں کے رسائل پڑھنے شروع کئے جبکہ جماعت ہفتم سے سیارہ ڈائجسٹ اور اردو ڈائجسٹ بھی زیر مطالعہ آئے۔

یوں تو لکھنے کا سلسلہ بھی جماعت ہفتم سے شروع ہو گیا تھا۔ تاہم باقاعدہ آغاز انجینئرنگ کالج کے میگزین سے بطور لکھاری ہوا۔ جہاں انجینئرنگ کالج میں تعلیم کے دوران کالج میگزین میں میری شاعری اور افسانے باقاعدگی سے چھپتے رہے۔ ضلع ذریہ اسماعیل خان کے شعراء کے تعارف و کلام پر مشتمل کتاب ”دایان سخن“ میں بھی میرا کلام شامل ہے۔ آج کل کراچی سے شائع ہونے والے ایک ہم عصر ماہ نامے میں چھپ رہا ہوں۔

میرے مطالعے میں شاعری کے علاوہ دینی، اصلاحی، مہمانی اور سوانح عمری کی کتابیں زیر مطالعہ رہتی ہیں۔ صنف شاعری میں محنت، نظم اور غزل وغیرہ میں طبع آزمائی کی ہے۔ آپ کے لئے تازہ غزل اور اپنی پسندیدہ نظم جو کہ منسلک ہیں ارسال ہیں۔

غزل

تم میرے پاس ہوتے ہو صبا کی صورت
میرے جنم کی ضرورت ہو ہوا کی صورت
تجھے کھونے کا تصور مجھے سزا دیتا ہے
تیری ہستی ہے صنم میری بقا کی صورت
پائتیں تو ہے صنم بیکر تسلیم و رضا
مل گئی دولت دنیا بھی وفا کی صورت
میرے جیون میں یہ دھنک رنگ ہیں تیرے صدمے
بن تیرے زیست ہے کرب و بلا کی صورت

ان کو جاکر کوئی خبر دے
آگیا ہے بہار کا موسم
اک پرندے نے ہے سوال کیا
چھپ گیا کیوں ہے بہار کا موسم
پھول بننے ہوئے یہ کہتے ہیں
کیسا ہوتا ہے خار کا موسم
نازکی سوچ میں مہکتی ہے
دل کا موسم، بہار کا موسم
تیرے جانے سے ایسا لگتا ہے
ختم ہوگا بہار کا موسم
یاد رہتا ہے ہر نفس کو کنول
دل کا موسم بہار کا موسم (کنول)

غزل

’جسم و جان کا عجب رشتہ ہے
اب تک تو ہے جڑا ہوا
کس طرح بنے گا آشیانہ
درخت تو خود ہے گرا ہوا
ساحل کو جانا دھیان سے
دریا کا پانی ہے بھرا ہوا
واپس لوٹ کر آئے گا کیسے
وہ تو خود ہے گھر سے گیا ہوا
پوری ہستی میں لگ گئی آگ
اک بھی گھر نہیں ہے بچا ہوا
راہ میں روک لے نہ کوئی
ہر کوئی ہے اب دشمن بنا ہوا
میرے مر رہے ہیں تو کیا
اس کا بھی تو ہے ہر کوئی مرا ہوا
کس سے گلہ کریں ستم روزگار کا
لپٹا تو سارا شہر ہے پھر بنا ہوا

(دیم اختر - کراچی)

ان گت لوگوں نے دنیا میں محبت کی ہے
کون کہتا ہے کہ صادق نہ تھے جذبے ان کے
لیکن ان کے لئے تشہیر کا سامان نہیں
کیونکہ وہ لوگ کبھی اپنی ہی طرح بھٹلے تھے
عمارات و مقبرہ، فصلیں یہ حصار
مطلق الحکم شہنشاہوں کی عظمت کے ستوں
سینہ دہر کے ناسور ہیں کہنہ ناسور
جذب ہے ان میں تیرے اور میرے اجداد کا خون!
میرے محبوب! انہیں بھی تو محبت ہوگی!
جن کی صنائی نے بخشی ہے اسے شکل جیل
ان کے پیاروں کے مقابلے سے بے نام و شہود
آج تک ان پہ جلائی نہ کسی نے قدیل
یہ چمن زار! یہ جتنا کا کنارہ یہ محل
یہ منتقل درود پوار پہ خراب یہ طاق
اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق
(ساحر لدھیانوی)

کوئی تو آ کے کرے درد کی چارہ سازی
زندگی ہم نے گزاری ہے سزا کی صورت
خون انسان کی ارزانی ہے اب کے
زندگی اب تو گزرتی ہے قضا کی صورت
اس سے بڑھ کر ہی عطا مجھ کو ہوا ہے عاطر
میں نے اس در جو مانگا ہے دعا کی صورت

پسندیدہ نظم

تاج تیرے لئے ایک مظہر الفت ہی سہی
تجھ کو اس وادی رنگین سے عقیدت ہی سہی
میرے محبوب کہیں اور ملا کر مجھ سے
بزم شامی میں غریبوں کا گزر کیا معنی؟
حُبت جس راہ پہ ہوں سلط شامی کے نشان
اس پہ الفت جبری رجوع کا سفر کیا معنی
میرے محبوب پس پردہ تشہیر وفا
تو نے سلط کے نشانوں کو تو دیکھا ہوتا
مردہ شاہوں کے مقابلے سے بھٹنے والی
اپنے تاریک مکالوں کو تو دیکھا ہوتا

خاص اعلان

محترم قارئین! بزم شاعری میں آپ کی دلچسپی کے پیش نظر ادارہ نے ایک خصوصی سلسلہ شروع کیا ہے جس
کے تحت ہر ماہ ایک خوش نصیب شاعر/شاعرہ کا تعارف ہمو تصویر شائع کیا جائیگا۔ جو احباب اس سلسلہ میں شریک
ہونا چاہتے ہیں وہ اپنی تازہ غزل/نظم/پسندیدہ شاعری غزل/نظم اور دیگر تفصیلات کے ساتھ درج ذیل کو پتہ
کر کے سیارہ ڈائجسٹ: 244 میں مارکیٹ ریوازا گارڈن لاہور پر ارسال کریں۔

کوپن برائے اس ماہ کا شاعر

یہاں اپنی

تصویر

منسلک کریں

نام:

عمر:

پسندیدہ غزل/نظم:

مشاغل:

شادی شدہ/غیر شادی شدہ:

ای میل:

نوٹ: اپنی پسندیدہ شاعری کی ابتدا مزاج اور دیگر تفصیلات الگ صفحے پر درج کر کے بھیجئے۔

سیارہ ذالحجۃ کی ایک اور شہریت کاوش

ازوال اسلامی واقعات

شائع ہو گیا ہے

رسول خدا، خلفاء راشدین، صحابہ کرام اور صالحین کی قابل تقلید زندگیوں سے لیے گئے سنہری واقعات

دور نبوت، خلافت راشدہ اور تاریخ میں موجود عدل و انصاف کی عظیم روایات

مسلم خواتین کی ذہانت متانت اور شجاعت کے حیرت انگیز قصے

دور جدید میں نئی نسل کے جذبہ ایمانی کو از سر نو تازہ کر دینے والے روح پرور واقعات

ہر مسلم گھرانے کی لائبریری کی زینت، نوجوانوں کے لئے مشعل راہ۔

دعاؤں کے ساتھ

سیارہ ذالحجۃ 244 ریوازا گارڈن لاہور۔ فون: 042-7245412

چھائی ہوئی یاسیت میرے ذہن سے محو نہ ہوئی۔ میں تیری طرح دادی اماں کے پاس گئی اور ان سے اس عورت کے بارے میں پوچھا۔ انہوں نے غور سے میرا چہرہ دیکھا اور کہنے لگیں ”پہلے منہ ہاتھ دھو کر آرام سے کھانا کھا لو پھر میں تمہیں اس بد نصیب کی داستان سناؤں گی۔“

مجھ میں انتظار کی تاب نہ تھی لہذا میں نے اصرار کیا کہ پہلے اس عورت کی کہانی سنائیں میں کھانا بعد میں کھاؤں گی لیکن دادی اماں نے میری ایک نہ سنی اور مجبوراً مجھے دو چار تھے زہر مار کرنا پڑے۔ کھانا کھا کر میں ایک بار پھر دادی اماں کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ انہوں نے جو کچھ مجھے اس عورت کے بارے میں بتایا وہ اتنا درد انگیز تھا کہ میری آنکھیں سادون بھادوں بن گئیں اور میرا پورا وجود کسی سوکھے پتے کے مانند لرزنے لگا۔

چودھری الور کا شمار ہمارے گاؤں کے بڑے اور خوش حال زمینداروں میں ہوتا ہے۔ اسے خدا نے دل کھول کر دنیا کی ہر نعمت سے نوازا تھا۔ روپیہ پیسہ، جاگیر زمینیں تو ایک طرف رہیں اولاد کے معاملے میں بھی وہ خاصا خوش قسمت واقع ہوا تھا۔ اس کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں چاروں ہی خوش شکل اور خوش سیرت تھے۔ جیسا کہ عام طور پر زمینداروں اور جاگیرداروں کے بیٹوں کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ لڑکپن کی حدود میں داخل ہوتے ہی گاؤں کے غریب لوگوں کا جینا حرام کر دیتے ہیں اور ان کے والدین ان حرکتوں کو جونی کا مشغلہ سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ گاؤں کی بہوؤں، بیٹیوں اور غریب مزارعوں کی ان کی نظر میں کوئی اہمیت نہیں ہوتی اور وہ جب جاہل ان کی عزت پر بھر میں خاک میں ملا دیں لیکن چودھری الور کے دونوں بیٹوں میں ایسی کوئی بات نہ تھی۔ وہ دونوں انتہائی

میری یوریت اب بڑھتی جا رہی تھی۔ اپنے حساب سے میں نے گاؤں کا سروے مکمل کر لیا تھا۔ تمام عزیزوں، رشتہ داروں کے گھروں میں بھانپنے کے علاوہ میں جان پہچان کے کبھی لوگوں سے مل چکی تھی لیکن اب تک کوئی خاص کامیابی حاصل نہ ہو سکی تھی۔ اور یوں لگ رہا تھا جیسے اس بار میں خالی ہاتھ اپنے گھر جاؤں گی۔ اس سے پہلے کہ میں مکمل طور پر مایوس ہو جاتی، خدا نے میری سی لی اور مجھے وہ چہرہ نظر آ گیا جس کی مجھے تلاش تھی۔

اس دن میں اپنی خالہ کے گھر سے واپس آ رہی تھی کہ گلی میں وہ نظر آ گئی۔ دھول سے اٹے ہوئے بال رت جلوں کی ماری آنکھیں، جن سے آنسوؤں کے چشمے اُبلے پڑتے تھے، جگہ جگہ سے تار تار کپڑے اور لرزتا ہوا وجود۔ اس پر نظر پڑتے ہی میں ایک لمحے کے لئے سر سے پاؤں تک کا پ گئی اور اس کے وجود سے مجھے خوف آنے لگا، کون ہے یہ؟ میں نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ پہلے تو کبھی دیکھنے میں نہیں آئی! میں نے تیز تیز قدم اٹھانے شروع کر دیئے تاکہ جلدی سے اپنی گلی میں داخل ہو سکوں۔ اس اثناء میں وہ قریب آ گئی اور اس کی درد بھری آواز نے میری سوچوں کے تانے بانے بکھیر دیئے۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ”اچھو! خدا کے واسطے میرا قصور تو بتا دے، تو مجھے چھوڑ کر کہاں چلا گیا ہے؟“ اتنا کہہ کر وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا سینہ پیٹنے لگی۔ ساتھ ہی ساتھ وہ کسی اچھو کو نکارے جا رہی تھی۔ مجھ سے اس کی یہ حالت نہ دیکھی گئی اور میں تیز تیز قدم بڑھانے لگی۔ اپنے گھر کے دروازے پر پہنچ کر میں نے مز کر دیکھا تو وہ عورت میرے پیچھے پیچھے چلی آ رہی تھی۔ میں نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا اور اپنی پھولی ہوئی سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی لیکن اس کی آواز کا کرب اور چہرے پر

نیارہ ڈائجسٹ / اپریل ۲۰۱۶ء

اس کے دیور نے بھی صاف صاف کہہ دیا تھا کہ اگر نفیسہ اور اشرف کی شادی نہ ہوئی تو عابدہ اور ارشد کا رشتہ بھی ختم ہی سمجھو۔

بات یہی ہونے پر ٹوٹ جائے تو گاؤں کے لوگ اگلیاں اٹھاتے اور طرح طرح کی باتیں بناتے ہیں لہذا عابدہ کی ماں نے اپنی بیٹی کی خوشی اور عزت کی خاطر یہ رشتہ منظور کر لیا۔ دونوں شادیاں بڑی دھوم دھام سے ہوئیں یوں لگتا تھا جیسے پورے گاؤں میں خوشیوں کی برکت اُتری ہو۔ عابدہ اور ارشد کے چہرے خوش سے دھک رہے تھے۔ اشرف بھی خاصا مسرور نظر آ رہا تھا مگر نفیسہ نے اپنی شادی میں کسی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔ وہ ایک بے جان سی صورت نظر آ رہی تھی لیکن شادی کے ہنگاموں میں کسی نے اس بات پر توجہ نہیں دی۔

عابدہ اور ارشد ایک دوسرے کو پا کر بے حد خوش تھے ان کا گھر صبح منٹوں میں جنت کا نمونہ تھا۔ عابدہ نے نہ صرف اپنے شوہر کا پورا پورا خیال رکھا بلکہ ساس، سسر کی بھی دل کھول کر خدمت کی جبکہ نفیسہ نے شادی کے چند ہی ہفتے بعد اپنا اصلی روپ دکھانا شروع کر دیا۔ اسے تو بناؤ سنگھار سے ہی فرصت نہ تھی جو وہ گھر کے کسی کام کو ہاتھ لگاتی۔ غصہ تو اس کی ناک پر دھرا رہتا۔ ذرا ذرا سی بات پر اتنا دایلا جاتی کہ گھر کے درو پوار کا پتہ نہ لگتے پورا گھر اس کے آگے پیچھے پھرتا کہ کہیں اس کی مرضی کے خلاف کوئی بات نہ ہو جائے لیکن اپنی احتیاط کے باوجود بھی کوئی نہ کوئی بات ہوئی جاتی۔

دن یوں گزرتے رہے۔ شادی کے ایک سال بعد عابدہ کے یہاں لڑکا پیدا ہوا۔ بچے کی پیدائش پر دونوں گھروں میں خوب خوشیاں منائی گئیں۔ ارشد نے اس موقع پر ایک تقریب کا اہتمام کیا۔ جس میں پوری برادری کو بلایا گیا تھا۔ تین روز سے گھر میں

شریف انفس واقع ہوئے تھے گاؤں کے لوگ اشرف اور احمد کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اسی طرح چودھری کی دونوں بیٹیاں عابدہ اور خالدہ بھی بڑی سمجھنے والی عورتیں اور خوش اخلاق واقع ہوئی تھیں غرور اور تکبر تو ان کو چھو کر بھی نہیں گزرا تھا۔ وہ بلا امتیاز گاؤں کی ہر تقریب میں شرکت کرتیں اور شادی ہو یا غم ان کی موجودگی ہر جگہ لازمی تھی۔

تھوڑے ہی فاصلے پر چودھری کا بڑا بھائی احسان رہتا تھا جس کے دو بچے نفیسہ اور ارشد تھے۔ ارشد بے حد پیارا اور دونوں گھرانوں کا لاڈلا تھا جسے بچپن سے سب اچھو کہا کرتے تھے۔

اچھو کا نام سنتے ہی میں مارے تجسس کے دادی اماں کے اور قریب ہو گئی۔ میری آنکھیں ان کے چہرے پر ابھرے ہوئے تاثرات پڑنے کی کوشش کر رہی تھیں اور ذہن کسی نتیجے پر پہنچنے کا سعی تھا۔ اس سے پہلے کہ دادی اماں کچھ اور کہیں کہ ہمارے گھر کے باہر کا دروازہ دھڑ سے کھل گیا اور میں نے گھبرا کر اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ وہی عورت دروازے کے سچے سوالیہ نشان بنی کھڑی تھی۔ کچھ دیر وہ خاموش رہی پھر فریادی لہجے میں بولی۔ ”تم نے میرے اچھو کو تو نہیں دیکھا؟“ تھوڑی دیر بعد وہ خود ہی دروازے سے ہٹ گئی لیکن باہر جا کر بھی وہ یہی الفاظ دہرا رہی تھی۔

اس کے جانے کے بعد میں نے سوالیہ لگا ہوں سے دادی اماں کی طرف دیکھا تو وہ یوں یہ چودھری انوار کی بد نصیب بیٹی عابدہ ہے جس کا رشتہ اچھو کے ساتھ طے ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ چودھری احسان نے اپنی بیٹی نفیسہ کا رشتہ بھی اشرف سے طے کر دیا تھا۔ عابدہ کی ماں وٹے سے کے حق میں نہ تھی لیکن اپنے شوہر کی مرضی کیخلاف کچھ نہ کر سکتی تھی۔

نیارہ ڈائجسٹ / اپریل ۲۰۱۶ء

گھر میں ہے اگر وہ نفیسہ کو راہ راست پر لانے کے لئے اس پر سختی کرتا تو اس کا اثر عابدہ کی ازدواجی زندگی پر بھی پڑ سکتا تھا شاید یہی اشرف کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ اگر وہ شروع سے ہی نفیسہ کو قابو میں رکھتا تو وہ اس حد تک خود سر اور بد مزاج نہ ہوتی جس کا مظاہرہ اس نے بھائی کے گھر ہونے والی تقریب میں کیا۔

بات بہت معمولی تھی اور بظاہر اس میں جھگڑے کی کوئی وجہ بھی نہیں تھی لیکن نفیسہ کی ضد اور بد مزیزی کے سبب نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ ہوا یوں کہ نفیسہ اچھی طرح بن سنور کر عابدہ کے کمرے میں پہنچی تاکہ اپنی تیاریوں کو فاصلے پر دے سکے۔ اسے معلوم تھا کہ عابدہ کے پاس میک اپ کا بڑا قیمتی اور عمدہ سامان ہے اور وہ اپنا میک اپ جس کہیں رکھ کر بھول گئی تھی۔ عابدہ نے الماری سے زیور نکالا اور نفیسہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی ”نفیسہ! اگر اس میں سے کچھ پہننا چاہو تو لے لو!“

نفیسہ نے اس کی بات پر پہلے تو کوئی خاص توجہ نہ دی اور بڑے اٹھناک سے اپنے ہونٹوں پر لب اسٹیک لگاتی رہی۔ ویسے بھی عابدہ کا سارا زیور اس کا دیکھا ہوا تھا اور اس میں کوئی ایسی خاص چیز نہ تھی جس پر نفیسہ کو ہوائی، پھر بھی عابدہ کے کہنے پر اس نے ایک نظر زیورات کے ڈبوں پر ڈالی جو بیسر پر کھلے پڑے تھے۔ عابدہ ایک ایک کر کے ان میں سے اپنی پسندیدہ چیزیں مہین مہین رہی تھی۔ جب اس نے دیکھا کہ نفیسہ نے ان میں سے کوئی چیز نہیں لی تو اس نے ایک ایک کر کے سارے ڈبے بند کئے اور انہیں لے کر الماری کی طرف بڑھی۔ نفیسہ اپنا میک اپ بھی کرتی جا رہی تھی اور اس کی توجہ عابدہ کی جانب بھی تھی۔ عابدہ نے سارے ڈبے الماری میں رکھنے کے بعد ایک بہتر مٹی ڈبہ نکالا اور اس میں سے

پورا ہوا تھا کہ اچانک نفیسہ نے زور زور سے زور کر دیا۔ یہ آوازیں عابدہ کے کمرے سے باہر میں خورن کر بہت سے لوگ اس جانب پہنچے۔ عابدہ کے کمرے کا منظر ہی عجیب تھا۔ نفیسہ نے اپنی طرح عابدہ کو جکڑ رکھا تھا اور وہ اسے ہاتھ کی جانب دھکیل رہی تھی۔ بڑی مشکل سے کمرے کے باہر نکلا گیا۔ نفیسہ کی ایک ہی رٹ تھی کہ عابدہ ہمارے گھر میں روادشت نہیں کر سکتی تھی۔ عابدہ نے نفیسہ کے دروازے کی چوکت تھام رکھی تھی اور باہر غم کر رہی تھی کہ میں اچھو کا گھر نہیں چھوڑ سکتی چاہے میرے گھر سے ہی کیوں نہ کر دو!“

یہ پہلی لڑائی تھی جو عابدہ اور نفیسہ کی شادیوں کے بعد ہوئی اس لئے ہر شخص حیران تھا۔ کیونکہ اس سے پہلے ایسی کوئی بات بھی سننے میں نہیں آئی تھی۔ بڑبڑبڑ جانتے تھے کہ نفیسہ مزاج کی تیز اور ماں باپ کی لاڈلی ہے لیکن جس گھر میں وہ بیاہ کر گئی وہ ان کے چچا کا تھا۔ اور جو محبت اسے وہاں ملی وہ کہیں اور نہیں مل سکتی تھی۔ اس کا شوہر اشرف بے حد نیک اور شریف آدمی تھا۔ شروع شروع میں اسے نفیسہ کے مزاج کی سختی ناگوار گزری لیکن اس نے اپنی محبت اور محبت سے اسے خوش رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ ایک تو وہ فطرتاً صلح جو تھا دوسرے اسے یہ بھی احساس تھا کہ اس کی بہن عابدہ نفیسہ کے بھائی کے

نیارہ ڈائجسٹ / اپریل ۲۰۱۶ء

گئی۔ اس نے پھری ہوئی شیریں کی طرح عابدہ پر حملہ کر دیا اور اسے مضبوطی سے پکڑ کر دروازے کی طرف کھینچنے لگی۔ ساتھ ہی وہ کہہ رہی تھی ”موتو مجھے کیا کرے سے نکالے گی میں تجھے اس گھر سے ہی نکال دیتی ہوں، نکل جا یہاں سے! اور آجندہ یہاں قدم رکھنے کی جرأت نہ کرنا۔ اب اچھو سے تیرا کوئی تعلق نہیں رہا۔ تُو نے میری بے عزتی کی ہے اب تُو اس گھر میں ایک سیکڑ بھی نہیں رہ سکتی۔“

ارشاد کو جب ان سب باتوں کا علم ہوا تو اس نے بھی بہن کو سمجھانے بچھانے کی بہت کوشش کی لیکن اس کی ایک ہی رٹ تھی کہ اب عابدہ اس گھر میں نہیں رہے گی اور نہ وہ خود شرف کے پاس جائے گی۔ گویا اپنی طرف سے اس نے سارے فیصلے کر لئے تھے اور چاہتی تھی کہ دوسرے تمام لوگ اس کے فیصلوں کو بلا چون و چرا تسلیم کر لیں۔ جب شرف کو نفیسہ کے اس احمقانہ مطالبے کا علم ہوا تو وہ دوڑا دوڑا آیا لیکن نفیسہ نے اس سے بات کرنے سے بھی انکار کر دیا۔ بلکہ وہ تو یہ چاہتی تھی کہ شرف کو عابدہ سے بھی نہ ملنے دیا جائے لیکن ارشد کی مداخلت کی وجہ سے وہ اپنی ضد پوری نہ کر سکی۔ اس نے اپنے سب گھر والوں کی موجودگی میں شرف عابدہ اور اس کی ماں کی دل کھول کر برائیاں کیں۔ شرف پھر بھی ضبط کئے بیٹھا رہا کیونکہ اس وقت وہ بہن کی سرسراہٹ میں تھا البتہ اس دن کے بعد سے شرف نے نفیسہ کو گھر لے جانے کی کوشش شروع کر دی لیکن نفیسہ نے اس کے ساتھ جانے سے صاف انکار کر دیا اور کہا اس گھر سے اب صرف عابدہ جائے گی۔ نفیسہ ایک بار یہ غلطی کر چکی ہے دوسری بار وہ اسے نہیں دہرائے گی۔ اس طرح کی مبینہ گزر گئے نفیسہ اپنے گھر نہ

ایک بہت ہی نازک سفید موتیوں کا ہار لے کر ڈریسنگ ٹیبل کی طرف بڑھی۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اس نے ایک مرتبہ ہار کو اپنے گلے سے لگا کر دیکھا۔ نفیسہ آئینے میں سے یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی اس سے پہلے کہ عابدہ اپنے گلے میں وہ ہار ڈالتی نفیسہ سیدھی کھڑی ہو گئی اور بولی۔ ”لاؤ عابدہ یہ ہار میں پہنوں گی۔“

اس کی فرمائش سن کر عابدہ کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ یہ ہار تو بیچ کی پیدائش پر ارشد نے اسے تحفے میں دیا تھا اور فرمائش کی تھی کہ عابدہ بیچ کی پہلی تقریب میں یہ ہار ضرور پہنے گی۔ اگر کوئی اور موقع ہوتا تو وہ نفیسہ کی بات سمجھ نہ پاتی لیکن اس خوشی کے موقع پر وہ اپنے شوہر کا دیا ہوا تحفہ کیسے اسے دے سکتی تھی۔ اس کے منہ سے بس یہی الفاظ ادا ہو سکے ”مگر..... نفیسہ تو.....“

”میں نے کہا ہار مجھے دے دو۔“ نفیسہ نے

تھکمانے لپے میں کہا۔ عابدہ کو بھی غصہ آ گیا اور وہ تنک کر بیٹی۔ ”خفیک ہے اپنے بھائی سے جا کر پوچھ لو اگر وہ کہہ دیں تو یہ ہار بھی تو مبارک ہو۔“

”جتنی مجھے چکر دیتی ہے!“ نفیسہ چلاتے ہوئے بولی۔ ”بھائی کہاں سے بیچ میں آ گیا! یہ زیور ہمارا بیٹھی۔“

نفیسہ کی باتیں سن کر عابدہ کو غصہ تو بہت آیا لیکن اس نے بہت ضبط سے کام لیا اور اتنا ہی بولی ”نفیسہ ہر بات کی ایک حد ہوتی ہے۔ بہتر یہی ہے کہ تم چپ چاپ میرے کمرے سے چلی جاؤ اور شام سائے میں مہمانوں کے درمیان جا کر بیٹھو ورنہ میں بھی غصے میں بہت کچھ کہہ سکتی ہوں۔“

یہ سنتے ہی نفیسہ کے تن بدن میں آگ لگ

نیارہ ڈائجسٹ / اپریل ۲۰۱۶ء

سب کچھ ارشد کی خاطر برداشت کرتی رہی لیکن اس کا صبر بھی نفیسہ کو گوارا نہ ہوا اور اس نے ایک دن صاف صاف لفظوں میں بھائی سے کہہ دیا کہ وہ عابدہ کو طلاق دیدے۔

ارشاد کو اپنی بیوی سے بہت محبت تھی اس لئے طلاق کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ بڑی سوچ بچار کے بعد اس نے اس مسئلے کا یہ حل نکالا کہ عابدہ کو الگ گھر لے دیا۔ عابدہ اپنی سرسراہٹ سے الگ تو نہیں ہونا چاہتی تھی مگر حالات اس موڑ پر پہنچ چکے تھے کہ اسے اپنے شوہر کا فیصلہ قبول کرنا پڑا۔ کچھ ہی دن سکون سے گزرے تھے کہ نفیسہ نے پھر وہی حرکتیں شروع کر دیں۔ جب بھی ارشد عابدہ کے پاس جانے لگتا تو وہ دروازہ آسمان سر پر اٹھا لیتی۔ رفتہ رفتہ گھر کے دوسرے افراد نے بھی نفیسہ کا ساتھ دینا شروع کر دیا۔ ارشد کے لئے یہ سب کچھ انتہائی عجیب تھا۔ اس کی عقل کام نہیں کر رہی تھی کہ وہ اس مسئلے کو کس طرح حل کرے۔ ایک دن ارشد کے باپ نے اسے اپنے کمرے میں بلایا اور اپنی بچڑی اس کے قدموں پر رکھ کر بولا ”پترا! بہن کی بات مان لے ورنہ وہ زندہ نہیں رہے گی۔ تجھے تو عابدہ سے اچھی بیوی مل جائے گی مگر نفیسہ نہ رہی تو ہمارا کیا بنے گا!“

باپ کے اس رویے نے ارشد کا دل توڑ دیا۔ اس وقت تو وہ خاموش رہا لیکن اپنے طور پر وہ ایک فیصلہ کر چکا تھا دوسرے دن رات کی تاریکی میں وہ چوری چھپے عابدہ سے ملا اور اسے اپنے منصوبے سے آگاہ کیا۔ عابدہ اور ارشد جن حالات سے گزر رہے تھے ان سے نکلنے کی یہی ایک صورت تھی۔ ارشد نے عابدہ کو کتنی سے تاکید کر دی تھی کہ اس ملاقات کا کسی کو علم نہ ہو۔

دوسرے دن پروگرام کے مطابق ارشد گاؤں

اپس دوران میں اشرف کئی بار اسے لینے آیا مگر باپ کا یہی جواب تھا ”ابنِ بہن کو لے جاؤ اور اتفاق دے دو۔“ نفیسہ کے اس پانگل پن سے باپ کو باز تھا۔ سب اسے سمجھا سمجھا کر تھک چکے تھے اس کی دیوانگی بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ عابدہ اور باپ کے بیٹے کی تو وہ جانی دشمن بن چکی تھی۔ اس نے لڑکھچاہٹ بھجوا کر اسے طلاق نہ دی تھی تو وہ بڑا کا خون کر دے گی۔ اشرف یہ دھمکی سن کر گھبرا اُٹھا اس نے اپنے باپ، تایا اور بھائیوں کو یہ برتاؤ بتائی۔ سب سر جوڑ کر سوچنے لگے اور کئی دن کی سوچ بچار کے بعد یہی فیصلہ ہوا کہ اشرف نے طلاق دے ہی دے شاید اس طرح اس کی دماغی کمی ہی آجائے۔ صرف اشرف کا چھوٹا بھائی اور اس کی ماں اس فیصلے سے متفق نہ تھے۔ طلاق کا لفظ ویسے ہی گاؤں میں بہت محبوب سمجھا جاتا تھا اور ان کا خیال تھا کہ طلاق کے بعد نفیسہ کے مسئلے مزید بڑھ جائیں گے اور وہ عابدہ کا جینا حرام کر دے گی۔ امجد کا خیال تھا کہ اشرف، نفیسہ کو زبردستی اپنے ساتھ لے جائے اور مار پیٹ کر اس کا دماغ ٹھکانے لگا دے لیکن اشرف اس پر تیار نہ ہوا۔ بالا درخو دوں گھر والوں کی مرضی سے اشرف نے نفیسہ کو طلاق دیدی۔

طلاق دے لے ہی نفیسہ بالکل پانگل ہو گئی۔ اس نے گھر کی ہر چیز توڑ پھوڑ دی۔ عابدہ کو بالوں سے پکڑ کر دیوار سے دے مارا۔ اتفاق سے اس وقت گھر میں کوئی مرد موجود نہ تھا۔ عابدہ لہو لہان ہو گئی لیکن اس نے ارشد سے شکایت نہ کی۔ پھر یہ روز کا معمول بن گیا۔ نفیسہ نے عابدہ پر جو مظالم کئے انہیں بیان کرتے ہوئے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ اس نے عابدہ کے سینے کا دودھ بند کر دیا اس کی چیزیں توڑ پھوڑ دیں کی مرتبہ اس کا کھانا اٹھا کر پھینک دیا۔ عابدہ یہ



لائق خان ہمد

میں گروؤز..... ساحلی پودے

قدرت کے عطا کردہ یہ پودے ہمیں سمندری جوار بھالے
اور طوفانوں سے محفوظ رکھتے ہیں!

لہروں نے ایک بہت بڑے خطرے ارض کو تباہ کر
تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے فلک بوس عمارتیں زیر زمین
گئیں تھیں۔ دس ہزار سے زیادہ تعداد میں لوگ
طوفان کی نذر ہو گئے تھے۔ سماترا سے لے کر سری
اور جنوب مشرقی علاقے میں لوگ ہزاروں کی تعداد
میں بے گھر ہو گئے تھے۔ اس سمندری زلزلے

سمندری ساحل پر آگئے والے پودے ہمیں
رہائی سے بچا سکتے ہیں۔ ۲۶ دسمبر ۱۹۰۳ء وہ یادگار
اور ٹھوس دن ہے جس دن جنوبی ہندوستان کا مشرقی
ساحلی علاقہ سونامی سے متاثر ہوا تھا۔ جس کا مرکز
انڈونیشیا کے سماترا کے علاقے میں تھا۔ جہاں
زبردست سمندری طوفان آیا تھا اور بہت اونچی اونچی

کی طرف سے ایک خط ملا جس میں یہ اطلاع دی گئی
تھی کہ ارشد کا جہاز ایران، عراق جنگ میں ہونے
والی گولہ باری کی زد میں آ گیا اور عملے کے تمام افراد
جاں بحق ہو گئے۔

دادی اماں نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور
دوپٹے کے کونے سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے
بولیں۔ ”بس بیٹی وہ دن ہے اور آج کا دن اس
بد نصیب کی یہی حالت ہے صدے نے اس کا
دمار ماؤف کر دیا ہے۔ ہر آتے جاتے سے یہی
سوال کرتی ہے تم نے میرے اچھو کو تو نہیں دیکھا!
اگر وہ ملے تو اس سے پوچھنا کہ میرا جرم کیا
ہے اب تو اس کا لڑکا بھی بڑا ہو گیا ہے اور اپنی
نھتیاں میں رہ رہا ہے لیکن اسے سوائے اچھو کے
کچھ یاد نہیں۔ اب اس بد نصیب کو کون بتائے کہ
اس کے سوال کا جواب دینے والا ہم سب سے
روٹھ کر بہت دور چلا گیا ہے کبھی لوٹ کر نہ آنے
کے لئے۔“

دادی اماں کی بات ختم ہوئی تو میں اٹھ کر
کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی جہاں دونوں وقت ایک
دوسرے سے گھلے رہے تھے۔ شاید صدیوں سے
پونہ ہوتا چلا آیا ہے اور یہی قانون فطرت ہے
لیکن زمینی خداؤں نے جو قانون اور رواج بنا
رکھے ہیں ان کے جال میں نہ جانے کتنے معصوم
اور بے گناہ اپنی آرزوؤں، تمناؤں اور خواہشوں کا
گلا گھونٹ کر کھینے پر مجبور ہیں۔ یہ کہانی صرف اچھو
اور عابدہ کی نہیں اس معاشرے کے ہزاروں
لاکھوں بہن بھائیوں کی ہے جو وٹے بٹے کی لعنت
کا شکار ہو کر زندگی کو ایک عذاب کے مانند
برداشت کر رہے ہیں۔

سے غائب ہو گیا اور ٹھیک ایک ماہ بعد یونان سے
اس کا خط آیا جس میں اس نے اپنی خیریت کی
اطلاع دینے کے ساتھ ساتھ چوری چھپے ملک سے
باہر جانے کی وجہ بھی بیان کر دی تھی۔ اس نے لکھا تھا
کہ اب گاؤں سے اس کا کوئی تعلق نہیں رہا۔ البتہ وہ
کبھی کبھار اپنی خیریت کی اطلاع بھیجتا رہے گا۔ اس
نے پانی کے جہاز پر نوکری کر لی تھی عابدہ کو وہ پہلے
ہی سمجھا چکا تھا کہ کسی جگہ سیٹ ہوتے ہی وہ اسے بھی
اپنے پاس بلا لے گا۔

ارشد کے جانے کی سب سے زیادہ خوشی نفسیہ کو
ہوئی۔ اس کا رونا پینا، لڑنا جھگڑنا سب ختم ہو گیا۔
ارشد کا خیال اب بھی کبھار آ جاتا جس سے اس کی خیریت
کا پتہ چل رہا تھا۔ اس طرح دو سال گزر گئے۔ ارشد کا
خط عابدہ کے نام آیا جس میں اس نے لکھا تھا کہ
اس کا کنٹریکٹ ختم ہو گیا ہے اور وہ اب پاکستان
واپس آنے والا ہے پچھلے دنوں اس کا جہاز کویت گیا
تھا جہاں اسے ملازمت مل گئی ہے۔ پاکستان آنے
سے پہلے وہ کویت کا ویزا لے کر آئے گا اور پھر دو
تین ماہ بعد عابدہ کو بھی وہیں بلا لے گا۔ ایک بار پھر
اس نے عابدہ کو تاکید کی کہ ابھی وہ کسی سے اس کا
تذکرہ نہ کرے۔

یہ خط پا کر عابدہ کی خوشی کا کوئی اندازہ نہ رہا۔
اس کا دل چاہ رہا تھا کہ گاؤں کے ایک ایک گھر میں
جا کر یہ خوشخبری سنائے لیکن ارشد کی تاکید کی وجہ سے
خاموش رہی۔ اس کے صبر کا پھل ملنے والا تھا۔ اب
وہ ایک ایک دن گن کر گزار رہی تھی اور شدت سے
ارشد کے آنے کا انتظار کر رہی تھی پھر اس کا انتظار
طویل ہوتا چلا گیا۔ مگر ارشد کی کوئی اطلاع نہ ملی۔ وہ
روزانہ صبح سے شام تک دروازے کی چوکھٹ سے لگی
ڈاکے کی راہ دیکھتی جو اس کے دروازے کے سامنے
سے سر بلاتا ہوا گزر جاتا۔ بالآخر چھ ماہ بعد اسے کہنی

سیرا ڈائجسٹ / اپریل ۲۰۱۶ء

مرکز (ایپی سنٹر) گج بھگ ۲۵۰ کلومیٹر جنوب مغربی بٹراج سائٹرا کے پاس تھا اور زلزلے کے پیمانے پر اس کی پیمائش ۸.۹ تھی۔ ہندوستان میں تامل ناڈو، پانڈچری، آندھرا پردیش اور کیرالہ میں تین ہزار سے زیادہ لوگ مارے گئے تھے۔ لوگ آج تک اس تباہی کے درد کو محسوس کر رہے ہیں۔ لاکھوں لوگ سونامی کے اچانک حملے سے گھر سے بے گھر، لاوارث ہو گئے۔ آج بھی چھوٹے موٹے جھٹکے ہندو مہاساگر، خاص طور پر سائٹرا اور دوسرے جزیروں میں آتے رہتے ہیں۔ سناہی لہروں کا اندیشہ اب بھی بنا ہوا ہے۔ ہم زلزلوں کو روک سکتے ہیں سنہائی لہروں کو لیکن انسانی جانوں کے نقصان کو تو کم کر سکتے ہیں۔

سونامی کیا ہے؟

سونامی جاپانی لفظ ہے جس کا مطلب ہے سمندری لہر اور سائنسی نظریے سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ وہ طوفانی لہریں ہیں جو سمندر میں آئے زلزلے کا سبب ہوتی ہیں۔ سونامی لہریں اس وقت پیدا ہوتی ہیں جب سطح سمندر ذرا جھٹک جاتی ہے یا زیر زمین جب زلزلہ آتا ہے تو ایک نمایاں تغیر پیدا ہوتا ہے بالکل اس طرح کہ سطح سمندر پر اوپر سے کوئی چیز چٹکتی جائے تو چاروں طرف لہریں پھیلتی چلتی جاتی ہیں۔ دوسرا امکان یہ بھی ہے کہ سمندر کے نیچے زمین پھسل جائے یا کوئی آتش فشاں پھٹ جائے۔ بہت ساری سونامی لہروں کی ابتدا اس طرح بھی ہو سکتی ہے کہ بحرالکاہل میں آتش فشاں لہریں، آتش دھاروں کی شکل میں ۳۲۵۰۰ کلومیٹر کی دوری تک پھیلتی چلی جائیں۔ مثال کے طور پر ۱۸۱۹ء سے اب تک 'ہوائی کے جزیروں' میں ۳۰ سونامی آچکے ہیں۔

سونامی لہریں گہرے سمندر میں سینکڑوں کلومیٹر کا

فاصلہ ۶۵ سے ۸۰۰ کلومیٹر فی گھنٹہ طے کر لیتی ہے۔ جب آٹھ پانی میں یہ لہریں پہنچتی ہیں جن کی اونچائی (صرف ایک یا دو فٹ ہوتی ہے) تو ان کی اونچائی ایک دم بڑھ جاتی ہے اور جب تک یہ ساحل تک پہنچتی ہیں تو بڑھ کر اونچائی میں ۵۰ فٹ تک پہنچ جاتی ہیں، اور تمام ساحلی اور قریب وجوار کے علاقے کو تباہ کر دیتی ہیں۔ سونامی گزر جانے کے بعد کے مشاہدات سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ وہ ساحلی علاقے جہاں کناروں پر پتھر پودے لگے ہوئے تھے ان میں نسبتاً نقصان کم ہوا ہے۔ خاص طور پر انڈمان، نکوبار کے جزیرے، تامل ناڈو اور پانڈچری کے وہ علاقے جہاں 'مین گروز' یا ساحلی پودے موجود تھے۔ وہاں ساحلی علاقوں کے کنارے جانور، انسان اور فصلوں کو بہت کم نقصان پہنچا۔ متحجر ذرائع کے مطابق، مین گروز جنگلات نے ۵۰ فیصدی انسانی جانوں کو بچایا، ۳۴ فیصدی جانوروں اور ۲۲ فیصدی زراعتی زمین اور فصلیں سونامی سے متاثر نہیں ہوئیں۔

ساحل سمندری پودے (مین گروز) کیا ہیں؟

یہ پودے ساحلی پودے کہلاتے ہیں جو دلدلی مٹی میں گرم اور نیم گرم علاقوں میں سمندر کے کنارے اگتے ہیں اور طوفانی لہروں کا مقابلہ کرتے ہیں۔ ساحلی پودے جو جنگلوں کی طرح ہوتے ہیں اور اپنے آپ کو مختلف حالات کے مطابق ڈھال لیتے ہیں جیسے زمین کی پکڑ، عمل متحرک، پچائی (ڈوپیڑی)، نسل مقام، اپنی مخصوص خصوصیات کی وجوہات ان ساحلی پودوں میں حیواناتی اور نباتی خزانہ بہت ہوتا ہے۔

ساحلی پودے اپنی اپنی قسم کے حساب سے اور ماحولیات کے لحاظ سے الگ الگ تدوینات کے

سیرا ڈائجسٹ / اپریل ۲۰۱۶ء

میں سے ۱۶ قسمیں "مین گروز" پر مشتمل ہیں۔ برصغیر کے خاص ساحلی پودوں کی بہت سی قسمیں ہیں۔

جہاں تک موصول ہوئی اطلاعات کا تعلق ہے انڈیمان، نکوبار جزائر میں ساحلی پودوں کی اقسام اس طرح ہیں کہ ۲۷ درخت، ۵، چھڑیوں کی اقسام، تیل کی ایک قسم اور ۲ اقسام پام اور فرن کی موجود ہیں۔ ان ساحلی پودوں کی آٹھ اہم اقسام ہیں۔

ساحلی پودوں کے ماحولیاتی نظام کی اہمیت

ان پودوں کی بہت اہمیت ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ پتھر زمین و آبادی کی حفاظت کرتے ہیں سمندری جوار بھائے اور طوفانوں سے یہ پودے سمندری ساحلوں کو محفوظ بناتے ہیں۔ اور کٹاؤ کو روکتے ہیں۔ ان درختوں کی وجہ سے ان علاقوں میں ایک خاص حیاتیاتی نظام ہوتا ہے۔ جیسے کہ سمندری جانور SHRIMPS پران کی مختلف قسمیں (ککڑے) کریب، مچھلیوں اور مگوں کی جائے پیدائش اور جائے پناہ ہوتی ہیں۔ یہ ساحلی پودے مچھروں کی روزی روٹی کا ذریعہ بنتے ہیں۔

ان ساحلی پودوں کے ماحولیاتی نظام کا دارومدار ان علاقوں میں رہنے والے لوگوں پر منحصر ہوتا ہے۔ جو مختلف اشیاء کی پیداوار جیسے غذا کی فراہمی، دواؤں کیلئے استعمال، ایندھن اور تعمیراتی کاموں کیلئے استعمال میں لاتے ہیں۔ مین گروز غلات کو صاف کرنے میں بھی مدد دیتے ہیں۔ اس لئے کہ یہ پودے اگر تاثریت اور فاسٹ ضرورت سے زیادہ ہوں تو ان کو اپنے اندر جذب کر کے ساحلی پانی کو صاف اور آلودگی سے بچاتے ہیں۔

ساحلی پودوں کو خطرہ

آج ساحلی پودوں کو سب سے زیادہ خطرہ ہے

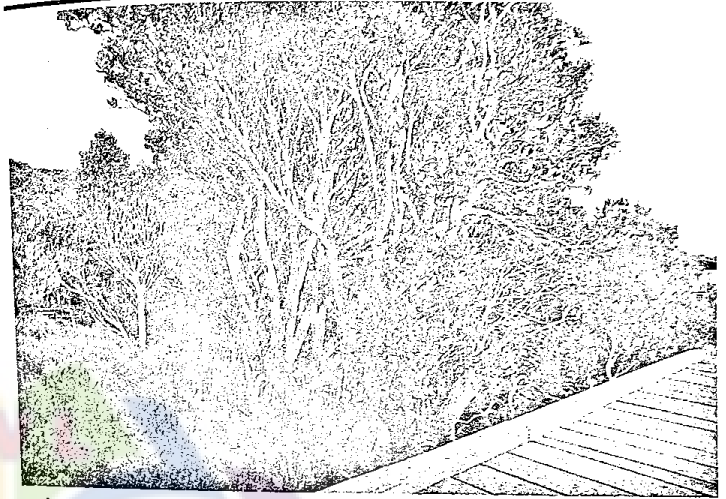
ہے۔ یہ چھوٹی چھاڑیوں سے لے کر جالیس ہلکی اونچائی تک ہوتے ہیں۔ ان پودوں کی مختلف نام ہیں جیسے سرخ ساحلی پودے، کالے ساحلی پودے، سب میں اس طرح کے سوراخ ہوتے ہیں جن سے سانس لی جاسکتی ہے ان کے اندر انہیں داخل ہوتی ہے اور پورے پودے میں تقسیم ہوتے ہیں۔ لیکن یہی سوراخ طوفانی لہروں کے ہاتھ کام نہیں کرتے ہیں۔

ساحلی پودوں کا رقبہ

زیادہ تر گرم اور نیم گرم ساحلی علاقوں میں ساحلی پودے مین گروز ۳۳ ملین ہیکٹر کے رقبے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ہندوستان کے ساحلی کنارے جنگلی بلبل ۵۰۰ کلومیٹر ہوتی ہے۔ مشرقی مغربی اور جنوب میں باغی جاسکتی ہے۔ مشرقی علاقوں میں ال ناڈو آندھرا پردیش، اڑیسہ، مغربی بنگال اور ڈیمان نکوبار جزیرے آتے ہیں۔ مشرقی ساحلی پودے زیادہ علاقے پر پھیلے ہوئے ہیں بہ نسبت مغربی ساحل کے کیونکہ مشرقی ساحلی علاقے میدانی یا کم ڈھلان والے ہوتے ہیں۔ ہندوستان میں ساحلی پودوں کا کل رقبہ ۶۷۰۰ سکوائر کلومیٹر ہے جو تمام دنیا کے ساحلی کناروں کا ۱ فیصدی رقبہ ہے۔ ہندوستان کا ۸۰ فیصدی ساحلی علاقہ سمندری کنارے اگتے ہیں اور طوفانی لہروں کا مقابلہ کرتے ہیں۔ ساحلی پودے جو جنگلوں کی طرح ہوتے ہیں اور اپنے آپ کو مختلف حالات کے مطابق ڈھال لیتے ہیں جیسے زمین کی پکڑ، عمل متحرک، پچائی (ڈوپیڑی)، نسل مقام، اپنی مخصوص خصوصیات کی وجوہات ان ساحلی پودوں میں حیواناتی اور نباتی خزانہ بہت ہوتا ہے۔

برصغیر کے ساحلی پودوں کی اقسام

ساحلی پودوں کی گج بھگ ۱۰ قسمیں ہیں جن میں ۲۵ قسمیں ساحلی جنگلات پر مبنی ہیں۔ انیشیا ساحلی پودوں کی ۳۳ اقسام سے مالا مال ہے۔ راجستھان کی ساحلی پودوں کا اصل خاندان ہے جن



اللہ کے رسولین کے پیغمبر جو حیات و کائنات کی بنیاد ہیں

سیارہ ڈائجسٹ

عظیم الشان اور روح پرور



بیت 175 روپے ایڈیشن شائع ہو گیا ہے

اپنی سابقہ روایات کے شایان شان یہ نمبر پیغمبران خدا کی حیات جادواں ان کے معجزات اور ایمان افروز واقعات پر مشتمل ایک متاع بے با اور جانت دستاویز ہوگا۔

ایڈیشن شائع ہوا ہے

سیارہ ڈائجسٹ: 240 مین مارکیٹ ریواڑ گارڈن لاہور فون: 37245412

جو تیزی سے کم ہوتے جا رہے ہیں۔ جڑوں کے وہ حصے جن میں سانس لینے کیلئے سوراخ یا لیٹریل سمندروں میں شلک زمینی غلاقت جیسے تیل، دوسری طرح کی آلودگی یا متواتر سیلاب کی وجہ سے بند ہو جاتے ہیں۔ بھر وقت کے ساتھ ساتھ منگروں کے درخت ختم ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ کوئلے اور گدھڑی کیلئے ایندھن کے طور پر منگروں کے استعمال نے ان پودوں کو بہت متاثر کیا ہے۔ سیاحت کے فروغ اور دوسری طرح کی ساحلی تہذیبیاں بھی منگروں کو نقصان پہنچانے کا سبب بنی ہیں۔ بہت تیزی سے سمندری ساحل ”ڈیجرس“ (تھینکے) ”ڈیجھانے کی منعت نے بھی گزشتہ پندرہ سالوں میں ساحلی پودوں کو متاثر کیا ہے۔

حال ہی میں بہت ساری صنعتوں اور مختلف کھیلوں نے ساحلی جنگلات کو بے کار، دلدلی علاقہ کہہ کر ان کی تقسیم کر دی ہے۔ اور اس طرح سے

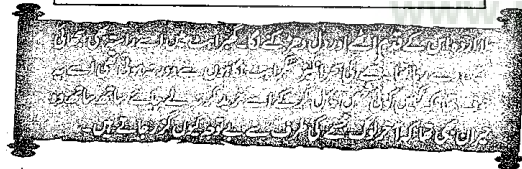
چاہے وہ شرس کی پیداوار ہو یا سیاحت کا فروغ اس تقسیم نے ساحلی پودوں کو اجازت کرنا بہت سے خطرات کو بڑھا دیا ہے۔ یہ تقسیم بہت بڑی تباہی کا سبب ہے۔ ۱۹۶۰ سے تھائی لینڈ میں اب تک آدھے سے زیادہ مین گروز کا خزانہ ختم ہو چکا ہے۔ زمانہ حال میں عالمی پیمانے پر شرس کی پیداوار کے سلسلے میں ۵۰ فیصد مین گروز ختم ہو گئے ہیں۔ اس کے علاوہ مین گروز اونٹوں کا چارہ بھی ہے اس لئے چھیرے روز بڑی بے دردی سے مین گروز کی شاخیں کاٹ کر اونٹوں کے مالکان کو فروخت کر دیتے ہیں اور اس طرح مین گروز بڑی تیزی سے متاثر ہو رہے ہیں۔ حکومت نے مین گروز کاٹنے والوں پر دو ہزار روپیہ جرمانہ قانون نافذ کیا ہوا ہے۔ لیکن شاخیں اور پتے کاٹنے والے ایک چھیرے میں کم از کم چار ہزار سے چھ ہزار کاتے ہیں۔ اس لیے دو ہزار روپیہ جرمانہ ان کی نظر میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔

پردہ نشین گرڈیا

صادق ہایت



ایک شخص کا قصہ، اس کی ساری عاشقانہ زندگی کا محور ایک مجسمہ تھا



کیس کے پاس کھڑا تھا۔ اسے میں ہوٹل کے کچھنے
بھاری بھر کم گرانے اس کے قریب آ کر کہا۔
”کیا تم بھی جا رہے ہو؟“
مہر داد کا چہرہ سرخ ہو گیا اور اس نے سرجھکا لیا۔
پھر وہ کہنے لگا۔ ”ہمیں افسوس ہے کہ اگلے سال تم
یہاں نہ ہو گے۔ حقیقتاً جہاں تک تمہارے اخلاق اور

گہری کی چھینوں کا آغاز تھا۔ نوور کے صاف و
نفاذ کا تھی ہوٹل کے طالب علم اپنے ہاتھوں میں
ہر کیس سنبھالے خوشیاں مناتے اور بیٹھیاں
ہائے سکول سے رخصت ہو رہے تھے۔ فقط مہر داد
اُنہیں ہیٹ لئے اس تاہر کی مانند جس کے جہاز
اُن لوگے ہوں مغفوم اور خاموش اپنے سوٹ



ساحلی پودوں کا تحفظ

حکومت کی بے توجہی اور لاپرواہی کے سبب
شرمش کی صنعت کو بڑھاوا نہ ملتا اور بہت سی کئی برقی
ایجنسیوں کی معاشی بے اعتدالی کی وجہ سے یہ
پودے خسارہ اٹھا رہے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ جو امیر
ملک ہیں وہ اس صنعت کو بڑھاوا دے کر خود فائدہ
اٹھا رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس صنعت کے
بڑھاوے کے پیچھے پیسہ بہت بڑی طاقت ہے۔
جب کہ اسکی مانگ عالمی پیمانے پر ہو رہی ہے۔ مگر
سب کو اس سے فائدہ نہیں ہو رہا ہے۔
ساحلی پودوں کی افزائش، فوج، ان کے ساز،
لہائی اور لہروں کے اتار چڑھاؤ پر منحصر ہے۔
گھاس ج اور اسکی کیر یا ایگالوچا کے بیج بہت
نصفے نصفے ہوتے ہیں لہذا وہ زیادہ سے زیادہ جوار
بھائے والی زمین سے دور اور اوپر اگتے ہیں۔ جبکہ
راہز فوراً، کینڈلیا، بریو یوس اور بروئیر کے بیج اپنی
تیرنے والی سطح پر نشوونما پالیتے ہیں۔
اوپر مہیا کی کئی معلومات کی بنا پر حکومت اور
ساحلی علاقوں میں رہنے والے سائنس دانوں اور سوانا
جیسے طوفان اور بربادی سے بچ سکتے ہیں۔

ساحلی پودوں کو متاثر کرنے والے عوامل

ساحلی پودوں کو متاثر کرنے والے عوامل میں
قدرتی ماحولیاتی آلودگی ہے جو سمندروں میں وقتاً
وقتاً پیدا ہوتی رہتی ہے۔ دوسرے عوامل بھی ہیں جو
عارضی ہوتے ہیں جیسے ہوا کا درجہ حرارت، نمکیات،
سمندری لہریں، طوفان، ساحلی ڈھلوان اور زمین کی
تہہ وغیرہ۔ بہت سے ساحلی پودے کچڑ میں اگتے
ہیں مگر کچھ زیت، پمپٹ اور چٹانوں پر بھی اگتے
ہیں۔ اگر سمندری جوار بھانا نارمل انداز کا ہو تو یہ
پودے ساحل پر دور دور تک اگتے ہیں اور زمین کا
ایک بڑا رقبہ گھیر لیتے ہیں۔ اچھی پیداوار کیلئے ساحلی
پودوں کو ریت کی ایک اوپری سطح کی ضرورت ہوتی
ہے جو عام طور پر دریائوں اور سیلابوں کی وجہ سے
کناروں کے آس پاس جمع ہو جاتی ہے۔
ساحلی پودوں کا نباتی، حیوانی نظام بہت مضبوط
ہوتا ہے اور ایک دوسرے کے اندر گھٹھا ہوا ہوتا ہے۔
ان علاقوں کی آب و ہوا بہت اہمیت رکھتی ہے۔ اور
بہت سے اجزاء پر منحصر ہوتی ہے۔ جیسے درجہ حرارت
میں تبدیلی ۲۰ سے ۳۵ ڈگری سی (°C)، بارش، ہوا کا
بھاء، گہرے کا نہ ہونا اور برقی ششائیں وغیرہ۔

کی دلجوئی کے لئے مہر داد ایک لفظ بھی نہ کہہ سکا۔ شرم سے اس کی آنکھیں جھک گئیں۔ ہر چند یہ دونوں اسی گھر میں بے بڑے تھے اور بچپن میں ایک ساتھ کھیلے تھے۔ درخشندہ کی یاد اس کے دل میں حشر پر پا کرتی رہی یہاں تک کہ کراسین جہاز بندر پہلوی سے روانہ ہو کر سمندر کا سینہ چھرتا ہوا ایران کے ساحل سے دُور اندھیری اور چاندنی راتوں میں آہستہ آہستہ گم ہو گیا۔ یورپ پہنچ کر کچھ مہینے تو اسے درخشندہ یاد رہی لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ یکسر اسے بھول گیا۔

تعلیم حاصل کرنے کے اس عرصے میں نہ جانے کتنی پار تعلیمات ہوئیں لیکن مہر داد نے یہ چھپیاں ہوش ہی میں رہ کر گزار دیں۔ ہمیشہ وہ خود سے قول و قرار کر کے مطمئن ہوجاتا کہ اس کی حلائی آئندہ گریس کی تین ماہی تعلیمات میں کرے گا۔ شگفتہ حاصل کر کے مدرسے کی دنیا سے باہر نکلا اور اتنا طول روڈ پر واقع مدرسے کی دیو قامت دھوئیں سے سیاہ عمارت پر آخری نظر ڈالی اور سیدھا ہوئی بچھا۔ ایک کمرہ کرائے پر لیا اور اسی رات اس نے اپنے ہم جماعتوں سے گراڑ ٹھونک سیکو ڈانزنگ اور رومالیاں وغیرہ کی حرے حرے کی عاشقانہ داستانیں سنیں۔ اس نے اپنے پسندیدہ انداز کے سات سو فرانک اور اٹھارہ سو فرانک ماہانہ خرچ کے جیب میں ڈالے اور زندگی میں پہلی بار کسی کی سیر کی ٹھانی۔

شام کو اس نے شیو کیا رات کے کھانے سے فارغ ہو کر اس نے سوچا وہ ذرا بیکس مشین کی سیر بھی کرتا چلے کیونکہ وہ لورڈ کا مصروف اور بارون ترین بازار شمار کیا جاتا تھا جو ہندو گنگ چلا گیا تھا۔ مہر داد آہستہ آہستہ اور گرد کی چیزوں پر پر سری نظر ڈالتا ہوا گزر رہا تھا۔ وہ شوکیوں میں بھی ہوئی

اگر لڑکے کی حیثیت کے اپنے خاندان میں مشہور لڑکے کی لڑکی کا نام سنتا تو مارے شرم کے پسینے میں ارب جاتا۔ فرانسیسی طباء اس کا دل کھول کر مذاق اڑاتے اور جب وہ سب مل کر عورت، قص، تفریح، ورزش اور عشق بازی کے اپنے اپنے قصے سناتے تو ہر لڑکے سے احترام سے ان کی ہر بات پر صاف کرنا پڑتا مگر ایسا بھی نہ ہوا کہ وہ اپنی زندگی کے واقعات سے شغ و محبت کی ان رنگین داستانوں میں کچھ اضافہ کر لیتا۔

وہ بچپن ہی سے ڈر پوک افسردہ گھٹا گھٹا اور سستا ملاسا رہتا تھا۔ کسی نامحرم عورت سے اس نے آج تک بات نہ کی تھی۔ جہاں تک ہوسکا اس کے والدین نے بھی اس کے دماغ میں ہزار سال پرانی نصیحتیں کوٹ کوٹ کر بھری تھیں اور یہ سمجھ کر کہ کہیں ان کا نور نظر سلامتی کے راستے سے ہٹک نہ جائے اس کی چچا زاد بہن درخشندہ سے منگنی کر دی تھی۔ اس کے والدین اپنے اس اقدام کو بٹنے کے حق میں بزرگانہ احسان اور ایثار و قربانی کی مثال گردانتے تھے اور بقول خود ان کے انہوں نے ایک ایسے بیٹے کو پروان چڑھایا تھا جو سربا جسمہ اخلاق نیک دل باحیا اور پاکباز تھا۔ اب چاہے اس ذات شریف کا مصروف و ہزار سال پہلے ہی کیوں نہ ہوتا ہو۔

مہر داد کی عمر چوبیس سال تھی لیکن وہ ایک چودہ سالہ یورپی لڑکے کی سی جسامت، تجربے، ہوشیاری اور سوچ سے محروم تھا۔ وہ ہر وقت رنجیدہ اور غمگین رہتا تھا گویا اس بات کا خطر ہے کہ کوئی مرثیہ خواں نمبر پر چڑھ کر کچھ بڑھنا شروع کرے تو وہ فپ ٹپ آنسو گرانے لگے۔ اس کی زندگی میں عشق و محبت سے عبارت وہ یادگار دن تھا جب وہ تہران سے روانہ ہو رہا تھا اور درخشندہ آنسوؤں سے ڈھیل پائی آنکھوں سے اسے الوداع کہنے آئی تھی لیکن درخشندہ

اور سیاہ بیٹونیں تھیں۔ وہ ہر تیسرے دن شیو بناتا اور بڑی منظم اور محتاط زندگی گزارتا تھا۔ یہ چٹا پٹا پن اس کے مدرسے کی زندگی اس کے کھانے پینے، سونے جاگنے حتیٰ کہ اس کی روح پر چھاپ بن کر رہ گیا تھا۔ مدرسے کی بلند اور دھوئیں سے کالی دیواروں اور مختلف انخیال طالب علموں کے درمیان جن کی نہ وہ اچھی طرح زبان سمجھ سکتا تھا نہ ان کے معاشرتی آداب و اخلاق سے پوری طرح واقف تھا وہ خود کو اجنبی سمجھتا۔ کھانا بھی اسے وہاں مختلف انداز کا ملتا تھا گہما گہما اسے اس ماحول میں مہر داد کو شدت سے اجنبیت اور تنہائی کا احساس ستانے لگا۔ صرف اوتار کو وہ چند گھنٹے کی اجازت لے کر سیر و تفریح کے لئے نکلتا تھا تھیز اور سینما سے اسے کوئی رغبت نہ تھی میڈیٹیشن کے پبلک پارک میں جا کر وہ ایک طرف بیٹھ کر بیٹھ جاتا اور گھنٹوں وقت گزار دیتا وہ ادھر ادھر کھونٹے والے لڑکے اور لڑکیوں کو دیکھتا۔ کسی خاتون کو دیکھتا کہ اپنی دھن میں کچھ مٹی چلی جائی ہے ہنزہ زار پر خراماں خراماں چلنے والی چڑیوں اور کپوتروں کو دیکھتا دوسروں کی دیکھا دیکھی وہ اپنے ساتھ روٹی کے چند ٹکڑے لے جاتا اور باریک کر کے چڑیوں کے سامنے ڈال دیتا۔ دل چاہتا تو سمندر کے کنارے جا بیٹھتا اور ایک اونچے سے ٹیلے پر بیٹھ کر سمندر کی موجوں اور شہر کے منظر سے لطف اندوز ہوتا۔ اس نے سنا ہوا تھا کہ فرانسیسی شاعر لارامین بھی یورڈہ جمیل کے کنارے بیٹھ کر یونہی کیف اندوز ہوتا تھا۔ اگر موسم خوشگوار نہ ہوتا تو وہ کسی کیفے میں بیٹھ کر اپنا سبق یاد کرنے لگتا زندگی کی اس بوریٹ اور کچی کے باوجود نہ اس کا کوئی دوست تھا نہ ہم مشرب کسی ایرانی سے بھی اس کی رسم و راہ نہ تھی کہ کبھی کبھار اسی کے ساتھ ہی نشست و برخاست رہتی۔ مہر داد خود اپنے وطن ایران میں ایک خاموش اور کم

حسن سلوک کا تعلق ہے اس مدرسے کے طباء میں تمہارا نام سر فرست رہے گا۔ ہاں بٹے ایک فصیح کرتا ہوں ذرا یہ شرمیلا پن کم کر دو کچھ جرأت اور بہت دکھاؤ تم جیسے جوان کے لئے یہ بڑی عیب کی بات ہے زندگی میں انسان کو جرأت اور بہت کا چیکر ہونا چاہئے۔

”جی“ مہر داد نے کہا ”مجھے بھی سکول چھوڑنے کا یزاد بخ ہے۔“

ہوشل کے نگران نے ہنستے ہوئے اس کی پیٹھ کو تھپکا اور مصافحہ کرتے ہوئے کہا ”جاؤ خدا تمہارا ہے۔“ چڑیاں نے مہر داد کا سوٹ کیس اٹھایا، اتنا طول روڈ تک ساتھ ساتھ گیا اور اسے عیسیٰ میں سوار کرادیا۔

تو مہر داد فرانسیسی زبان کے نصاب کی تکمیل کے لئے لورڈ کے سکول میں داخل ہوا تھا جس دن وہ بیکس میں اپنے دوستوں سے جدا ہو کر لورڈ روانہ ہو رہا تھا یوں محسوس ہوتا تھا جیسے زبردستی کسی بھیڑ کو اس کے گلے سے الگ کر دیا گیا ہے۔ وہ بغیر چول و چراکے بڑی فرمایا برواری سے لورڈ روانہ ہو گیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے اپنی سعادت مندی اور حسن اخلاق سے سکول کے اساتذہ اور منتظمین کے دل میں گھر کر لیا۔ وہ سب کا منظور نظر بن گیا۔ وہ بڑے اٹھاک اور لگن سے اپنے اسباق تیار کرتا۔ اس کا ہر کام نام نہائیل کے مطابق ہوتا تھا لیکن وہ سارا وقت افسردہ غمگین اور بچھا بچھا سا رہتا۔ کتابوں میں اپنی جان کھپانے اور سکول کا دیا ہوا کام کرنے کے سوا اسے کسی دوسری چیز سے سروکار نہ تھا۔ گویا دنیا میں اس کی تخلیق کا مقصد ہی یہ سبق رسانی تو تھا۔ اس کے غور و فکر کا دائرہ کتابوں اور سبق سے تجاوز نہیں کرتا تھا۔ اس کا عام آدمیوں کا سا چہرہ مہرہ چلا رنگ لبا تھا، چھریا بدن، سکول بے کشش آنکھیں

چیزوں کو خاص طور پر غور سے دیکھتا اس کی جیب میں پیسے بھی تھے اور تین مہینے فرصت کا وقت بھی۔ وہ آزاد تھا اور اپنی آزادی کا خاطر خواہ فائدہ اٹھا کر کسبویں کی سیر کو جا رہا تھا۔ آج سے پہلے وہ ان فلک بوس اور رعب دار عمارتوں میں جو دائیں بائیں پھیلی ہوئی تھیں قدم نہ کر سکتا تھا لیکن آج رات وہ وہاں ضرور جائے گا کون جانے اس کے سیاہ ابرو اور خوبصورت آنکھیں دیکھ کر کوئی مچلی لڑکی اس کی گردیدہ ہو جائے۔ وہ سوچتا اور دیکھتا چلا جا رہا تھا کہ ایک بڑی سی دکان کے شوکیں کے سامنے پہنچ کر اس کے قدم رک گئے۔ اس کی نظریں ایک عورت کے جسم سے کرائیں جو خاص ادا سے نیوچی گردن کئے سر پر گھونگر ہالے بال کھمراے ناز و انداز سے مسکرا رہی تھی اس کی پلکیں لمبی آنکھیں بڑی اور گردن ہلکے کی مانند سفید تھی وہ ایک ہاتھ کمر پر رکھے ہوئے تھی کریم کمر کا لباس شوکیں کے نیلے رنگ کی روشنیوں میں مل کر عجیب دکھ مضر پیش کر رہا تھا۔

مہر داد وہاں بے اختیار کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ اس کی نظروں میں وہ مجسمہ نہ تھا..... ایک عورت تھی نہیں! عورت نہیں بلکہ فرشتہ جو اس کی طرف دیکھے اور مسکرائے جا رہا تھا اس کی گہری آنکھیں دلفریب مسکراہٹ ایسی مسکراہٹ کہ تصور میں بھی نہ آسکے۔ دہلا پٹلا لطیف اور متناسب جسم اس کے حسن و عشق کے خیالوں سے بھی بلند تھا۔ پھر سونے پر سہاگہ یہ کہ وہ عورت ذات ہو کر زبان ناطق نہ رکھتی تھی۔ وہ اس کے لئے مجبور نہ تھا کہ اظہار محبت کے لئے جھوٹ اور جیلے بہانوں سے کام لے۔ دوڑ دھوپ کرے یا حسن کی آگ میں جلے بس سادگت اور خاموشی ہمیشہ ایک ہی شان دلربائی اور کمال رعنائی لئے ہوئے نہ کھانے کی خواہش نہ پہننے کی فرمائش نہ سوسے نہ بہانے نہ روٹھنا نہ منانا نہ بیماری

نہ جیب خرچ ہمیشہ خوش ہمیشہ خنداں۔ وہ مجسمہ نہ تھا اس کی محبوبہ تھی جو روح و روان بن کر اس کے ارمانوں اور اس کی مرادوں میں سرایت کر گئی۔ مگر سب سے بڑھ چڑھ کر جو ادا اسے بھائی تھی وہ اس کا بات نہ کرنا تھا کیونکہ اس طرح وہ کبھی اس سے نہ کچھ اظہار خیال کرے گی نہ کبھی طبیعتوں میں اختلاف کا خدشہ درپیش ہوگا نہ اس کی پیشانی پر بل آئے گا نہ کبھی وہ اس سے روگردانی کرے گی نہ بھر بھاری ہوگا کہ تناسب اعضا میں تغیر رونما ہو۔ یہ خیالات برقی رو کی طرح اس کے ذہن سے گزر گئے اور وہ ایک فیصلہ کن نتیجے پر پہنچ گیا۔ لیکن کیا ایسا ہو بھی سکے گا کہ وہ اسے حاصل کر سکے؟ کیا وہ اس سے بغل گیر ہو کر اپنا دل پسند عطر اس کے دامن پر مل سکے گا؟ اس نے سوچا اس مجسمہ حسن و لطافت کے روپرواے شرم بھی محسوس نہ ہوگی۔ نہ وہ فریب دے گی اور نہ اس خود کو چاہنے کے لئے کسی احساس کمتری کا سوال پیدا ہوگا اور اس طرح وہ خود بھی ہمیشہ کی طرح پاک نظر پاک دل اور پاکیزہ مہر دادی رہے گا مگر..... ہاں وہ اس جسمے کو رکھے گا کہاں؟

اب تک اس کی نظر سے جو عورتیں گزریں وہ خوبصورتی میں اس حسین جسمے کی گرد کو بھی نہیں پہنچتی تھیں جسمے کی دلفریب مسکراہٹ اور پرکشش آنکھوں نے اس پر کچھ ایسا سحر کیا کہ باوجود ایک غیر طبیعت خلق ہونے کے وہ اسے جاندار نظر آنے لگا۔ اس کے خدو خال رنگ و تناسب اور جو کچھ خوبصورتی کے ہارے میں اس کے تصورات تھے وہ سب بکمال و تمام اس جسمے میں جھلکنے لگے۔ پھر اس کے نزدیک تعجب اور حیرانی کی بات یہ بھی تھی کہ اس کی شکل مجموعی طور پر درخشندہ سے بے حد ملتی تھی بس فرق یہ تھا کہ درخشندہ کی آنکھیں سرمئی تھیں اور جسمے کی نلی۔ درخشندہ کے بال بھورے رنگ کے تھے اور

سیارہ ذالحجست کی حسب روایت ایک اور عظیم پیشکش

والدین نمبر شائع ہو گیا ہے۔

ایک تاریخی دستاویز جو انشاء اللہ یقیناً ہر گھر کی کامیابی اور فلاح کا ذریعہ بنے گی۔ جس میں قرآن اور احادیث صحیحہ کی روشنی میں: والدین کے فضائل، آداب، حقوق، فرائض اور ان کے شایان شان مستند مواد اور محکم استنباط پر مبنی واقعات اور دیگر مواد کو یکجا کر دیا گیا ہے۔

خود بھی پڑھیے اور دوسروں کو بھی پڑھائیے ہر گھر میں پیار و محبت کی تحریک کا آغاز کیجیے

سیارہ ذالحجست - 240 مین ماریٹ روڈ لاہور 042-37245412

سیارہ ذابجٹ / اپریل ۲۰۱۶ء

کرتی نظر آئیں ایک لڑکی اس کی طرف اٹکی سے اشارہ کر رہی تھی وہ یہ منظر دیکھ کر انگارے کی طرح سرخ ہو گیا۔ وہ دسپے پاؤں وہاں سے ہٹ کر ایک طرف کو ہو گیا۔ بلا ارادہ اس کے قدم اٹھے اور دل دھڑکنے لگا۔ گھبراہٹ میں اسے راستہ بھی سمجھائی نہیں دے رہا تھا۔ مجھے کی حراکیز مسکراہٹ لگا ہوں سے دور نہ ہوتی تھی اسے یہ خوف تھا کہ کہیں کوئی شخص پہل کر کے اسے خرید کر نہ لے جائے ساتھ ساتھ وہ حیران بھی تھا کہ آخر لوگ مجھے کی طرف سے بے توجہ کیوں گزر جاتے ہیں کہیں یہ دھوکہ تو نہیں ہر چند کہ وہ جانتا تھا یہ غیر طبی رخت ہے۔

آج پہلی بار اسے محسوس ہوا کہ اس کی زندگی اندھیروں کی یلغار میں گزری ہے۔ اسے اپنی مختصر درخشندہ سے بالکل لگاؤ نہ تھا وہ کبھی اپنی ماں کی خاطر اس سے منہ دیکھے کی محبت کرتا تھا۔ یورپی لڑکیوں کے بارے میں وہ جانتا تھا کہ ان سے قربت پیدا کرنا آسان کام نہیں ہے۔ رقص و موسیقی، میل ملاپ بڑھانے، دوڑ دھوپ، بزم آرائی، نت نئے فیشن کے لباس پہننے، حلق اور خوشامد سے وہ طبعاً نفرت کرتا تھا۔ اس کے علاوہ ہر قدم پر شرم مانع ہوتی تھی۔ یہ مجسمہ اس کے لئے ایسا چراغ تھا جس سے اس کی زندگی کے تمام گوشے روشن ہو سکتے تھے۔ اس روشنی کے مینار کی طرح تھا جو مسکند پر اپنی مدور کرینیں بکھیر رہی تھی۔ کیا وہ واقعی سادہ لوح تھا؟ کیا وہ نہیں جانتا کہ اس کی یہ ترنا لوگوں کی تمنائوں سے مختلف ہے۔ لوگ سن پائیں گے تو کیا کیا مذاق نہ ہوگا۔ اسے معلوم تھا یہ مجسمہ مٹی پر رنگ و روغن کر کے مصنوعی بالوں سے سجا کر کھڑا کر دیا گیا ہے۔ بالکل ایک گڑیا کی مانند جس سے بچے کھیلنے ہیں ایسی گڑیا جو نہ بات کر سکے نہ جسم گرمائے نہ جس کے چہرے پر کوئی تغیر پیدا ہو.....!

مجھے کے سیاہ اور گھونگرے بالے، درخشندہ عینکین اور مرجھائی سی رہتی تھی اور مجھے کی داغی مسکراہٹ خوشیاں بکھیرتی تھی اور ہزار طرح مہر داد کے جذبات ابھارتی تھی۔

مجھے کے پاؤں کے قریب کارڈ بورڈ پر چسپاں ایک تحریر لگی تھی جس پر لکھا تھا..... "تین سو پچاس فرانک" مگر کیا ساڑھے تین سو فرانک میں اسے یہ جسم مل بھی جائے گا؟ وہ تو اس کے لئے سب کچھ بچھاؤ کرنے کو تیار ہے۔ اس کی خاطر اسے اگر تن کے کپڑے بھی دینے پڑیں تو اسے عذر نہ ہوگا کسی بھی قیمت پر سہمی بس مجسمہ اسے مل جائے۔ وہ دیر تک اسے تنکٹا رہا کیا ایک اسے خیال آیا کہیں لوگ اسے یوں دیکھ کر مذاق تو نہ اڑا رہے ہوں گے؟ مگر وہ کیا کرنے مجھے کو دیکھتے رہنے سے طبیعت سیر بھی تو نہ ہوتی تھی۔ معاملہ اس کے اختیار سے باہر ہو چکا تھا۔ کسکو کی سیر کا خیال اس نے ترک کر دیا۔ اسے یوں محسوس ہوا کہ بغیر اس مجسمے کے یہ زندگی واہیات ہے زندگی کے کچھ متنی ہو سکتے ہیں تو وہ راز مجھے میں پوشیدہ ہے۔ کاش اسے یہ مل جائے کاش یہ ہمیشہ کے لئے اس کا ہو جائے.....!

اچانک اس کی توجہ ان زنانہ کپڑوں کی طرف مبذول ہوئی جو مجھے کے ارد گرد چھ ہوئے تھے۔ اس کو اپنا وہاں کھڑا رہنا بے سبب لگا۔ اسے لگان گزرا لوگ اسے گھور گھور کر دیکھ رہے ہیں لیکن ہمت نہ ہوتی تھی کہ دکان میں داخل ہو کر سودا چکا لے۔ کاش! ایسا ممکن ہوتا کہ کوئی چوری جیسے مجسمہ اس کے ہاتھ فروخت کر دیتا۔ وہ چپ چاپ دام چکا دیتا اور مجبور نہ ہوتا کہ سب کے سامنے معاملہ کرے عمر بھر وہ اس شخص کا احسان مند رہتا۔

شوکیں میں لگے ہوئے شیشوں میں سے اس نے دکان کے اندر غور سے دیکھا تو دو لڑکیاں بائیں

سیارہ ذابجٹ / اپریل ۲۰۱۶ء

عجیب صورتیں ایک ایک کر کے گزر رہی تھیں۔ بندرگاہ کے قریب پہنچ کر اسے مرطوب اور ٹھنڈی ہوا میں پھلی کے تیل کی سی بو محسوس ہونے لگی۔ اس ہنگامہ خیزی اور شور شرابے کے درمیان بڑے بڑے جہاز چھوٹی کشتیاں بادبان لہراتے ہوئے بھرے چور لٹکتے اور حضرت آدم کی نسل کے رنگا رنگ نمونے نظر آتے اور ایسے ایسے قزاق بھی کہ آنکھوں سے سرمہ چرائیں۔

مہر داد نے کوٹ کے بٹن کھولے رومال سے سینہ صاف کیا اور دور مسند کے کنارے جہاں بندہ بنا ہوا تھا پہنچ گیا۔ اس کے سامنے ایک بڑا سمندری جہاز لنگر انداز ہوا جس میں لگے ہوئے ققبوں کی روشنی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی یہ جہاز کیا تھا ایک چھوٹی سی دنیا تھی۔ ایک رواں دواں شہر تھا جو سمندر کا سینہ چرتا ہوا دور دراز ملکوں کے ہشاش بشاش اور ہنس کھ لوگوں کو جو عجیب عجیب زبانیں بولتے تھے بندرگاہ پر اتار رہا تھا۔ ایک ایک کر کے انکی نظروں کے سامنے سے یہ لوگ گزرنے لگے وہ عورتوں کے میک اپ کے ہوئے چہروں کو دیکھتا اور پھر دل ہی دل میں کہتا کیا سچ بھی وہ ہستیاں ہیں جنہوں نے مردوں کے دل فکار کر کے انہیں اپنا فریفتہ اور دیوانہ بنا رکھا ہے۔ کیا یہ شوکیں میں سچے ہوئے مجسمے جیسے مجسمے نہیں ہیں؟..... اس کی نظر میں وہ سب کے سب محض تصنع اور بھوکہ کی سوا کچھ اور نہ تھے۔ اس لئے اس نے خود کو گہری دلدل میں پھنسا ہوا محسوس کیا اور نکلنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے لگا اسے ہر چیز مذاق معلوم ہو رہی تھی حتیٰ کہ وہ جوان جوڑا بھی جو بائیں میں بائیں ڈالے بند کے نزدیک بیٹھا تھا۔ جو کچھ اس نے اب تک بڑھا تھا مذاق تھا ایک کھیل ایک تماشا تھا اگر دنیا میں کہیں کچھ حقیقت تھی تو شو کیں کا وہ مجسمہ تھا۔

لڑکی تو وہ صفات تھیں جن کے لئے مہر داد اپنا فریفتہ تھا۔ وہ ایسے انسان سے جو بائیں میں کی رنگوں میں لہو دوڑے جو اس کی مرضی بائیں ہی کرے اور اختلاف بھی جو اس کے بائیں میں تحریک پیدا کرے خوف کھاتا تھا یہی لگاؤ وہاں اس کے گہرے زندگی سمجھنے لگا تھا شاید اس لہجہ زدہ نہ رہ سکے۔ لیکن سوال یہ تھا کہ انہیں سو فرانک میں وہ اسے پا بھی سکے گا؟

ناکیر ادھر ادھر چارہ پتے تھے اور وہ ان کے ہاتھ حیران و ششدر ایک جتنی شش کش میں چلا آیا۔ اب نہ اسے کسی سے راستے میں ملنے کا پتہ نہ کسی گھر کا نہ کسی چیز کی طرف اس کی نظریں پائیں وہ ایک بے روح ڈھانچے کی طرح بے لوجہ لگا رہا تھا۔ گویا شیطان نے اس کی روح پر دجالیاں ہو چلتے چلتے بے ارادہ اس کی نظریں ایک بات پر پڑیں وہ اس کے پیچھے ہولیا۔ عورت کر کے بڑے ہو کر سن چیک سڑیل میں مڑ گئی۔ یہ کوچہ ان تک تھا اور خوفناک دکھائی دیتا تھا۔ اونچی اونچی گزریں سے سیاہ عمارتیں دو روی دور تک چلی گئی تھیں۔ وہ ایک مکان میں چلی گئی جس کی کھلی ہوئی لڑکی سے رقص و موسیقی کی تائیں باہر فضا میں لٹائی پیدا کر رہی تھیں۔ گراموفون ریکارڈ رن رہا تھا دایک پرسوز آواز دھوئوں کے ساتھ مل کر عجیب بہت پیدا کر رہی تھی۔ مہر داد اس وقت تک وہاں کھڑا جب تک ریکارڈ خاموش نہ ہو گیا کوئی کیا لے اس ساز میں کیا جاوہ بھرا تھا۔ وہ عورت کون لگا ہوں گئی اور وہ خود اس کے پیچھے پیچھے لگا چلا گیا؟..... اس کے قدم پھر راستے لے گئے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے سے لڑکے چھوٹے قہوہ خانے، معولی درجے کے لڑکے خالوں کی سرخ جیاں اور لوگوں کی عجیب

سیارہ ذابجٹ / اپریل ۲۰۱۶ء

”کیوں محترم مجسمہ آپ کو چاہئے؟ دیکھئے ہم پیشہ ہونے کی وجہ سے یہ مجسمہ میں آپ کو جوں کا توں پائیس سو فرانک میں دے دوں گا یعنی نو سو فرانک کم لاگت پر۔ میں نے اسے ستائیس سو پچاس فرانک دے کر اپنے لئے بیویا تھا۔“

”ساڑھے تین سو فرانک اس کے لباس پر خرچ ہوا ہے یہ حسین ترین شاہکار خالص چینی مٹی سے تیار ہوا ہے۔ قابل تحسین ہیں آپ معلوم ہوتا ہے فن کے قدر شناس ہیں، مشہور فن کار دو کروڑے بنایا ہے اسے۔ اب چونکہ ہمارا خیال ایک جدید طرز کا مجسمہ بنوانے کا ہے اس لئے نقصان سے آپ کے ہاتھ فروخت کر رہے ہیں اور یہ صرف آپ کے لئے ہے ورنہ عموماً دکان کا اثاثہ ہم کسی گاہک کے ہاتھ نہیں بیچتے۔ یہ بھی عرض کر دوں کہ آپ کی خاطر ہم اسے ایک خوبصورت بکس میں پیک کر کے دیں گے۔“

مہر داد کے پاؤں کے نیچے سے زمین کھل گئی۔ اس تفصیلی گفتگو اور مالک دکان کی شفیقتانہ وجہ کے بعد مجسمہ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے۔ بجائے کچھ جواب دینے کے اس نے جیب سے بیڑہ نکالا دو نوٹ ہزار ہزار فرانک کے اور ایک نوٹ پانچ سو فرانک کا مالک دکان کے سپرد کیا اور تین سو فرانک واپس وصول کئے مگر سوال یہ تھا کہ کیا وہ ان بچہ تین سو فرانک میں ایک ماہ گزار بھی سکے گا غیر یہ کوئی اتنی اہم بات نہ تھی کیونکہ بالآخر وہ اپنی تکمیل آرزو کی منزل کو پہنچ چکا تھا۔

اس واقعہ کے پانچ ماہ بعد مہر داد تین سوٹ کیس اور ایک بڑا سا بکس تابوت کی شکل کا لے کر تہران پہنچا۔ لیکن گھر بھر کے لئے جو چیز حیرت کا باعث تھی یہ تھی کہ درخشندہ سے وہ شخص رسمی طور پر ملا اور وہ اس کے لئے کوئی تحفہ بھی نہیں لایا تھا۔ چوتھے دن اس کی ماں نے اسے بلایا اور قدر سے فرمائش کی اسے ڈانٹا

وہ فوراً پلٹا، تیز تیز قدموں سے لوگوں کے درمیان سے گزرتا ہوا سیدھا اسی دکان پر پہنچا اور دیکھتے ہی اس نے مجسمے کو دیکھا جو بدستور اپنی جگہ پر موجود تھا۔ وہ دل کڑا کر کے دکان میں داخل ہو گیا۔ ایک لڑکی سیاہ لباس پر سفید بیٹ باندھے اور مصنوعی مسکراہٹ نکھیرتی ہوئی آگے بڑھی اور پوچھا۔

”فرمائیے جناب! کیا چاہئے؟“

مہر داد نے شوکیس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ”یہ مجسمہ“ ”اچھا! تو کریم کلر کا لباس چاہئے آپ کو؟“ ”لڑکی نے کہا.....“ ”ویسے ہمارے پاس اور بھی بہت سے رنگ ہیں ذرا ایک منٹ اجازت دیں ہماری ملازم لڑکی اسے خود پہن کر بتائے گی آپ کو۔“ ”تھیں آپ کی معیت پر فرمائش کی ہوگی تو یہی رنگ چاہئے نا آپ کو؟“ ”جی معاف کیجئے، مجسمہ چاہئے مجھے کو۔“

..... ”مجسمہ؟ کیسا مجسمہ؟ میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔“

مہر داد سمجھ تو گیا کہ اس نے نہایت نامناسب فرمائش کر دی ہے لیکن خود کو سنبھالتے ہوئے بولا۔..... ”جی ہاں! مجسمہ اسی طرح اسی لباس کے ساتھ چونکہ میں ایک غیر ملکی ہوں میری درزی کی دکان ہے یہ مجسمہ مجھے اسی حالت میں چاہئے۔“

..... ”آف! یہ تو بہت مشکل ہے۔“ ”لڑکی نے کہا.....“

..... ”اس کے لئے تو مالک سے اجازت لینا ہوگی۔“

پھر اس نے ایک عورت کو مخاطب کر کے کہا.....

سوزاں! دوڑ کر ذرا موسیو ٹون کو بلا لا.....“

..... ”مہر داد وہاں سے بہت کرشمے کی طرف بڑھا۔ اسنے میں موسیو ٹون بھی آگیا۔ لیکن رنگ کی ڈاؤنچی، مھکا قد سیاہ لباس، طلائی جیب سے گھڑی کی زنجیر لٹکائے..... ایک دو ہاتھ لڑکیوں سے کر کے مہر داد کی طرف آیا اور پوچھا:

سیارہ ذابجٹ / اپریل ۲۰۱۶ء

عشق تھا اور یہی جان آرزو۔

کچھ دنوں میں گھر کے تمام افراد اور خصوصاً درخشندہ نے نظرا مجسمے کا نام ”پردہ ظلم گریا“ رکھ دیا تھا۔ مہر داد کی ماں نے اسے آزمانے کے لئے کئی بار مجبور کیا کہ وہ مجسمے کو فروخت کر دے اور اس کا لباس تحفے کے طور پر درخشندہ کو دے دے لیکن ہر بار مہر داد نے ماں کی خواہش کو نظر انداز کر دیا۔ دوسری طرف درخشندہ نے مہر داد کا دل چیتنے کی خاطر اس کے ذوق و شوق کا سراغ مجسمے کے مطالعہ سے پایا۔ درخشندہ نے اپنے ہال مجسمے کی طرز پر موٹو گھڑیاں بنائے کریم کلر کا لباس مجسمے کے لباس کے عین مطابق سلوایا یہاں تک کہ جوتا بھی اس فیشن کا تیار کر پایا۔ دن میں جب مہر داد گھر سے باہر چلا جاتا تو درخشندہ اس کے کمرے میں داخل ہوتی آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر مجسمے کی نقل کرتی۔ اسی طرح ایک ہاتھ کر پر رکھتی گردن نیڑی اور ہونٹوں پر مسکراہٹ پیدا کرتی خاص طور پر آنکھوں کی وہ دلربا کیفیت پیدا کرتی جو بیک وقت انسان کو بھی سکے اور خلاء کو بھی مگھورے۔ وہ دراصل مجسمے کی روح بن کر مکمل طور پر اس کی تقلید کرنا چاہتی تھی۔ مجسمے سے اس کی ہم شبیہ ہونے نے اس کی مشکل کو اور بھی آسان کر دیا تھا۔ درخشندہ گفتگوں مجسمے کی ایک ایک بات پر کسی بدن کی جزئیات سے متاثر نہ ہوتی اور پوری کوشش کرتی کہ خود کو مجسمے کی شکل میں ڈھال دے۔

مہر داد جب گھر میں داخل ہوتا تو وہ بڑی ہوشیاری اور ناز و انداز سے اسے اپنی طرف متوجہ کرتی لیکن شروع شروع میں اس کی ساری کوششیں بیکار ثابت ہوئیں۔ اور مہر داد اسے بھی خاطر میں نہ لاتا۔ وہ متوازی اسے ترغیب اور شوق دلاتی رہی یہاں تک کہ وہ دن بھی آیا جب مہر داد اندرونی کشش کا شکار ہو گیا۔ وہ دن رات سوچنے لگا کہ کس کی محبت

اگرچہ سال کی مدت میں درخشندہ اس کی آمد کی آواز لگنے لگی رہی ہے کتنے ہی رشتے آئے لیکن لاپتے گئے ظاہر ہے اس کی مجبوری تھی کیونکہ اسے درخشندہ کی کوٹھی بھونکا کر لانا ہے۔

مہر داد ماں کی باتیں ٹھنڈے دل سے سنتا رہا

..... ”اے امیر! ارادہ بدل گیا ہے میں نے طے کر لیا ہے کہ میں شادی نہیں کروں گا۔“ بیٹے کا جواب سن کر لڑکھنوت رخ ہوا اور وہ مجسمہ کی کراس کا بیٹا اب پلے دلا فرماں بردار مہر داد نہیں رہا۔ بیٹے کے اخلاق و اطوار پر یہ دھبہ ماں کے نزدیک کفار کی معاشرت کا چھوٹا بہت دنوں تک خاندان میں اس کی عادات اور چال چلن پر غور ہوتا رہا مگر کوئی ایسی بات محسوس نہ ہوئی جس سے تبدیلی کا افراہم درست ثابت ہوتا۔

وہ ویسے کا ویسا ہی ڈروپک اور شرمیلا تھا۔ اس کی عمر ابھی کی لیکن اس کی عاشقانہ روش کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ گھر والوں کو اس کے چال چلن پر جو شک تھا اس کا واحد سبب یہ تھا کہ اس نے اپنے کمرے میں ایک عورت کا مجسمہ رکھ چھوڑا تھا۔ وہ کریم کلر کا لباس زیب تن کئے ہوئے ایک ہاتھ کر پر رکھے اور دوسرا برابر میں گرائے ہوئے گھڑی ہے اور ہونٹوں سے مسکراہٹ کے پھول نکھر رہے ہیں۔ ایک مقش پردہ اس کے آگے آویزاں ہے۔ رات گئے جب مہر داد گھر لوٹا وہ اندر سے کمرے کا دروازہ بند کر لیتا، مگر اسون ریکارڈ بجاتا اور مجسمے کے سامنے سے پردہ ہٹا کر ایک چھوٹی سی بیچ پر اس کے دروبرو ڈھکاتا اور گفتگوں اس کے حسن و جمال کے نظارے میں غور ہوتا۔ جب غور ہو جاتا تو اپنی جگہ سے اٹھ کر زنا آگے بڑھتا اس کی زانوں میں انگلیاں پھیرتا اور پیار سے اس کے گلے میں بائیں ڈال دیتا۔ اس کی ساری عاشقانہ زندگی کا محور بھی مجسمہ تھا یہی مظہر

حضرت سلطان باہو

پروفیسر غلام رسول



سلطان باہو کی قبرستان، لاہور

علاقے کی فضا پر جگ کے بادل منڈلاتے صاف نظر آ رہے تھے۔ بظاہر دونوں سکوتوں کے مابین صلہ جوئی کے لئے کامدوں اور الجھنوں کی آمدورفت جاری تھی مگر وقت کا ہر لمحہ ایک خوریز جنگ کی ست پیش رفت ظاہر کر رہا تھا۔

مرث کا رعبہ درانہ اپنے دربار میں بیٹھا

گیارہویں صدی ہجری کا زمانہ تھا۔ سلطنت اہلستان کی مسند پر مغلیہ فرماں روا شاہجہاں جلوہ افروز تھا۔ مہمان سلطنت دلی کا ہی ایک حصہ تھا۔ ان کے باغ اور مرث کے رعبہ کے درمیان یکا نیر لگ کر گن کے مسئلے پر اختلافات پیدا ہو گئے اور یہ اختلافات آتی شدت سے ابھر کر سامنے آئے کہ

ایک رات مہر داد شراب میں دھت ہوش سے بے گانہ معمول سے زیادہ دیر کر کے اپنے کمرے میں داخل ہوا۔ روشنی کی منقش پردہ ہٹایا، شراب کے دو گلاس لبالب کر کے پئے اور گرامفون ریکارڈ بجنے لگا وہ خود بیچ پر جا کر بیٹھ گیا اور مجسمے کی طرف ٹھٹکی بانٹھ کر دیکھنے لگا۔

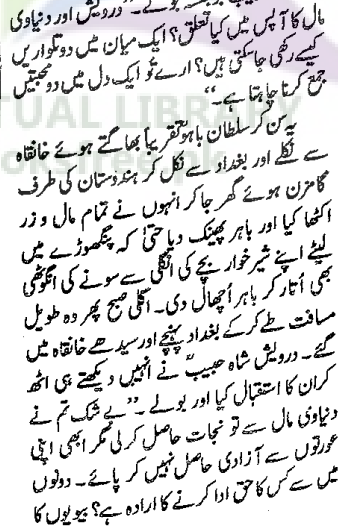
مہر داد عرصہ دراز سے مجسمے کو دیکھتا چلا آ رہا تھا مگر حقیقتاً وہ دیکھتا کب تھا مجسمے کی شکل خود بخود اس کے ذہن پر منقش ہو جاتی تھی۔ وہ عادتاً اس شکل کو دہراتا تھا۔ دیر تک دیکھنے کے بعد وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور مجسمے کے نزدیک پہنچ کر اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔ پھر اس نے اپنی ہاتھیں اس کے گلے میں ڈال دیں مگر..... کیا ایک اس نے ایک جھٹکے کے ساتھ ہاتھ کھینچ لئے پیسے اس نے پھٹکا لوبا چھو لیا ہو۔ وہ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگا..... کیا وہ خواب تو نہیں دیکھ رہا، بدحواسی میں تو جیتا نہیں.....؟ اس نے مجسمے کے جسم پر جو حرارت اور چمک محسوس کی، کیا واقعی وہ حقیقت پر مبنی تھی..... کہیں آج وہ زیادہ تو نہیں پی گیا؟ اس نے آستین سے اپنی آنکھیں ملیں اور پریشان خیالات کو جمع کرنے لگا۔

اور پھر..... مجسمہ ایک ہاتھ کر پر رکھے ہوئے ہنستا ہوا اس کی طرف بڑھتا چلا آیا، مہر داد یہ منظر دیکھ کر دیوانہ وار وہاں سے بھاگنا چاہتا تھا کہ بے اختیار اس کا ہاتھ چلون کی جیب میں چھپائے ہوئے ریوالتور کی طرف گیا..... ریوالتور سے تین گولیاں مجسمے کے سینے سے پار ہو گئیں فضا میں ایک چمچ بلند ہوئی مجسمہ زمین پر سر کے بل پڑا تھا مہر داد گھبرا کر مجسمے پر چھکا، اس کا سر اٹھا کر ٹھٹکوں پر رکھا..... مگر یہ مجسمہ نہیں تھا یہ تو درخشندہ تھی۔ جو خون میں لت پت ہے جان پڑی تھی۔

سے کنارہ کشی اختیار کرے؟..... درخشندہ سے، کہ بیچاری اتنی مدت اس کے انتظار میں غیر متزلزل ارادے کے ساتھ اس کی راہ دیکھتی رہی ہے بلاشبہ اسکا یہ جذبہ ایثار تحمیں کے لائق ہے یا اس مجسمے سے کہ جس کی چمک دکھ ماند پڑ چکی ہے اور لباس کا رنگ بھی اڑ گیا ہے اور اب یہ مجسمہ اس کے عشق و جوانی اور بد نصیبی کی منہ پوئی تصویر تھا۔ پانچ سال سے وہ اپنے جذبات اور احساسات کو اس بے چارے موہوم ڈھانچے کی محبت میں فریب دیتا رہا۔ پھر درخشندہ نے تو اس کی جدائی کے صدمے برداشت کے صبر کی آزمائشوں سے گزری خود کو اس کے اپنے ذوق اور پسند سے ہم آہنگ کرنے کے لئے کیا کیا نہ جتن کئے۔ وہ کسے اٹھائے اور کسے چھوڑے؟ لیکن وہ آسانی سے مجسمے کی محبت سے دست بردار نہ ہو سکے گا کیونکہ وہ اس کے عشق کا مظہر تھا، وہ اس کے دل کی گہرائیوں میں جگہ پا گیا تھا..... آف کیا فریب تھا یہ کیا مذاق تھا!

یہ ایک اس میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی، نہیں! نہیں یہ مٹی اور مصنوعی بالوں کا مجسمہ نہیں بالکل جیتا جاگتا انسان ہے۔ دوسرے انسانوں کے مقابلے میں ایک محسوس حقیقت، کیا وہ اسے کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دے؟ کسی کے حوالے کر دے یا پھر سے شوکیس کی زینت بنا دے تاکہ ہر کس و ناکس اس کے حسن کا جائزہ لے اور یہ ہونٹ جسے اس نے پیار کیا.....!! نہیں! نہیں! وہ یہ بھی برداشت نہیں کرے گا اور یہ گردن جس میں مدتوں اس کی ہاتھیں حاصل رہی ہیں، بھلا اس کے ساتھ کوئی دوسرا ظلم کر سکتا ہے..... اس نے سوچا میں اسے اپنے ہاتھ سے شتم کروں گا، مہر داد نے اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ایک ریوالتور بھی خرید لیا لیکن ہر بار وہ ارادہ کرتا اور توڑ دیتا۔

مکان کی چون لے، جو کہ مروٹ کی جانب پیش قدمی کر رہی تھی جب ایک تیز رفتار گھڑ سوار کو ہاتھ میں آسانی سر تھا سے اپنی طرف تیزی سے بڑھتے دیکھا تو ٹھٹھک کر وہیں ٹک گئی۔ سوار نے نزدیک پہنچ کر راجہ کا کتلا سرستان کے ناظم کے قدموں میں ڈال دیا جو لشکر کے سردار ہی تھا۔ ناظم سمیت پورے لشکر پر راجہ کا کتلا سر دیکھ کر حیرت خاں ہو گئی اور وہ سخت بدگمان ہو کر بھی دندان کا سر دیکھتے اور بھی اپنے سامنے کھڑے اس لوجوان سوار کو دیکھتے۔ سنا مٹائی لشکر کہتے کی اس عارضی کیفیت سے ٹکرا اور فوج کے پندروہ نعروں سے اپنی مسرت کا اظہار کرنے لگا۔ وہ لوجوان جس نے راجہ وارانہ کا سر کاٹ کر غیر معمولی شہرت حاصل کی لشکر کے لئے انجی نہ تھا۔ وہ ایک کہنہ مشق آدمیہ کار اور جرأت مند سردار بانیہ محمد تھا۔ جو دلی سرکار کی فوج سے مفرد ہو کر روپوش تھا جس نے سلطنت دلی کی منصب داری سنبھلا کر خدا سے لوگ کی تھی لیکن اپنے اس غیر معمولی کامد سے ایک باہر محضر عام پر آ گیا تھا۔ شاہی دربار سے جہاں اس کے لئے حسین و آفرین کا پتیام



کندھے کا چرٹنا
Frozen Shoulder

2nd دورہ سائنس و ٹیکنالوجی 26 ستمبر 2013ء

حق ادا کرو گے یا خدا کا؟“

یہ سننا تھا کہ سلطان باہو بیٹا کچھ کہے آرام کے بغیر ایک بار پھر اپنے طویل سفر کے لئے تیار ہو گئے۔ منزلوں پر منزلیں سر کرتے وہ گھر پہنچے تو ماں نے اسے دیکھتے ہی پہلے اپنے پاس بٹھالیا۔ وہ ایک پرہیزگار نیک خاتون تھیں اچھی طرح جانتی تھیں کہ بیٹا آج کس نیت سے گھر داخل ہوا ہے۔ پھر بھی انجان بننے ہوئے بولیں ”کیوں سلطان..... اب کیسے آتا ہوا؟“

آپ نے نرمی سے سر جھکا کر مقصد بیان کیا۔ آپ کی والدہ ”بی بی راسی“ نے انہیں قریب بٹھالیا اور آہستگی سے مخاطب ہوئیں۔ تمہاری بیویوں کے جو حقوق تم پر ہیں آج سے تم ان سے آنے دو اور تمہارے جو حقوق بیویوں کے ڈے ہیں وہ بدستور قائم رہیں گے۔ اگر تم حقیقی معرفت کے حصول میں کامیاب ہو گئے تو بہتر ہے لیکن محض بیویوں کے حقوق پورے کرنے کی خاطر گھراؤ تو اس کی ضرورت نہیں۔ لہذا اب طلاق کا خیال بھی دل میں نہ لانا؟“

ماں کی یہ قابل قبول تجویز سن کر آپ بہت پرسکون اور مطمئن انداز میں دوبارہ بغداد کی طرف روانہ ہو گئے اور سیدھے خانقاہ پہنچے جہاں اس مرتبہ شاہ حبیبؒ نے آپ کا انتہائی پر تپاک استقبال کیا اور کامل نظر سے ان کی طرف توجہ کی۔ سلطان باہوؒ آپ کی اس توجہ سے قلبی واردات سے دوچار ہوئے۔ کچھ دیر بعد شیخ حبیب نے دریافت کیا ”سلطان! مطمئن ہے؟ کچھ مشاہدہ کیا؟“

آپ نے ادب سے سر جھکا کر کہا ”شیخ! جو کچھ مجھ پر مکشوف ہوا اس سے تو میں چمکھوڑے میں ہی آکھتا ہوں کیا تھا۔ میری تمنا اس سے زیادہ کی ہے۔“

شیخ حبیب نے جواب تو نہ دیا البتہ بیٹھے بیٹھے

سیرۃ ذابجٹ / اپریل ۲۰۱۶ء

ان کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ آپ بھی خوب سمجھتے تھے کہ یہ عمل مقصد امتحان ہی ہے چنانچہ آپ بھی صحت ان کے تعاقب میں جا پڑے اور ایک گیت میں شیخ حبیب کو ضعیف کا شکار کی شکل میں محنت مشقت کرتے پایا۔ آپ نے نزدیک جاکر فرمایا۔ ”بابا! یہ ضعیفی اور یہ مشقت؟ آپ آرام کریں میں کام کرتا ہوں۔“ سلطان باہوؒ کو دیکھ شاہ حبیبؒ اپنے اصل روپ میں آئے اور ہنس کر انہیں ساتھ لیا اور آگے بڑھے مگر چند قدم چلنے کے بعد پھر غائب ہو گئے۔ آپ نے بھی ان کا تعاقب نہ چھوڑا اور اب کی مرتبہ انہیں ایک آبادی میں ایک بوڑھے برہمن پنڈت کی شکل میں لوگوں کو ماتھے پر تلک لگاتا پایا۔ شاہ باہوؒ مسکرا کر نوجوان کے ہمیں میں ان کے سامنے جا کھڑے ہوئے اور کہنے لگے۔

”بابا! میرا ماتھا تو خالی ہے کیا میرے یہ بھاگ نہیں کہ میرے ماتھے پر آپ تلک لگائیں۔“

دوسرے ہی لمحے شیخ حبیب اپنی اصل صورت میں شاہ باہوؒ کے سامنے کھڑے مسکرا رہے تھے۔ انہوں نے سلطان باہوؒ کا ہاتھ تھاما اور آگے بڑھ گئے لیکن تیسری مرتبہ پھر وہی حرکت کی اور دھکے دے کر اوجھل ہو گئے۔ سلطان باہوؒ کہاں پہنچا چھوڑنے والوں میں سے تھے۔ آپ بھی خراماں خراماں ان کے پیچھے لپکے اور ایک مسجد میں انہیں جادو سونپا جہاں شیخ حبیبؒ مہرامام مسجد کے روپ میں بچوں کو قرآنی تعلیم دے رہے تھے۔ چنانچہ سلطان باہوؒ بھی صحت سے بچنے کے روپ میں قاعدہ پڑے ان کے سامنے جا بیٹھے اور ایک حرف پر اٹھ کر کھتے ہوئے مصیبت سے پوچھنے لگے۔ ”بابا! یہ کیا ہے؟“ اس بار شیخ حبیبؒ کی آنکھوں میں آنسو پھر آئے آپ کے چہرے پر جو پہلے مسکراہٹ چلتی تھی وہ اس مرتبہ غائب تھی۔ انہوں نے آپ دیدہ ہو کر سلطان باہوؒ

سیرۃ ذابجٹ / اپریل ۲۰۱۶ء

نے لگا اور کہنے لگے۔ ”بس باہو..... بہت سہجی ہیں سلطان باہوؒ نے اپنی حالت نہ بدلی۔ پھر اسی حرف پر اٹھ کر چائے پوچھنے لگا۔ ”بابا! یہ کیا ہے؟“

شیخ حبیبؒ ہنسی سے بولے۔ ”سلطان میں باہوؒ تو میرے بس کا نہیں ہے۔“ پھر انہوں نے سلطان باہوؒ کو اپنے شیخ عبدالرحمان قادریؒ کی دہانے کی ہدایت کی جو دلی میں فروکش تھے۔ سلطان باہوؒ نے اسی وقت رخت سفر باندھا۔ اور خانقاہ حلیہ اور ہندوستان..... کی طرف چل پڑے۔ ابھی دلی سے دور ہی تھے کہ ایک شخص دوڑتا آپ کے پاس آیا اور آگے بڑھ کر سلطان کے ہاتھ پر تڑپا۔ ”حضرت! اصرار چلنا ہے۔“

یہ خادم شیخ عبدالرحمان قادریؒ کا بیٹا ہوا تھا۔ انہوں نے مراقبہ میں سلطان باہوؒ کو اپنی طرف آتا دیکھا تھا چنانچہ انہوں نے ایک خادم کو آپ کی رہائی کے لئے روانہ کر دیا جیسے ہی خادم کی صحبت میں سلطان باہوؒ شیخ عبدالرحمان کے رو برو پہنچے تو شیخ نے کچھ کہے انہیں تجھنے میں لے گئے اور ایک گھر پور گاہر کوڑی۔ ان کی نگاہ میں ایک عجیب سی تاشمعی اور اس سے سلطان کو وہ سب کچھ حاصل ہو گیا جس کی پاد میں وہ برسوں سے خاک چھاتے پھر رہے تھے۔ جس نعمت کے لئے وہ درود سر کر رہے تھے۔ وہ بیکو ایک لمحے میں ان پر مکشوف ہو گیا۔ اسرار و کرامت اس قدر ان کی آنکھوں میں اتر گیا۔ شیخ کی ان ایک نگاہ نے سلطان باہوؒ کو غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک بنا دیا۔ فیض رسانی کی اس غیر معمولی استعداد کے حصول کے بعد سلطان باہوؒ چلے چلے ہائے مسجد کے سامنے جا بیٹھے۔ جود کہ روز تھا۔

”بابا! ہمیں کیوں اس نعمت سے محروم رکھا۔“

سلطان باہوؒ نے جواب دیا۔ ”بارگشت میں مکن اور صحرائیں خاردار پودے آگے ہیں تو اس میں بارش کو دوش نہیں دیا جاتا۔ میں نے سب پر یکساں توجہ دی تم سخت دل ہو تم پر اثر نہیں ہوا تو میرا کیا قصور؟“

انہوں نے عاجزی سے درخواست کی کہ ہمیں اس لذت سے محروم نہ رکھیں چنانچہ آپ نے ان کی استدعا قبول کی اور ان پر نظر کر ڈالی۔

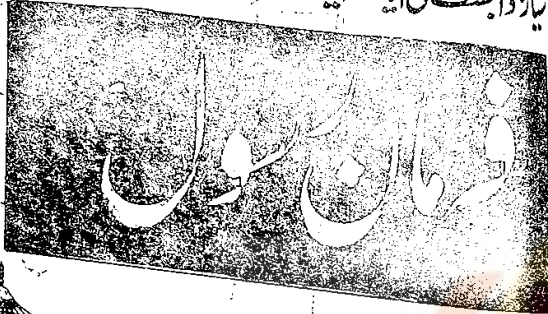
یہاں سے قاریغ ہو کر سلطان باہوؒ بازاروں میں جانے لگے اور خلعت پر توجہ صرف کی۔ نتیجتاً شہر میں ایک ہنگامہ ساج کیا کسی نے دوڑ کر شیخ عبدالرحمان کو آگاہ کیا کہ ایک ولی بازار میں لوگوں کو دھند دھال میں جلا کر پھر رہا ہے۔

انہیں اس کا اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ ولی کون ہو سکتا ہے چنانچہ انہوں نے سلطان باہوؒ کو بلا کر رنجیدہ اور ملول سے لمحے میں کہا۔ ”بابا! کیا ہماری ولی نعمت کو اس طرح عام کرتا پھر رہا ہے۔“

سلطان باہوؒ نے احترام سے سر جھکائے کہا۔ ”شیخ! کوئی عورت بازار سے تو ابھی خریدے تو

عاشقانِ رسولؐ کی خدمت میں

یادِ اوست کی ایک ایمان افروز دلکش اور روح پرورش کش



شائع ہو گیا ہے



اللہ کے آخری پیغمبرؐ کے ارشادات گرامی کا ایک ایک زریں نورافشاں و مقدس
لفظ جو عالم انسانیت کی ظاہری اور باطنی زندگیوں کی مکمل فلاح کا باعث ہے

240 میں مارکیٹ رپوز کارٹن لا سو۔
فون نمبر = 37245419

دوبارہ زمین پر جو مارا تو زمین پر مٹی کے ڈھیلے سونے کے بن گئے وہ شخص حیرت و استعجاب سے یہ دیکھ کر مٹک رہ گیا۔ آپؐ نے فرمایا لے جتنا ضرورت ہے لے جا وہ شخص فوراً اپنے ساتھیوں کو بلا لایا اور گھوڑوں پر سونا لاد کر وہاں سے رخصت ہوا۔

سلطان باہو کو دنیاوی دولت سے کس قدر نفرت تھی اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے ہوتا ہے۔ ایک دن آپؐ ریت پر لیٹے سر اپنے ایک مرید کے زانوں پر رکھے سو رہے تھے۔ ریت پر سونے سے ان کا لباس اور جسم خاک آلود ہو گیا۔ مرید نے جو مرشد کو اس حال میں دیکھا تو دل ہی دل میں تاسف کا اظہار کرتے ہوئے سوچنے لگا کہ کاش میرے پاس زرد جوہر ہوتے تو آج اپنے پیرو کو یوں زمین پر نہ سلاتا۔

سلطان باہو نے اس کے زانوں سے سراٹھا کر پوچھا۔ ”کیا سوچ رہے ہو؟“ مرید نے جو محسوس کیا تھا اور پھر جو سوچا تھا سب آپؐ کو کہہ سنایا۔ آپؐ نے مسکرا کر اسے دیکھا اور کہا۔ ”ذرا آنکھیں تو بند کر۔“ مرید نے حکم کی تعمیل کی تو کیا دیکھتا ہے ایک باغ جے مش ہے ہر سو کھیتی فضا ہے اور ایک حسین و جمیل لڑکی جو اہرات میں لدی چھندی اس سے کہہ رہی ہے۔ ”مجھ سے نکاح کرلو۔“ مرید نے دھیمے لہجے میں کہا ”ذور رہو کبھت کیوں مجھے مرشد کی نظروں سے گرانا چاہتی ہے۔“ اور پھر اس کی آنکھیں خود بخود کھل گئیں اور پلکیں شرم سے جھک گئیں۔ آپؐ نے مسکراتے ہوئے اس سے پوچھا۔ ”کیا دیکھ رہا تھا؟“ مرید نے سب حال کہہ سنایا۔ آپؐ نے پوری بات سننے کے بعد کہا۔ ”تو کیسا ہے رہے ابھی تو دولت کی طمع کر رہا تھا۔ وہ دنیا ہی تو تھی تو نے اسے ہی ٹھکرادیا۔“ مرید نے سر جھکائے کہا ”مرشد خادم زرد جوہر کا نہیں تھر کا خواہش مند ہے۔“ آپؐ

ٹھوٹھک بجا کر دیکھ لیتی ہے۔ کوئی لڑکا کمان خریدے تو کھینچ کر لپک ضرور دیکھتا ہے پھر میں کس طرح آپؐ سے حاصل کی نعمت کو نہ آزماؤں؟“

شیخ عبدالرحمان سلطان کی یہ دلیل سن کر مسکرا پڑے اور کہنے لگے۔ ”باہو! میں تجھے منع نہیں کرتا مگر اس کا خیال رکھا کر کہ ہر شخص اس کا تحمل نہیں ہو سکتا اب تو وطن واپس جا اور رشد و ہدایت کا کام سنبھال۔“

ایک طویل عرصہ کے بعد شیخ سلطان باہو واپس لوٹے اور تیج و تلقین کا سلسلہ شروع کر دیا۔ خانقاہ درویشوں سے بھری رہتی لنگر خانے کا انتظام بی بی راتی نے سنبھال لیا۔ راہوں سے بچکے بد نصیب افراد آتے آتے آنکھوں میں مشعلیں روشن کر کے خانقاہ سے لوٹتے۔

سلطان باہو نے آبائی جاگیر سے ایک چٹان تک کبھی نہ لیا۔ ضروریات زندگی کی خاطر بیلوں کی جوڑی خرید کر کاشتکاری شروع کر دی مگر فضل کاٹنے سے پہلے ہی اسے دوسروں کے لئے چھوڑ دیا روکھی سوکھی کھا کر اور موٹا لباس پہن کر گزارا کرتے۔

ایک دن شو کوٹ کے آس پاس کارہائی تلاش رہیں آپؐ کی خدمت میں مالی امداد کی خاطر حاضر ہوا لیکن اس نے جب آپؐ کو یوں محنت مزدوری کرتے پایا تو مایوس ہو کر واپس چلا کہ یہ شخص بھلا اس کی کیا مدد کر پائے گا۔ ابھی وہ مڑا ہی تھا کہ اچانک پشت سے نام لکھ کسی نے پکارا۔ وہ شخص حیرت زدہ ہو کر چلا تو حضرت باہو اشارے سے بلا رہے تھے دل میں امید کی کرن چمکی تو ان کے پاس تیزی سے لپکا آپؐ نے فرمایا۔ ”کیوں رے اتنی مصیبت سہنے کے بعد ملاقات کے بنا ہی پلٹ رہا تھا۔“ اس بچارے نے جو یہ انانیت بھرا لہجہ سنا تو چٹا سناٹے لگا۔ سلطان باہو نے اسی وقت زمین سے ایک ڈھیلا اٹھا کر

اس کا سارا انکوشن اس کے پاس تھا۔ رانفل غائب تھی میں نے سنا پہلوں کو ادھر ادھر پھیل کر لاش کا محاذ کیا۔ اس کے جسم پر صرف ایک دھم خرا اور وہ ہے تھا کہ اس کی گردن چری بھاڑی ہوئی تھی۔ عجیب چیز ہے دیکھی کہ خون کا ایک قطرہ بھی زمین پر نہیں گرا تھا۔ بارش کی وجہ سے پاؤں کا کوئی نشان نہیں نظر آتا تھا۔

ہمارے جنگلوں میں ایک خولی "بلا" نے عمر کے کی حیرت انگیز زرداد

اس وقت میرے چھاونی میں تھی۔ ہم پلٹن میں پہنچے ہی تھے کہ پلٹن شمال مغربی صوبے کے قبائلی علاقے کی ایک چھاؤنی بنوں کو روانہ ہوگئی۔ بنوں پہنچے ہی تھے کہ انسانوں کا شکار شروع ہوگیا۔ یہ انسان قبائلی لوگ تھے اور وہ زمانہ 1927ء کا تھا۔ قبائلی باشندوں کا شکار بہت مشکل اور بہت ہی

ہم تو فوجی تھے جو انسانوں کا شکار کھیلنے کے لئے
 بھرتی ہوئے تھے اگرچہ نے ہمیں ٹریننگ سٹر میں
 پارے نو مہینے صرف یہ ٹریننگ دی تھی کہ انسان کا
 شکار کس طرح کھلیا جاتا ہے۔ مگر ایک ایسا موقع
 آگیا جب ایک شیر ہمارے مقابلے میں آڑ آیا۔
 ٹریننگ سٹر سے نکل کر ہم ایک پلٹن میں چلے گئے جو



ہے۔ ہر سو خوشبو کے جموں کے چلتے ہیں اور تاریک
راہروں کے پھلکے مسافر آپ کے حزار پر ہدایت کی راہ
پانے ہزاروں کی تعداد میں روزِ آنے ہیں۔ باہو
کی کو بھی محروم نہیں لٹاتے۔ سبھی آنکھوں میں
شعلیں روشن کر کے ہی واپس پھٹتے ہیں۔ یہ حقیقت
ہے کہ آپ کے فیض کا چشمہ آپ کے وصال کے
بعد بھی لوگوں کی بحاس بجھاتا رہا۔ لوگ فیض یاب
رہے مثلاً ذریعہ اسماعیل خان کے حاکم ہوتے
تھے کا واقعہ اس کی نشاندہی کرتا ہے۔ وہ حکم عمل
میں ایک خوبصورت لڑکے پر فریفتہ ہو گیا اور اس
ساتھ شادی کا ارادہ کر بیٹھا۔ لوگوں کے نصیحتیں
سننے کی خاطر اس نے مولویوں سے فتویٰ لینے کی
فراہم فرمایا۔ مولویوں نے فتویٰ دیا کہ سلطان
کے سلسلے سے تھا۔ اس نے مولانا کو روک دیا اور
اس کی دھمکی دے کر اپنے حق میں فتویٰ دینے کے
کہا لیکن وہ انتہائی بے خوفی سے کہنے لگے
"میں اب بدست شخص مرد کے لئے لڑکی سے
ملاں ہے تو لڑکے سے شادی رچانے چلا ہے
خود پر ظلم کرتا ہے حرام کام سے باز آ۔"

ہوت بلوچ کو اس جواب کی امید نہ تھی وہ غصے سے آگ بگولا ہو گیا اور آپ کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا۔ ساتھ ہی جتا دیا کہ سورج کی روشنی بھی دیکھ سکو گے جب میرے حق میں ٹوٹی دینے کے لئے خود کو آدہ پاؤ۔ مولانا نور محمد نے اسے تو کوئی جواب نہ دیا، البتہ قید خانے کے بیچ کر جہاں اللہ سے مدد مانگی وہاں بخائی میں ایک نظم فریادی لکھ کر لکھ کر سلطان باہو کی روح سے رجوع کیا اور اس کی فریاد رانیاں نہ گئی۔ ہوت بلوچ شاہی جیوں کے ہاتھوں معزول ہو کر قید خانے میں ہی چل بسا اور نور محمد آزاد کر دیئے گئے۔

نیکوئوں کا خزانہ

مبصر میں پانی کی نیچکی خالی تھی میں موٹر چلا کے
مبصر سے پتھن کرے میں آبیخسار دیوں کے باعث
تاکم پانی بھرا جاتا ہے کہ استعمال ہونے تک زیادہ
ششہ نہ ہو چھ مٹ بعد موٹر بند کر دی، میرے بابا
شریف لائے وضو خانہ میں وضو کے لئے بیٹھے تو
ٹیپوں میں پانی نہارو آواز دے کہ فرما:

”عجم میاں! پانی نہیں ہے موٹر کا بنن آن کر دو میں نے جلدی سے بنن آن کیا اور باہر بابا کی طرف چلا گیا۔ کیا دیکھا ساری ٹوئیاں کھلی ہوئی ہیں سب سے پانی نکل رہا ہے، بابا کے استعمال کی ٹوٹی کوچھوڑ کر باقی تمام ٹوئیں کو بند کر دیا۔“

بابائے وضو کو لیا مجھ سے فرمانے لگے مسجد کے پانی کا خاص خیال رکھا کرو یاں اور بجلی نہ ہونے کی صورت میں نمازیوں کو وضو کرنے میں مشکل پیش آسکے۔ میں نے عرض کیا، بابا مؤخر تو ابھی چلائی تھی ٹوٹیوں کے کھلا رہ جانے سے سارا پانی ضائع ہو گیا، میری بات سن کر بابا مسکرائے اور فرمایا:

نجم میاں! ٹوٹیاں کھلی رہ جانے سے چلنے والی موٹر کا پانی محفوظ نہیں رہتا۔ ایسے ہی آنکھوں کی ٹوٹی پڑنظر کی صورت..... کان کی ٹوٹی نصیحت سننے کی صورت..... دل کی ٹوٹی غیر سے لگانے کی صورت..... ہاتھ کی ٹوٹی دوسروں کو تکلیف دینے کی صورت..... زبان کی ٹوٹی ایذا دینے اور یاد اگونی کرنے کی صورت میں کھلی رہ جانے سے نیکیوں کا خزانہ محفوظ نہیں رہتا!

(تحریر: مرفضی حسن۔ پشاور)

نے اس کے حق میں دعا کی۔

سلطان باہو نے 1102 ہجری میں وفات پائی۔ آپ کے حرار پر جذب و مستی کا غلطہ ہوتا

خطرناک تھا۔ شیر کو مارنے کا طریقہ تو بہت آسان ہے بس نیچے بکرا یا بچھڑا باندھ کر خود درخت پر چٹان بنائے بیٹھ جاؤ شیر بکرے یا بچھڑے کو کھانے آئے تو چٹان سے گولی چلا کر اسے اندھا کر دو۔ نشانہ خطا جائے تو بھی کوئی خطرہ نہیں شیر چٹان پر تو چڑھ نہیں سکتا لیکن قبائلی باشندہ کوئی ایسا سیدھا سادا شیر نہیں تھا جو کسی لالچ سے کھیا ہوا ہماری رائفل کے سامنے آجاتا۔ ہماری پوری کی پوری پلٹن پہاڑیوں اور وادیوں میں بکری ہوتی قبائلیوں کی تلاش میں ماری ماری پھرتی رہتی تھی اور کسی پہاڑی چٹان پر بیٹھا ہوا کوئی قبائلی شیر چانک ایک گولی فائر کر کے ہمارے ایک آدمی یا ایک بچہ کو اندھا کر دیتا تھا۔ ہماری سرکاری حیثیت تو شکاری کی ہوتی تھی لیکن دراصل ہم بکرے تھے اور قبائلیوں کا سن بھاتا شکار۔

ہماری پلٹن ٹیگمیر کے علاقے میں ساڑھے چار برس شکار کھیتی رہی۔ ہم پانچ ساڑھے پانچ سو آدمیوں نے اس عرصے میں مشین گنوں اور رائفلوں سے لاکھوں راؤنڈ فائر کئے مگر ہم نے لیں جو ہم نے کبھی وہاں کسی قبائلی باشندے کے خون کا ایک قطرہ بھی دیکھا ہو البتہ اس عرصے میں ہماری پلٹن کے چھپن جوان اور ایک انگریز میجر مارا گیا۔

ہماری پلٹن کا سیکٹر ان کاٹھ ایک میجر ایڈم ہوا کرتا تھا۔ وہ ہر دوسرے سال دو مہینے کی چھٹی لے کر افریقہ کے جنگوں میں شکار کھینے چلا جایا کرتا تھا۔ شکار کھینا اور واپس آکر شکار کی کہانیاں سناتا اس کی عادت بن گئی تھی کسی نہ کسی کہانی کو "قال ان" کر کے جوانوں کو ذہن پر بٹھا لیتا تھا اور شکاری کہانی سناتے لگتا تھا۔ وہ نہایت اچھی اردو بولا کرتا تھا۔ ہم نے پہلی بار آدم خور کا نام۔ ہمیں یہ چلا کہ افریقہ میں ایسے انسان بھی ہیں جو انسانوں کو کھا جاتے ہیں اور ایسے شیر بھی ہیں جو انسانوں کو نہیں کھاتے بلکہ کوئی

ایک شیر ایسا نکل آتا ہے جو کسی وجہ سے آدم خور ہو جاتا ہے میجر ایڈم بتاتا تھا کہ ایسے شیر کو مارنا بہت مشکل ہوتا ہے کیونکہ وہ بہت چالاک ہوتا ہے۔ میجر ایڈم کی کہانیاں سن سن کر ہم نے اسے ایڈم خور کہنا شروع کر دیا تھا۔ کیونکہ وہ پلٹن کا اس قدر سخت تھا کہ جہاں کہیں اسے کوئی سپاہی لھٹتا یا گھومتا پھرتا نظر آجائے خواہ وہ بازار میں یا سڑک پر ہی کیوں نہ چلا جا رہا ہو کہیں نہ کہیں سے میجر ایڈم کی دنگ۔ آواز گرج اٹھتی تھی..... ویل ڈھیلا جوان ہمارا میم صاحب کی مافق چھاتی نکال کر چلاؤ کم آن ڈیل..... اور وہ سپاہی کو ڈیل مارچ کر ادیتا تھا۔ ذرا سی بات پر جوانوں کو سخت ترین سزا میں دیتا تھا۔ پریڈر گارڈ میں آجائے تو قیامت آجائی تھی۔ پھر وقت گزرتا گیا میجر ایڈم کرل بن کر کسی دوسری پلٹن میں چلا گیا ہم ترقی کی منتریں بٹے کرنے لگے اور جب دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی تو ہم کپتی حوالدار میجر تھے۔ ہندوستانی فوج کی نئی پونیش کھڑی کی گئیں جس سے ترقی کے راستے کھل گئے اور ہم جھدار بن گئے۔ پاک آری میں جھدار کو نائب صوبیدار کہتے ہیں ماں باپ اور بیوی نے بہت تعویذ دھاگے کئے اور خاتما ہوں اور بیویوں فقیروں کی درگاہوں پر نذرانے دیے کہ مجھے لڑائی میں نہ بھیجا جائے۔ ڈیڑھ دو سال تو تعویذوں اور بیویوں کی دعاؤں نے بہت کام کیا اور میری پونٹ کو ہات چھادی میں رہی مگر ایک دن تعویذوں اور بیویوں کی کرامات یک لخت بے اثر ہو گئیں اور پلٹن برما فرنٹ کے لئے یورپا بستر باندھنے لگی۔ صبح تیار کیا حکم ملا اور شام کے وقت جنگ لڑیں ہمیں کوہاٹ سے اٹھانے لگی۔ کم بخت کی رفتار بہت ہی تیز تھی ہمیں چھٹی پر لے جانے والی گاڑی بھی اتنی تیز نہیں چلی تھی مگر فرنٹ پر لے جانے والی گاڑی ہوا سے ہاتس کرتی راؤ پلنڈی

پلٹن کے کاٹھ ایک آفسر (لیفٹیننٹ کرل اینڈریو) نے بلایا اور میرے کپتی کاٹھ کے سامنے حکم دیا کہ ساری پلٹن میں سے نہایت تیز طرار اور دلیر چالیس جوان جن میں دو حوالدار اور چار ٹانک بھی ہوں جن کو اور بریگیڈ ہیڈ کوارٹر میں چلے جاؤ میں نے پوچھا کہ ڈیوٹی کیا ہے تو کرل صاحب نے بتایا کہ بریگیڈ ہیڈ کوارٹر سے مکمل ہدایت ملے گی لیکن اتنا خیال رکھو کہ اپنے ساتھ ایسے جوان لے جاؤ جو بندر کی طرح چھپنے والے گھوڑے کی طرح طاقتور اور اوٹ کی طرح بھوکے پیاسے رہ سکتے ہوں۔

اس حکم نے رونق کھڑے کر دیے میں سمجھ گیا کہ ہمیں جاپانی آدم خوروں کے شکار کے لئے بھیجا جا رہا ہے۔ ہماری پلٹن میں ایک کپتی ہندوؤں کی ایک سکون کی اور دو مسلمانوں کی تھیں۔ ہندوؤں کو ہم اچھی طرح جانتے تھے بزدلی اور فریب کاری اور کی فطرت ہے۔ مجھے دراصل پورا مجبور مسلمانوں پر تھا سکون پر بھی میں مجبور سرسکا تھا سکھ سپاہی بزدل نہیں ہوتا نہ وہ دھوکہ دیتا ہے اگر وہ کسی خطرناک حالات میں ڈر جائے تو صاف بتا دیتا ہے کہ میں ڈر رہا ہوں۔ اس کے برعکس ہندو بھی ظاہر نہیں ہونے دیتا کہ وہ خوفزدہ ہے بلکہ وہ کاٹھ کے لئے سراپا دھوکا بنا ہوا خطروں میں چلا جائے گا اور کاٹھ کو خطرے میں چھوڑ کر بھاگ آئے گا۔

میں نے پندرہ سکھ اور چھپن مسلمان منتخب کر لئے جن میں ایک حوالدار سکھ اور چھپن سکھ اور ایک مسلمان شہداد خان تھا۔ دو ٹانک سکھ اور دو مسلمان تھے۔ بریگیڈ ہیڈ کوارٹر میں گئے تو وہاں سے ہمیں ایک انگریز میجر ایل کی سلسلہ کے حوالے کر دیا گیا اور اس شام ہم برما کے شمال کی طرف روانہ ہو گئے۔ میجر سلسلہ اردو بھی بولتا تھا اور بری زبان سے بھی خوب واقف تھا وہ بہت عرصہ برما میں رہا تھا۔ برما

میں نے پلٹن سے بھی رن تھرو لکھ گئی۔ ان دنوں برما فرنٹ جہنم بنا ہوا تھا انگریزوں کی ہائی فوج جوابی حملہ کر چکی تھی۔ پنجاب اور کے دیہات میں شاید ہی کوئی گھر ہوگا جہاں انہیں ہو رہا تھا۔ ہندوستانی سپاہی بے وردی سے لڑ رہے تھے۔ جاپانی سپاہیوں کے متعلق ہمیں ناخوشگوار کہانیاں سنائی جا رہی تھیں۔ یہاں تک جاپان کا تھا کہ جاپانی کسی ہندی یا دریا پر بل بناتے ہی تین دو پانی پر چل کر دریا پار کرتے ہیں اور یہ بھی کہ ہندوستانی سپاہیوں کو زندہ پکڑ کر انہیں پاؤں کی لک سے کاٹنا شروع کرتے ہیں اور سر تک جسم کے گانگوے کر دیتے ہیں۔ کہانیاں سن سن کر ہمارے دم تلک ہو رہے تھے اور ہمیں میجر ایڈم خور کے آدمی فوراً یاد آ رہے تھے۔ بہر حال اپنے دل کو یہ کہہ کر تسلی دی کہ انگریز نے اسی روز کے لئے ہمیں خاکی وردی میں لپیٹ کر پالا پوسا ہے سرکاری نمک کا حق تو ادا کرتا ہی ہے۔

ہم برما فرنٹ پہنچ گئے ہم قبائلی چٹانوں کی ایک گولی سے بدلتے تھے مگر برما فرنٹ پر کیوں گولوں اور ببول کا مینہ برس رہا تھا اور یہ منہ لال سرخ خون بن کر ندیوں کی صورت بہہ رہا تھا جاپانی برما کے لئے سرحد کی ہادی لگائے ہوئے تھے ادھر انگریز جاپانیوں کو پس کرنے کا تہیہ کر چکے تھے اگر ہم سپاہی ہوتے تو شاید جان بچانے کا کوئی ذریعہ پیدا کر لیے لیکن کندھے پر نائب صوبیدار کی کا پھول لگا کر جان بچانا ذرا مشکل ہوتا ہے۔

جاپانیوں کے ساتھ ہماری آنے سامنے کی ایک ہی مگر ہوئی جس سے یہ ثابت ہو گیا کہ جاپانی خوب لڑتے ہیں لیکن اتنا خوب بھی نہیں جھٹتا تھا دن بھر کی لڑائی کا یہ نتیجہ رہا کہ ہم نے انہیں پیچھے دھکیل کر ان سے ٹھکری چھین لی دوسرے ہی دن مجھے اپنی

کے شمالی علاقے میں ابھی بہت سی ایسی جگہیں تھیں جو مکمل جنگ سے محفوظ تھیں۔ اطلاع ملی تھی کہ جاپانی جنگ کے علاقوں میں پھیلنے چارے ہیں جہاں وہ مقامی برمیوں کو تشدد یا لالچ سے اپنے ساتھ لٹا رہے ہیں ہماری پارٹی کی ڈیوٹی یہ تھی کہ تمام علاقے میں گشت کریں مقامی لوگوں سے رابطہ قائم کریں اور جہاں کہیں کوئی جاپانی دستہ نظر آئے اسے ختم کریں۔ میجر سلسٹر نے ہمیں بتایا کہ یہ کام آسان نہیں ہے مکمل جنگ میں انسان زندہ رہ سکتا ہے لیکن اس قسم کی مہم سے زندہ لوٹنا محال ہوتا ہے کیونکہ کسی بھی جگہ چپے ہوئے جاپانی فائر کھول کر ہمیں مار سکتے ہیں۔ میجر سلسٹر کی کمان میں یہ خوبی تھی کہ وہ حکم ایسے لہجے میں دیتا تھا جیسے ایک دوست دوسرے دوست سے بات کر رہا ہو۔ وہ ہمارے ساتھ کھانا کھایا کرتا تھا۔ ہمارے ساتھ چھروں پر لدا ہوا اپنا راشن تھا جس میں اس کے لئے دلائی راشن بھی تھا لیکن یہ انگریز ہمارے ساتھ دال چٹائی کھاتا تھا اور شام کے وقت ہم سے ہماری کھریلو بائیں پوری دلچسپی سے سنا کرتا تھا۔ وہ ہمیں اکثر کہا کرتا تھا کہ ہندوستان میں مسلمان اور سکھ ہی دو ایسی قومیں ہیں جو اس ملک کی عزت کو دشمن سے بچا سکتی ہیں۔ ایک روز مجھ سے پوچھنے لگا کہ یہ کس کی عقل مندی ہے کہ اس پارٹی میں کسی ہندو کو شامل نہیں کیا گیا۔ میں نے اسے بتایا کہ یہ میرا فیصلہ تھا تو وہ بہت خوش ہوا اور کہنے لگا..... ہم ہندو سے بہت ڈرتے ہیں ہندو سانپ ہے تم لوگ سانپ کو نہیں پال سکتا وہ ڈیک مارو گے۔

ہماری پارٹی ہانسون کے بنے ہوئے جمونیزوں کی ایک بستی میں پہنچی۔ یہ بستی جنگ کی تباہ کاری سے محفوظ تھی۔ بہت دور سے توپوں کی دھم دھم کی آوازیں آرہی تھیں یا جاپانی اور اتحادی لڑاکا ملہارے اڑتے گزر جاتے تھے۔ ہم نے اس بستی

میں ایک رات گزار دی۔ میجر سلسٹر بستی کے لوگوں سے پوچھ گچھ کرتا رہا۔ رات کے وقت دور سے ہمیں بھیڑیوں اور گیدڑوں کی آوازیں سنائی دیتی رہیں اور تین چار بار ہم نے شیر کی دھماکا بھی سنی۔ ہم نے میجر سلسٹر سے پوچھا کہ کیا یہ شیر کی آواز ہے؟ اس نے بتایا کہ قریبی جنگل میں شیر پایا جاتا ہے لیکن اتنا زیادہ نہیں البتہ جنگلی بلی زیادہ پائی جاتی ہے۔ جو شیر کی نسل کی ہوتی ہے اور شیر کی طرح خوفناک۔ اس کے ساتھ ہی سلسٹر نے بتایا کہ چونکہ ہمارے تمام تر جنگلوں میں جنگ ہو رہی ہے اس لئے دودھے ادھر کے محفوظ علاقوں میں بھاگ آئے ہیں۔ اس نے کہا کہ ان جنگلوں میں ہمارے دو دشمن ہیں ایک جاپانی دوسرے دودھے لیکن اس کے کہنے کے مطابق دودھے سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی کیونکہ انہیں کھانے کیلئے بہت شکار مل جاتا تھا۔

اس بستی سے ہمیں یہ اطلاع ملی کہ جاپانی ابھی تک اس علاقے تک نہیں پہنچے۔ البتہ پندرہ سولہ میل دور ایک جنگل میں وہ پہنچ چکے ہیں۔ یہ خبر ایک بری لڑکی نے دی تھی۔ بستی کا نمبر دار اس لڑکی کو ہمارے پاس لایا تھا وہ بہت خوبصورت اور نو جوان لڑکی تھی ہمیں دیکھ کر وہ نمبر دار کے ساتھ چپک گئی اور چھین مار مار کر رونے لگی۔ وہ فوجیوں سے ڈرتی تھی نمبر دار نے اسے بڑی مشکل سے سمجھایا کہ ہم لوگ اسے پریشان نہیں کریں گے۔ میجر سلسٹر نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور بڑے پیار سے اس کی زبان میں کچھ کہا تو لڑکی سنبھل گئی۔ اس نے دہشت زدگی کی حالت میں جو کہانی سنائی وہ بہت دردناک تھی۔ اس کے گلابی گلابی گالوں پر گہری خراشیں تھیں اس نے شبے میں آکر اپنے سینے سے کپڑا اٹھادیا۔ اس کا سینہ خراشوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ شمالی علاقے کی ایک بستی کی لڑکی تھی جہاں جاپانیوں کا ایک دستہ پہنچ گیا

جاپانیوں نے بستی کی لڑکیوں کو قبضے میں لے لیا اور بہت خراب کیا۔ یہ لڑکی بڑی مشکل سے بھاگ آئی تھی اور پانچواہ اس بستی میں پہنچی تھی۔ یہاں کے نمبر دار نے اسے اپنے پاس رکھ لیا تھا وہ کہتا تھا کہ اگر اس کے ماں باپ زندہ نہ ہوتے تو وہ اسے اپنی بیٹی بنا لے گا۔

لڑکی نے بتایا کہ اس کی بستی کے ارد گرد میلوں چوڑا اور گھنا جنگل ہے جہاں جاپانی وائزس فرانسسز وغیرہ نصب کر رہے تھے ہمیں یہ معلوم نہیں تھا کہ اب تک جاپانی وہاں کتنی نفرتی نفرتی جمع کر چکے تھے۔ ہم صرف چالیس آدمی تھے پھر بھی میجر سلسٹر نے کہا کہ ہم اس مقام تک جائیں گے اگر دشمن کی نفرتی زیادہ ہوئی تو ہم پوری معلومات فراہم کر کے بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کو رپورٹ کریں گے اور اگر وہ تھوڑے ہوئے تو ہم ان پر رات کے وقت حملہ کریں گے۔ سلسٹر نے شاید بھانپ لیا تھا کہ ہم کچھ دُور سے کر کے ہم سے کہا..... "دیکھو جوان اس لڑکی کو دیکھو تم نے اس کا ہاتھ سن لیا، اب سوچو یہ تمہارا بیٹی اور تمہارا بہن ہے، بتاؤ تم کیا کرے گا؟"

"ہم اس کی استریاں باہر نکال دیں گے جس نے ہماری بیٹی یا بہن کو خراب کیا ہے۔" میرے ایک مسلمان ٹانگ نے جوش میں آکر کہا۔

عورت کے معاملے میں مسلمان اور سکھ سہاٹی کا کردار بہت مختلف ہوتا ہے۔ مظلوم لڑکی کو دیکھ کر سارے مسلمان سہاٹی انتقام کے لئے تیار ہو گئے۔ لیکن سکھ حوالدار نے مجھے سرکشی میں کہا..... "جعداد صاحب ایسی خوبصورت لڑکی ہمیں مل جائے تو ہم بھی وہی سمجھ کریں گے جو جاپانیوں نے کیا ہے یہ ہماری خال تو نہیں گئی....." یہ درست تھا کہ بری ہمارے کچھ نہیں لکتے تھے نہ جاپانیوں کے

ساتھ ہماری کوئی دشمنی تھی ہم تو انگریز کے کرائے کے سپاہی تھے لیکن مسلمان کا خون ایسا ہے کہ جہاں اس کی غیرت پر چوٹ پڑتی ہے اس کا خون کھولنے لگتا ہے۔ مظلوم عورت خواہ کتنی بھی ملک کی ہو اس کے ساتھ مسلمان سپاہی کا رویہ بہت مختلف ہوتا ہے۔ چنانچہ ہم سب میجر سلسٹر کے ساتھ چلے کو تیار ہو گئے حکم تو ماننا ہی تھا لیکن ہم دل و جان سے اس کا ساتھ دینے کو تیار تھے۔ سکھوں کا رویہ ذرا بدلا ہوا تھا وہ صرف حکم مان رہے تھے۔ میجر سلسٹر نے مقامی لوگوں سے رات پوچھ کر نقشے میں نشان لگائے اور ہم صبح کے اندھیرے میں روانہ ہوئے۔ ساری بستی کے لوگ ہمیں الوداع کہنے کا باہر نکل آئے تھے نمبر دار نے میجر سلسٹر کو کچھ کہا۔ سلسٹر نے ہمیں روک کر بلند آواز سے کہا کہ لڑکی نے نمبر دار سے کہا ہے کہ اگر یہ لوگ جاپانیوں کو مار کر ان لڑکیوں کو بچھڑا لائیں جو ان کے قبضے میں ہیں تو میں اپنی گردن کاٹ کر جسم کا تمام خون تمہارے قدموں میں قربان کر دوں گی۔

ہم چل پڑے راستہ دشوار گزار ہوتا گیا۔ جنگل گھنا تھا اور ہر طرف اونچی نیچی ٹکریاں تھیں۔ وائزس سیٹ سے بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کے ساتھ رابطہ تھا۔ وہ ڈوڑھائی کھتے بعد ہم کچھ سات میل دور نکل گئے تھے۔ ایک چھوٹا ہوائی جہاز آیا جس نے ہمارے اوپر نیچی پرواز کی۔ میجر سلسٹر نے پائلٹ کے ساتھ رابطہ کیا۔ ہوائی جہاز نے دو ہنڈل پھینکے ان میں ہمارے لئے اکر چکی راشن تھا۔

رات کو ہم اس مقام سے ڈیڑھ میل دور تک پہنچ گئے جہاں جاپانیوں نے ڈیرے ڈالے تھے۔ ارد گرد کا جنگل بہت گھنا تھا۔ اسی رات میجر سلسٹر نے ایک سکھ حوالدار زمین سکھ سپاہیوں اور تین مسلمان سپاہیوں کی پارٹی تیار کی اور انہیں حکم دیا کہ وہ بھر کر سارے

علاقے کا جائزہ لیں اور صحیح معلومات لائیں۔ پارٹی رات دس بجے کے قریب روانہ ہوگئی ہم نے ایک گھبراہٹ میں ڈیرے ڈال دیئے۔ اور گھنے درختوں کا چھاتا تھا ارد گرد چٹائیں تھیں کسی کو شک بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ یہاں کوئی چھپا ہوا ہے۔

رات کا پچھلا پہر تھا۔ شاید اڑھائی بجے تھے کہ حوالدار گورچن سنگھ گشت سے واپس آ گیا، وہ سخت گھبرایا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ تین سکھ اور دو مسلمان سپاہی تھے تیسرا مسلمان سپاہی لاپتہ تھا۔ گورچن سنگھ نے خطرے کے علاقے میں جا کر ایک ایک سکھ اور ایک ایک مسلمان سپاہی کو جوڑا بنا کر انہیں اپنے طور پر گشت اور دیکھ بھال کے لئے بکھیر دیا تھا جو مسلمان سپاہی لاپتہ تھا اس کے ساتھی سکھ سپاہی نے بیان دیا کہ وہ دونوں دبے پاؤں بستی کے ارد گرد گھوم رہے تھے کہ ایک جگہ آہٹ سنائی دی۔ سکھ ڈر گیا لیکن مسلمان نے کہا کہ آگے چل کر دیکھیں گے کہ وہاں کون ہے سکھ نے مسلمان کو قائل کرنے کی بہت کوشش کی کہ یہ انگریزوں اور جاپانیوں کی جنگ ہے ہم ان کے لئے اور بریوں کے لئے کیوں مریں چلو وقت گزرا کر چلتے ہیں لیکن مسلمان نے کہا کہ اس طرح بزدل نہیں بننا چاہئے۔

مسلمان سپاہی ایک جھاڑی کی اوٹ میں ہو کر جھک گیا اور آگے بڑھ گیا۔ اس نے سکھ سپاہی سے کہا کہ وہ پیچھے پوزیشن لے کر راتقل سے اسے کور کرے۔ سکھ نے وہیں پوزیشن لے لی اور مسلمان رات کے اندھیرے اور جنگل میں غائب ہو گیا۔ سکھ سپاہی نے بتایا کہ بہت دیر بعد اسے ایسی آواز سنائی دی جیسے کوئی ننگے پاؤں دوڑا ہو پھر اسے خرخر کی آوازیں سنائی دیں اور جنگل میں پھر خاموشی چھا گئی۔ سکھ نے مسلمان سپاہی کو بہت آوازیں دیں لیکن اسے کوئی جواب نہ ملا تو وہ اکیلا واپس آ گیا۔

ٹرانسمیر پول (کھمبا) تو ہوتا چاہے تھا نہ کہیں کوئی جاپانی سنتری نظر آیا۔ پھر وہ کون سا شرارتا تھا جو ہمارے جوان کو اس پر اسرار طریقے سے مارا گیا تھا؟ ہم خبریت سے اپنے ڈھکے چھپرے میں بیٹھ گئے میجر سلسٹر نے بھی لاش کو بڑے غور سے دیکھا۔ آخر سوچ سوچ کر کہنے لگا کہ یہ کسی ایسے درندے کا کام ہے جو انسانی خون پینے کا عادی ہو گیا ہے لیکن جسم پر درندے کے پنجوں کا کوئی نشان نہیں۔ یہ واقعی قابل غور امر تھا کہ جسم کے کسی حصے پر خراش تک نہیں تھی نہ کہیں سے وردی پہنی ہوئی تھی۔

ہمارے سارے جوانوں نے لاش کو دیکھا تو انہوں نے بیک زبان فیصلہ دے دیا کہ یہ جاپانیوں کا کام ہے۔ انہوں نے جاپانیوں کے متعلق جو مافوق الفطرت باتیں سنی تھیں انہیں سچ مانے لگے۔ مثلاً یہ کہ جاپانی سپاہی پانی پر چل سکتے ہیں اور اب وہ کہہ رہے تھے کہ جاپانی آدم خور ہوتے ہیں۔ انہوں نے اس سپاہی کا خون پی لیا ہے۔ اس نے سپاہیوں میں خوف بھی پیدا ہو گیا۔ میں نے میجر سلسٹر کو بتایا تو اس نے سب کو اکٹھا کر کے ان کے دلوں سے یہ خوف نکالنے کی کوشش کی لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ سپاہی قائل نہیں ہوئے تھے۔

دن کے وقت گشت پارٹی نہ بھیجی گئی جوانوں کو چھپے رہنے کی ہدایت دے کر میجر سلسٹر نے مجھے ساتھ لیا اور ہم دونوں گئے جنگل میں چھپے چھپائے بستی سے فرلاٹک پھر ڈور کھینچ گئے۔ ہم آگے نہیں جاسکتے تھے دور درختوں سے بستی اور گرد و پیش کا جائزہ لیا وہاں کسی انسان کا نشان نہ ملا۔ چند خالی کھوکھے اور ادرہ پڑے تھے بستی میں بھینا کوئی انسان نہیں تھا۔ موٹے موٹے بانسوں کے اوپر بانسوں کے جھونپڑے چپ چاپ کھڑے تھے۔ میجر سلسٹر نے کہا کہ اگر اس علاقے میں جاپانی موجود ہیں تو وہ

جنگل ہالک خاموش تھا۔ اپنے ہی زون کی آہٹ سے ہم بدک جاتے تھے اچانک بارش لگی میں نے پروا نہ کی اور سوچا کہ جاپانی آئے ہوتے ہوں گے اگر جاگ بھی اٹھنے تو بارش لاہار نہیں نکلتی گے ہم بارش میں ہی جھاڑی بالائی حاشی لیتے ہیں۔

بہت دیر ہوگئی بارش ختم ہوئی اور صبح کی روشنی پھیلنے لگی ابھی تک مجھے اپنے کشدہ سپاہی کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ قیاس یہی تھا کہ اسے جاپانی پکڑ لے ہیں اگر ایسا ہی تھا تو مجھے یقین تھا کہ اسے جاپانی لاش بھری کہیں اور نہیں لے جاسکتے وہ یہیں ہوگا اور اچانک کی بازی لگا کر اسے چھڑا لیں گے۔

اچانک میرے ٹانگ نے سرکشی میں مجھے پارہ، میں اس تک پہنچا تو دیکھا کہ ٹانگ زمین پر پڑے جیسے بیٹھا تھا اور اس کے سامنے میرے مسلمان سپاہی کی لاش پڑی تھی۔ اس کا سارا ایویشن اس کے پاس تھا۔ راتقل غائب تھی میں نے سپاہیوں کو اور ادرہ پھیل کر لاش کا معائنہ کیا۔ اس کے جسم پر صرف ایک زخم تھا اور وہ یہ تھا کہ اس کی گردن چیری چھاڑی ہوئی تھی۔ عجیب چیز یہ دیکھی کہ خون کا ایک قطرہ بھی زمین پر نہیں گرا تھا۔ بارش کی وجہ سے پاؤں کا کوئی نشان کہیں نظر نہ آتا تھا۔ اگر اسے جاپانیوں نے مارا ہوتا تو اس کے جسم پر گولی یا پھینٹ یا چاقو کے زخم لازمی تھے اور اگر یہ کسی درندے کا کام تھا تو جسم پر پنجوں کے زخم ضرور ہوتے۔ میں نے لاش اٹھوائی اور ہم چھپے چھپائے واپس چل پڑے۔ ذرا ہی آگے ہمیں سرے ہوئے سپاہی کی راتقل بھی پڑی ہوئی تھی۔ یہ واضح ثبوت تھا کہ اسے جاپانیوں نے نہیں مارا ورنہ وہ اس کی راتقل اور ایویشن بھی لے جاتے۔ میں نے ابھی طرح دیکھا کہ وہاں وائز لیس ٹرانسمیر کا کوئی نشان نہ تھا۔

حوالدار گورچن سنگھ نے ایک جگہ مقرر کی تھی جہاں سب کو واپسی کیلئے اکٹھے ہونا تھا وہاں بھی پہنچ گئے لیکن مسلمان سپاہی نہ پہنچا۔ گورچن سنگھ نے تھوڑی دیر انتظار کیا پھر تلاش میں نکلا ایک جگہ اسے ایک بری عورت کی لاش پڑی نظر آئی۔ وہ وہیں سے واپس آ گیا معلوم نہیں وہ اتنا زیادہ گھبرایا ہوا کیوں تھا۔ اس نے جاپانیوں کے کوئی آثار نہیں دیکھے تھے میجر سلسٹر نے بہت جرح کی لیکن حوالدار گورچن سنگھ نے کام کی کوئی بات نہ کی۔ اس نے اتنا اعتراض ضرور کر لیا کہ اس نے بھی کسی کے بھاگنے کی آواز اور خراٹے سنے تھے شاید وہ انہی آوازوں سے ڈرا ہوا تھا۔

میجر سلسٹر نے مجھے حکم دیا کہ میں جتنے جوان چاہوں ساتھ لوں اور صبح کی روشنی پھیلنے سے پہلے اس علاقے کی دیکھ بھال کروں، میں تو چاہتا ہی نہیں تھا۔ ایک مسلمان سپاہی کی گمشدگی کو میں برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ چلن کا چٹا ہوا جوان تھا اور میرے گاؤں سے تھوڑی ہی دُور کا رہنے والا تھا۔ میں نے چھ مسلمان سپاہیوں ایک مسلمان ٹانگ اور اس سکھ سپاہی کو ساتھ لیا جو اس مسلمان سپاہی کے ساتھ تھا۔ ہم جنگل میں کیڑوں کوڑوں کی طرح رینگتے سرکتے اس جگہ پہنچے جہاں سے میرا جوان غائب ہوا تھا۔ میرے پاس ٹین ٹین تھی جوانوں کے پاس راتقلیں اور ٹین ٹین میں میں نے انہیں حکم دیا کہ زیادہ بکھر کر نہیں ڈرا چھیل کر آگے بڑھیں اور ذرا ہی بھی آہٹ ہو تو فائر کریں۔

ہر لمحہ یہ خطرہ تھا کہ جاپانی ہمیں گھیر کر ختم کر دیں گے۔ یا پکڑ لیں گے۔ جنگل گھٹا تھا اور ہم سے دو اڑھائی فرلاٹک دور چند گھروں کی بستی تھی میں نے ایک بلند جگہ منتخب کر لی دو سپاہیوں کو وہاں پوزیشن میں بٹھا دیا اور خود ہاتی جوانوں کو ساتھ لے کر جنگل

آپ ادب نواز ہیں! آپ علم دوست ہیں!

ہم آپ کو سیارہ ڈائجسٹ کے تمام شمارے گھر بیٹھے
بذریعہ رجسٹری ڈاک بھیجیں گے اور
آپ کو -/520 روپے
کا فائدہ بھی ہوگا۔



سالانہ اخراجات کا تخمینہ

قیمت فی شمارہ:- /80 روپے - سال بھر میں بارہ شماروں کی عام قیمت -/960 روپے
سال بھر کا ایئر میل رجسٹری ڈاک خرچ -/360 روپے - کل رقم -/1320 روپے

آپ صرف -/800 روپے ہمیں ارسال کر دیں۔
سال بھر سیارہ ڈائجسٹ آپ کو گھر بیٹھے ملتا رہے گا۔
صرف یہ کوپن پر کر کے حوالہ ڈاک کر دیجئے!



لیکن آپ اتنی
رقم کیوں خرچ
کریں

اس شخص سے حوالہ فائدہ اٹھائیں

جناب منیجر صاحب۔ سیارہ ڈائجسٹ

براہ کرم مجھے ماہ..... سے سیارہ ڈائجسٹ ایک سال کیلئے جاری فرمادیں
-/800 روپے کا ڈرافٹ/ منی آرڈر ارسال کر رہا ہوں/ آپ مجھے -/800 روپے کی
دی پی پی ارسال کر دیں۔ میں وصول کر لوں گا۔ نوٹ:- چیک قبول نہیں کیا جائے گا

پتہ

نام.....
آپ یہ رقم اے ٹی ایم (ATM) اور منی ٹرانسفر کے دیگر طریقوں سے بھی ہمارے اکاؤنٹ نمبر 2339 ای بی بی
رہائش گارڈن بینک کوڈ نمبر 1227 برانچ لاہور میں ٹرانسفر کر سکتے ہیں۔ مزید تفصیل کے لیے رابطہ نمبر 042-37245412

انتقام لینے کے لئے بری طرح بڑے ہوئے تھے۔
سکھوں نے بھی لٹاکر کہہ دیا کہ دو مسلمانوں کے
لئے ہم سارے سکھ قربان ہو جائیں گے۔

میں نے اور منیجر سلسلے نے ہستی سے دور دور
ذرا بلند ٹکریوں پر چاروں طرف دو جوان پوزیشن
میں بٹھا دیے۔ وہاں سے ہستی پر فائر کرنے کے لئے
فیلڈ آف فائر صاف تھی۔ عجیب بات یہ تھی کہ ہم
نہایت اطمینان سے ٹکریوں پر گھومتے پھرتے رہے
ہم پر کہیں سے بھی فائر نہ آیا جس سے ہم زیادہ محتاط
ہو گئے۔ ہمارے پاس چار لائٹ مشین تھیں جن میں جو
ہم نے ٹکریوں پر لگا دیں ہمیں زیادہ خطرہ ان
ٹکریوں کے پیچھے سے تھا جہاں کچھ جھل میں ڈھکی
ہوئی بلند ٹکریاں تھیں۔ ہمیں یقین سا ہو گیا تھا کہ
جاپانی وہاں سرچہ بند ہیں۔

منیجر سلسلے ہستی کے ایک طرف اور میں اس کے
بائیں طرف تھا۔ انہی دو طرفوں سے حملہ کرنا تھا۔ ہم
نے پلان بنالیا تھا۔ منیجر سلسلے نے سفید رومال ہلایا
تو ٹکریوں سے ہماری مشین گنتوں اور رائفوں نے
ہستی پر فائر کھلادیا۔ دو منٹ بعد سلسلے اور میں نے
بھی ہستی پر فائر کھلادیا لیکن آگے سے کوئی جواب نہ
آیا۔ منیجر سلسلے نے بلند آواز سے کہا
..... ”چارچ“..... اور اٹھا کھینچا جوان (جو سلسلے کے
ساتھ اور چودہ میرے ساتھ) ہستی پر ٹوٹ پڑے۔
ہماری مشین گنتیں جھوٹو پڑوں پر گولیاں برساتی رہیں
جب ہستی میں داخل ہوئے تو ہر جھوٹا خالی تھا۔ ہم
نہایت احتیاط سے ہر جھوٹے کے اندر گئے۔ اندر
گھر لیو سامان بکھرا ہوا تھا۔ کسی کسی جھوٹے میں دو
تین لاشیں پڑی تھیں جو درندوں نے چھڑ ڈالی
تھیں۔ عورتوں کی صرف تین لاشیں تھیں جن سے
ظاہر ہوتا تھا کہ جاپانی باقی عورتوں کو ساتھ لے گئے
ہیں۔ دن کے وقت ہم نے گرد و پیش کا چھپ چھپ

ہماری طرح کہیں چھپے ہوئے ہیں ہستی میں نہیں۔ ہم
دونوں نے فیصلہ کیا کہ رات کے وقت ایک اور لشٹ
پارٹی بھیجی جائے اور اگر کوئی رپورٹ نہ ملے تو صبح
کے اندر میرے میں ہستی پر حملہ کر دیا جائے۔

رات کے وقت مسلمان حوالدار (شہداد خان)
کے ساتھ تین سکھ اور تین مسلمان سپاہی بھیجے
گئے۔ کوئی دو گھنٹے بعد ہم نے ایک گولی کی آواز سنی
پھر اور کوئی گولی فائر نہ ہوئی۔ یہ پارٹی رات کے دو
اڑھائی بجے واپس آئی حوالدار شہداد خان نے
رپورٹ دی کہ ایک مسلمان سپاہی لایچ ہے۔ بہت
حلاش کے باوجود اس کی لاش نہ مل سکی۔ اس کے
ساتھ بھی سکھ سپاہی تھا جس نے بیان دیا کہ وہ آگے
آگے چلا جا رہا تھا اور مسلمان سپاہی سات آٹھ قدم
پیچھے تھا۔ اس نے اس طرح کی آواز سنی جیسے کوئی
آدی بھائیوں میں سے کل کر مسلمان پر ٹوٹ پڑا
ہو جب اس نے گوم کر دیکھا تو رات کی تاریکی اور
کچھ جھل کی وجہ سے اسے کچھ ایسے نظر آیا جیسے
مسلمان سپاہی کو دو تین آدمیوں نے دبوچ لیا
ہو۔ سکھ سپاہی نے گھبرا کر ایک گولی فائر کر دی اور
مسلمان سگھی کی طرف دوڑا مگر وہاں کچھ بھی نہ تھا
ذرا پرے اسے ایسی آواز سنائی دی جیسے کوئی وزنی چیز
کھینچی جا رہی ہو۔ سکھ نے تعاقب کیا لیکن وہ اکیلا
تھا اس لئے بھاگ آیا جو بالکل قدرتی تھا۔

صبح کے وقت منیجر سلسلے نے حکم دیا کہ ہم آج
ہی ہستی پر حملہ کریں گے۔ یہ ایک دلیرانہ فیصلہ تھا۔
جاپانیوں کی نفری کا بھی ہمیں کچھ علم نہیں تھا اور نہ یہ
پتہ تھا کہ وہ ہیں کہاں۔ ان کے مورچے بھٹکا ڈھکے
چھپے تھے جہاں سے وہ ہمیں جن جن کر مار سکتے تھے
لیکن فوج میں بھائی چارہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک سپاہی
کی موت کو اس کے ساتھی برداشت نہیں کر سکتے
میرے مسلمان جوان تو اپنے مسلمان بھائیوں کا

میں بند کر دیا گیا۔ رات دس بجے کے لگ بھگ والد ارشد خان کو میجر سلسٹر اس کی جگہ لے چلا تو ہم نے اس سے ہاتھ ملائے۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی وہ ذرہ بخیر خوف زدہ نہ تھا۔ میں نے اسے گلے لگالیا۔ ہم اسے اپنے ہاتھوں موت کے منہ میں بیچ رہے تھے۔ وہ ہنس کر کہنے لگا: "..... جمداد صاحب کھرا لیں نہیں جو اللہ کو منظور ہوگا۔"

شہداد خان کو میجر سلسٹر ایک کٹلی جگہ کھڑا کر کے واپس آیا اور مشین گن لے کر ایک درخت پر چڑھ گیا۔ اس کی ہدایت کے مطابق میں نے سرچ لائٹ آن کر دی اور روشنی کو شہداد خان کے اوپر گرہا کھانے

لگا اسی طرح ٹارچوں والے بھی دھتے دھتے سے ٹارچیں روشن کرنے لگے۔ جنگل پر سناٹا طاری تھا اور میرے دل پر عجیب سا خوف طاری ہونے لگا۔ کوئی ایک گھنٹہ گزرا ہوگا ہمیں جھوپٹوں کی طرف سے ایک چیخ سنا دی۔ ساتھ ہی غرائی کی آواز بھی سنی۔ میجر سلسٹر نے بلند آواز سے کہا: "..... سرچ لائٹ ادھر کرو۔" میں نے سرچ لائٹ کھائی لیکن کھتے درختوں نے کچھ دیکھنے نہ دیا۔ میجر سلسٹر مشین گن لے کر درخت سے کودا اور بلند آواز سے کہا: "..... تمام لائٹ ادھر کرو۔" تمام ٹارچوں نے ادھر روشنی کر دی۔ میجر سلسٹر دوڑتا گیا۔ درختوں

حکم، دلیل اور مصلحت

مبلغ کہتے ہیں، نماز قائم کر لو تو کردار خود بخود قائم ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ کچھ نمازیوں میں ہو جاتا ہو، بیشک نمازی محروم رہتے ہیں۔ ہمارے مبلغ کہتے ہیں کہ نماز کا اس لیے حکم دیا گیا کہ وہ ہمیں برائیوں سے روکتا ہے، حفظانِ صحت ہے، میرے دانت میں اللہ کے حکم کو rationalise کرنا، اس میں شک نہیں کہ حکم کرنا، بحکم کے لفظ کی توہین کے مترادف ہے۔ نماز قائم کرو، اس لیے کہ اللہ کا حکم ہے۔ پس، اس کے بعد بات کرنے کی محتاج نہیں ہو۔

قدرت اللہ شہاب کی بنیم ڈاکٹر عفت لندن کے ایک ہوٹل میں بیٹھی تھیں۔ اسی ٹیبل پر ایک فوجی افسر دروی پہنچے بیٹھا تھا۔ فوجی افسر نے ڈاکٹر عفت سے پوچھا: "لیڈی! آپ مسلمان ہیں؟"

"الحمد للہ! ڈاکٹر عفت نے کہا۔"

فوجی بولا: "کیا میں آپ سے ایک بات پوچھ سکتا ہوں؟"

"پوچھئے! ڈاکٹر عفت نے کہا۔"

فوجی بولا: "آپ سوز کا گوشہ کیوں نہیں کھاتے؟"

عفت نے کہا: "میرے اللہ کا حکم ہے کہ مت کھاؤ، اس لیے نہیں کھاتے۔"

فوجی بولا: "اس حکم کے پیچھے کیا دلیل ہے؟"

عفت نے کہا: "آپ فوجی ہو کر حکم کے مفہوم کو نہیں جانتے، حکم کی عفت کو نہیں جانتے۔ حکم، دلیل اور مصلحت سے بے نیاز ہوتا ہے۔"

(ممتاز مفتی کی کتاب "حلاش" سے اقتباس)

(مرسلہ: بش الرحمن - لاہور)

چھان مارا ہمیں کوئی جاپانی یا بری نظر نہ آیا۔ جاپانیوں کے آثار ضرور ملے من سے پتہ چلتا تھا کہ وہ آگے نکل گئے ہیں۔ بستی سے دو اڑھائی فرلانگ دور ہمیں رات والے مسلمان سپاہی کی لاش مل گئی۔ اس کی گردن بھی چیری بھاری ہوئی تھی لیکن درندے یا انسان کے پاؤں کا نشان نظر نہ آیا جس کی وجہ یہ تھی کہ جنگل میں جہی بہت تھی۔ درختوں سے اوس بارش کی طرح ٹپکی ٹپکی جس سے زمین پر کوئی نقش محفوظ نہیں رہ سکتا تھا۔

اب صورت یہ تھی کہ بستی اور گرد و پیش میں کوئی جاپانی نہیں تھا نہ کوئی اور انسان نظر آیا تھا۔ لاشیں ہی لاشیں تھیں پھر ہمارے جوانوں کو ایک ہی طریقے سے کون قتل کر رہا تھا؟ میجر سلسٹر نے فیصلہ کیا کہ یہ کوئی درندہ ہے لیکن وہ اس پر بہت حیران تھا کہ اس کے مارے ہوئے سپاہیوں کے جسموں پر اس کے بچوں کا کوئی نشان نہ تھا۔ سلسٹر مجھے ساتھ لے جنگل میں گھومتا رہا وہ ایک جگہ ڈک گیا اور زمین پر بیٹھ کر غور سے دیکھنے لگا۔ میں نے بھی دیکھا۔ سلسٹر نے کہا کہ یہ شیر کے بچوں کے نشان ہیں لیکن صرف پچھلے بچوں کے اگلے بچوں کے نشان کچھ اس طرح تھے جیسے سال ڈیڑھ سال کی عمر کا کوئی بچہ ننگے پاؤں چلتا رہا ہو۔ میجر سلسٹر نے کہا کہ معلوم ہوتا ہے کہ شیر کے اگلے دونوں بچے کئے ہوئے ہیں لیکن میں کہتا تھا کہ یہ کوئی ایسا درندہ ہے جو صرف پچھلی ٹانگوں پر چلتا ہے۔ مجھے میجر ایڈم کے آدم خورد یاد آ رہے تھے۔ میں نے میجر سلسٹر سے میجر ایڈم کا ذکر کیا تو معلوم ہوا کہ وہ اسے جانتا ہے۔ میجر سلسٹر نے ہندوستان میں شیر کا ہکار نکملا تھا۔ اس تجربے کی بنا پر وہ اس درندے کو مارنے کے لئے سیکمیں بنانے لگا جو ہکار کی گردن کاٹ کر خون پیتا ہے اور جس کے اگلے بچے نہیں ہوتے۔

اس نے مجھے کہا کہ شیر کو مارنے کے لئے کسی جانور کی ضرورت ہوتی ہے لیکن یہاں کوئی جانور نہیں اس کے علاوہ یہ درندہ انسانوں کے خون کا عادی ہے اس لئے ہمارے کی جگہ ہمیں کوئی انسان استعمال کرنا پڑے گا۔ جسے مارنے کے لئے شیر آئے گا۔ میں نے جب اپنی پانی کو بتایا کہ اس مقصد کے لئے ایک آدمی کی ضرورت ہے تو حوالدار گورچن سنگھ نے انگریزوں کو نہایت غلیظ کالی دے کر کہا کہ ہم کرے تو نہیں میجر صاحب سے کہو کہ وہ خود قربانی کا بکرا بنے اور درندہ آگیا تو اسے ہم مار دینگے۔ حوالدار شہداد خان کو غصہ آگیا کہنے لگا کہ سپاہی جو مرے ہیں وہ مسلمان ہیں اس لئے سکھ آگے نہیں ہوں گے میں ان دونوں سپاہیوں کے لئے جان دینے کو تیار ہوں۔

وہ تیار ہو گیا۔ میجر سلسٹر نے اسے بتایا کہ اسے رات کے وقت وہیں کھڑا ہونا پڑے گا جہاں دو سپاہی ہلاک ہوئے ہیں۔ میجر سلسٹر نے اسے یہ بھی بتا دیا کہ وہ درندے کو مارنے کی پوری کوشش کرے گا مگر ہو سکتا ہے کہ درندہ بے خبری میں اسے دبوچ لے اور مار ڈالے۔ اس لئے اسے یہ خطرہ مول لینا ہوگا۔ شہداد خان نے کہا: "..... میں اپنے دو جوانوں کے لئے مرنے کے لئے تیار ہوں۔" میرا ایک مسلمان تانک حکم داد بول پڑا: "اگر حوالدار شہداد خان مارا گیا تو اس کی جگہ میں کھڑا ہوں گا۔" سکھوں پر خاموشی طاری تھی۔

ہمارے پاس ٹارچیں بھی تھیں اور چھوٹی سی ایک سرچ لائٹ بھی۔ رات کے وقت شہداد خان کو جہاں کھڑا کرنا تھا اس سے تیس چالیس گز دور ایک درخت پر سرچ لائٹ نصب کر دی گئی۔ چار اور درختوں پر چار آدمی ٹارچیں دے کر بٹھا دیئے گئے۔ سرچ لائٹ پر میں بیٹھا باقی تمام جوانوں کو جھوپٹوں

کی وجہ سے میری سرچ لائٹ بیمار تھی۔ میرے پاس شین مگن تھی میں نے لائٹ آف کردی اور درخت سے کود کر میجر سلسٹر سے جا ملا۔ جھوپڑوں میں گئے سکھوں کو پکارا تو معلوم ہوا کہ حوالدار گورنمنٹ سنگھ لاپتہ ہے۔ وہ پیشاب کے لئے باہر نکلا تھا میں اور سلسٹر جنگل میں چلے گئے اس وقت خیال آیا کہ ہمارے پاس ٹارچ ہونی چاہئے تھی میں نے ٹارچوں والے سپاہیوں کو پکارا تو وہ بھاگے ہوئے پہنچے۔ آگے علاقہ اس قدر دشوار گزار تھا کہ ہم ناکام لوٹ آئے۔ صبح کے وقت اس علاقے میں گئے تو گورنمنٹ سنگھ کی لاش مل گئی۔ اس کی بھی گردن چیری بھاڑی ہوئی تھی۔ جس پر خراش تک نہیں تھی وہ دن سیکمیں بناتے گزر گیا۔ رات کا اندھیرا گہرا ہوا تو شہداد خان نے پھر قربانی کے لئے پیشکش کی۔ ہم پھر سرچ لائٹ اور ٹارچیں لئے درختوں پر چڑھ گئے۔ میجر سلسٹر مشین گن لے کر اپنے درخت پر جا بیٹھا۔ شہداد خان موت کے منہ میں جا کھڑا ہوا اور ہم اس کے ارد گرد روشنی کرنے لگے۔

دو گھنٹوں بعد میں نے روشنی شہداد خان سے دس بارہ گز پیچھے ڈالی تو میرے دل کی دھڑکن رک گئی۔ ایک جھاڑی سے لکھا ہوا مجھے دھاری دار شیر کا سراور کندھے نظر آئے۔ اس کی نظریں شہداد خان پر جمی ہوئی تھیں اور اس نے اگلی ٹانگوں کو اس طرح رکھا ہوا تھا جیسے شہداد خان پر جست لگانے لگا ہو۔ شہداد خان کو علم نہیں تھا کہ موت اس کی پیٹھ پیچھے کھڑی ہے۔ یہ تو ایک دلچسپ واقعہ تھا۔ میرے پاس شین مگن تھی لیکن فاصلہ اتنا تھا کہ گن کا فائر بکھر کر شہداد خان کو بھی زد میں لے سکتا تھا۔ میں میجر سلسٹر کو آواز نہیں دے سکتا تھا کیونکہ شیر کے بھاگ جانے کا ڈر تھا۔ مجھے خدشہ تھا کہ سلسٹر اس طرف نہیں دیکھ رہا لیکن سلسٹر بیدار تھا۔ جنگل میں اس کی مشین گن کی تڑاخ

تڑاخ گرمی جھاڑی میں شیر غریا اور غائب ہو گیا۔ شہداد خان بدک کر گھوما۔ میں نے سرچ لائٹ کو جھاڑی پر ہی مرکوز رکھا۔ شہداد خان کے پاس رائفل تھی۔ اس نے نہایت تیزی سے رائفل کندھے سے لگائی اور گولی چلا دی۔ اس نے مجھے پکارا اور پر جوش آواز میں چلایا..... ”مار دیا، مار دیا۔“

ہم درختوں سے کودتے اور بھاگتے پہنچے ٹارچوں کی روشنی میں دیکھا وہ دھاریوں والا شیر تھا۔ میجر سلسٹر کی مشین گن کی پوری بو جھاڑی کے پہلو میں پڑی تھی۔ پسلیاں ریزہ ریزہ ہو گئی تھیں۔ وہ تڑپ رہا تھا۔ جب شہداد خان نے اس پر گولی چلائی تھی ہم نے دیکھا کہ اس کے اگلے دونوں پنچے کٹے ہوئے تھے۔ میجر سلسٹر نے بتایا کہ اس بستی کے لوگوں نے اسے شاید لوہے کے پھندے میں پھنسانے کی کوشش کی ہے مگر پھندا اتنا سخت ہوگا کہ اس کے دونوں پنچے کٹ گئے ہوں گے اور وہ آزاد ہو گیا ہوگا۔ اب وہ جانوروں کے پیچھے بھاگنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اسی لئے وہ رات کے وقت انسانوں کو دبوچ لیتا تھا۔ اس کی اس عادت کی کوئی وجہ معلوم نہ ہو سکی کہ وہ گردن سے خون پی لیتا تھا اور باقی لاش چھوڑ دیتا تھا۔ اگلے پنچے نہ ہونے کی وجہ سے ہی اس کے مارے ہوئے انسان کے جسم پر کوئی خراش نہیں ہوتی تھی۔

ہم پندرہ سولہ روز بعد واپس آئے تو اس مظلوم لڑکی سے اس شیر کے متعلق پوچھا تو اس نے بتایا کہ یہ شیر جاپانوں کے آنے سے پہلے اس کی بستی کے تین آدمیوں کو مار چکا تھا اور ارد گرد کی بستیوں میں بھی اس نے جانی چاکی ہوئی تھی۔ لیکن اب اس لڑکی کو اس شیر کے مارے جانے پر ذرہ بھر خوشی نہیں تھی۔



ہم لڑکیوں کو تیرتی چاہیے

سورف، آئین و انسپلر کے ساتھ سبک کیونکہ سولہ سالہ سائمن



کپڑے بستر کیا!



www.fruitio.com.pk

A brand of Shangrila (Private) Limited.

f ShangrilaPakistan

Ab Play Karo!

